سورۃ الاعراف

آیاتہا ۲۰۶ ۷ سورۃ الاعراف مکیۃ ۳۹ رکوعاتہا ۲۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یہ مکی سورت ہے، سوائے آٹھ آیتوں کے اور وہ یہ ہیں رب کریم کے ارشاد: وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ سے لے کر قولہ تعالیٰ: وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ تک(1)۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف پڑھی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کیا(2)۔ اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے۔

الٓمّٓصٓ ۚ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲﴾

”الف، لام، میم، صاد۔ یہ کتاب ہے نازل کی گئی ہے آپ کی طرف پس چاہیے کہ نہ ہو آپ کے سینہ میں کچھ تنگی اس (کی تبلیغ) سے (یہ نازل کی گئی ہے) تاکہ آپ ڈرائیں اس سے اور یہ نصیحت ہے مومنوں کے لیے“۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓصٓ سورۃ البقرہ کے شروع میں ان حروف کی بحث گزر چکی ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور كِتٰبٌ اس کی خبر ہے، گویا کہ یہ فرمایا: الٓمّٓصٓ حروف كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ (یہ حروف ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے) اور کسائی نے کہا ہے: ای ہذا کتاب (یہ کتاب ہے) (اس میں کتاب خبر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ہذا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حَرَجٌ، ای ضیق (تنگی) یعنی آپ کا سینہ تبلیغ کے سبب تنگ نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: إنی أخاف أن یثلغوا رأسی فیدعوہ خُبزۃ(3) (مجھے خوف ہے کہ وہ میرا سر کچل دیں اور اسے نشیبی جگہ میں پھینک دیں) الحدیث۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر میں یہ کلام نہی ہے، لیکن اس کا معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی کی نفی کرنا ہے، یعنی لا یضیق صدرك ألا یؤمنوا به (آپ کا سینہ تنگ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایمان نہیں لائے) بلاشبہ آپ پر تبلیغ کرنا لازم ہے اور اس کے ساتھ ڈرانے کے سوا ان کے ایمان یا کفر میں سے کوئی شے آپ پر لازم نہیں، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ الآیہ (الکہف:6) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو) اور مزید فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ

1۔ المحرر الوجیز 2۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح باب القراۃ فی المغرب بالمص، حدیث نمبر 980،
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، جلد 2، صفحہ 385

اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (الشعراء) ((اے جان عالم!) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے)۔ اور حضرت مجاہد اور قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ یہاں حرج کا معنی شک ہے(1)، لیکن یہ کفر کا شک نہیں بلکہ تنگی کا شک ہے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۝ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اور اس (قول میں) بہت بعد ہے۔ اور منہ میں ہا ضمیر قرآن کے لیے ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ انذار کے لیے ہے، یعنی أنزل إلیك الکتاب لتنذر به فلا یکن فی صدرك حرج منه (آپ کی طرف کتاب نازل کی گئی تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں پس آپ کے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو) پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس تکذیب کے لیے ہے جو آپ کو قوت کلام عطا کر رہی ہے یعنی فلا یکن فی صدرك ضیق من تکذیب المکذبین له (آپ کے سینے میں اسے جھٹلانے والوں کی تکذیب سے کوئی تنگی نہ ہو)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ ذِكْرٰی اس کے لیے جائز ہے کہ یہ محل رفع، محل نصب اور محل خفض (جر) میں ہو۔ پس رفع کی دو وجہیں ہیں۔ بصریوں نے کہا ہے: یہ مبتدا مضمر کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف كِتٰبٌ پر ہے (لہٰذا یہ مرفوع ہے) اور نصب کی بھی دو وجہیں ہیں: ایک مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر، یعنی وذکّر به ذکری یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: اس کا عطف أنزلناہ کی ہا ضمیر ہے (لہٰذا یہ منصوب ہے) اور محل جر اس بنا پر ہے کہ اسے لِتُنْذِرَ بِهٖ کے محل پر محمول کیا جائے۔ اور انذار (ڈرانا) کافروں کے لیے ہے اور نصیحت مومنوں کے لیے ہے، کیونکہ یہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"(اے لوگو!) پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اور نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کی، بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو"۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) یعنی کتاب وسنت۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرما دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ امر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سبھی کو شامل ہے اور ظاہر کلام یہ ہے کہ یہ امر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام لوگوں کے لیے ہے، یعنی اتبعوا ملة الإسلام والقرآن (تم دین اسلام اور قرآن کی پیروی کرو اور اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 54

کے حلال کو حلال قرار دو اور اس کے حرام کو حرام قرار دو اور اس کے امر کی پیروی کرو اور اس کی نہی سے اجتناب کرو(1)۔ اور یہ آیت نص کی موجودگی میں آراء کی پیروی ترک کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ، مِنْ دُوْنِهٖۤ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے دوستوں کی پیروی نہ کرو) اس میں ہا ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی یہ ہے: تم اس کے ساتھ کسی غیر کی عبادت نہ کرو اور نہ اسے دوست بناؤ جو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیر دے اور ہر وہ جس نے کسی مذہب کو پسند کر لیا تو وہ مذہب رکھنے والے اس کے اولیاء اور دوست ہیں۔

اور حضرت مالک بن دینار سے روایت ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی: وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوست تلاش نہ کرو) اور اَوْلِيَآءَ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے (جو قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ضمیر اس ما کی طرف لوٹ رہی ہے جو اس قول میں ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم، قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۝ اس میں ما زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ما فعل کے ساتھ مصدر ہوتا ہے۔

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝

''اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت یا جب وہ دو پہر کو سو رہے تھے۔ پس نہ تھی ان کی (چیخ و) پکار جب آیا ان پر ہمارا عذاب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا: بے شک ہم ہی ظالم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اس میں كَمْ تکثیر کے لیے ہے، جس طرح کہ رُبَّ تقلیل کے لیے ہوتا ہے۔ اور کم مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اَهْلَكْنٰهَا اس کی خبر ہے، یعنی بہت سی بستیاں تھیں۔ قری بہت سے لوگوں کے اکٹھا رہنے کی جگہوں کو کہتے ہیں۔ ہم نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ اور کم کو اس بنا پر محل نصب میں قرار دینا بھی جائز ہے کہ اس کے بعد فعل مضمر ہو اور اس سے پہلے فعل مقدر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ استفہام اپنے سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور پہلے قول کو یہ قول تقویت دیتا ہے: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ (الاسراء: 17) (اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد) اگر اَهْلَكْنٰهَا ضمیر کے ساتھ مشغول نہ ہوتا تو اس کے ساتھ کم کا محل یقیناً منصوب ہوتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَهْلَكْنٰهَا، قَرْيَةٍ کی صفت اور كَمْ معنی میں هی القریة ہو اور جب تو نے القریة کی صفت لگائی تو گویا تو نے کم کی صفت لگائی۔

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا (النجم: 26) (اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آسکتی) پس ضمیر معنی کے اعتبار سے كَمْ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ معنی میں ملائکہ ہیں۔ پس اس تقدیر پر یہ صحیح نہیں ہے کہ كَمْ محل نصب میں ہو اس فعل کے سبب جو اس کے بعد مضمر ہو۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 766

فَجَآءَهَا بَأْسُنَا اس میں اشکال ہے فا کے ساتھ عطف ہونے کی وجہ سے۔ پس فراء نے کہا ہے: فا بمعنی واؤ ہے، پس ترتیب لازم نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے: (کہ اصل عبارت ہے) وکم من قریۃ أردنا إهلا کها فجاءها بأسنا (اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے برباد کرنے کا ارادہ کیا پس ہمارا عذاب ان پر آیا) جیسے یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہلاکت اور بربادی بعض قوم پر واقع ہوئی، پس تقدیر کلام ہو گی: وکم من قریۃ أهلکنا بعضها فجاءها بأسنا فأهلکنا الجمیع (اور کتنی بستیاں تھیں ان میں سے بعض کو ہم نے برباد کر دیا پھر ہمارا عذاب ان پر آیا تو ہم نے تمام کو ہلاک کر دیا)۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے اور کتنی بستیاں تھیں ہم نے انہیں اپنے حکم اور فیصلے میں برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے انہیں اپنی طرف سے ملائکہ عذاب ان کی طرف بھیج کر برباد کر دیا، پس ہمارا عذاب ان پر آیا اور بأس سے مراد تباہ و برباد کر دینا، جڑ سے اکھیڑ دینا ہے۔ اور البأس کا معنی آدمی پر آنے والا عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: أهلکنا ها فکان إهلا کنا ایاهم فی وقت کذا، فمجیٔ البأس علی هذا هو الإهلاك (ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ہمارا انہیں ہلاک کرنا فلاں وقت میں تھا، پس اس بنا پر عذاب آنے کا معنی ہلاک و برباد کرنا ہے)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ باس (عذاب) إهلاك (ہلاک کرنا) کے علاوہ ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور فراء نے بھی بیان کیا ہے کہ جب دو فعلوں کا معنی ایک ہو یا ایک کی طرح ہو تو ان میں سے جسے چاہے پہلے ذکر کر دے، پس معنی یہ ہے وکم من قریۃ جاءها باسنا فاهلکناها، جیسے دَنَا فقَرُب اور قَرُب فدنا (دونوں کا معنی قریب ہونا ہے) اور شتمنی فأساء اور أساء فشتمنی، کیونکہ الإساۃ اور الشتم (برا بھلا کہنا) دونوں ایک شی ہیں۔(1)

اور اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾ (القمر: 1) اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور انشق القمر فاقتربت الساعۃ دونوں کا معنی ایک ہے (قیامت قریب ہوئی اور چاند پھٹ گیا) بَيَاتًا اس کا معنی ہے۔ لیلا (رات کے وقت) اور اسی سے البیت ہے، کیونکہ اس میں رات گزاری جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بات یبیت بیتا وبیاتا (رات گزارنا) اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ یعنی یا اس حال میں کہ وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ پس انہوں نے ثقیل سمجھا تو انہوں نے واؤ کو حذف کر دیا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ جب ذکر دوبارہ ہو تو واؤ کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ کہتے ہیں: جاءنی زید راکبا أوهو ماش اس میں واؤ کی ضرورت نہیں (اور وهو ماش نہیں کہا جائے گا) مہدوی نے کہا: یہ نہیں کہا بیاتا أو وهم قائلون کیونکہ جملہ میں ایک ضمیر ہے جو اوّل کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ واؤ سے مستغنی ہے۔ اور یہ معنی میں زجاج کے قول کے ساتھ برابر ہے اور یہاں اَوْ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ تفصیل کے لیے ہے، جیسے آپ کے اس قول میں: لأکرمنك منصفا أو ظالما (میں ضرور بضرور تیری عزت و تکریم کروں گا تو میرے ساتھ

1۔ معانی القرآن للفراء، جلد 1، صفحہ 371

انصاف کرے یا ظلم) اور نحویوں کے نزدیک اس واؤ کو واوالوقت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور قَآىِٕلُوْنَ یہ قائلۃ سے ہے اور اس کا معنی ہے قیلولہ کرنا۔ اور اس کا معنی ہے دوپہر کے وقت سونا۔ اور یہ بھی کہا ہے: الإستراحة نصف النهار إذا إشتد الحر وإن لم يكن معها نوم (دوپہر کے وقت آرام کرنا جب گرمی شدید ہو اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو) اور آیت کا معنی یہ ہوا: ہمارا عذاب ان پر آیا اس حال میں کہ وہ غافل تھے یا تورات کے وقت یا دن کے وقت۔ اور الدعویٰ اس کا معنی دعا (پکارنا) ہے اور اسی سے یہ قول ہے: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ (یونس: 10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی)

اور نحویوں نے بیان کیا ہے: اللهم أشركنا في صالح دعوى من دعاك (اے اللہ! ہمیں اس اچھی اور صالح دعا میں شریک کرنا جو کوئی تجھ سے مانگے) اور کبھی دعویٰ بمعنی ادعاء (دعویٰ کرنا) بھی ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ بربادی اور ہلاکت کے وقت اس اقرار میں مخلص تھے کہ وہ ظالم لوگ تھے۔ اور دَعْوٰىهُمْ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا اسم اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا ہے اور اس کی نظیر فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا (النمل: 56) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الدعوی محل رفع میں ہو اور اَنْ قَالُوْٓا محل نصب میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا (البقرہ: 177) اس میں البر رفع کے ساتھ ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا (الروم: 10) اس میں عَاقِبَةَ رفع کے ساتھ ہے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ ۝

"سو ہم ضرور پوچھیں گے ان سے بھیجے گئے (رسول) جن کی طرف اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے۔ پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے اور نہ تھے ہم ان سے غائب"۔

قولہ تعالیٰ: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار سے حساب لیا جائے گا۔ اور قرآن میں ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ) (پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے)۔

اور سورۃ القصص میں ہے: وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (القصص) (اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ) یعنی جب وہ عذاب میں قرار پکڑ جائیں گے۔ اور آخرت میں کئی وطن ہوں گے۔ ایک وطن ایسا ہوگا جس میں حساب و کتاب کے لیے پوچھ گچھ کی جائے گی اور ایک وطن ایسا ہوگا جس میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور ان سے سوال (عذاب کو) پختہ کرنے، زجر و توبیخ اور انہیں ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ہوں گے۔ اور رسولوں سے سوال اپنے بارے میں گواہ لانے اور تفصیل بیان کرنے کے بارے ہوں گے یعنی انہیں ان کی قوم نے جو جوابات دیئے (ان کے بارے ان سے پوچھا جائے گا)

اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (الاحزاب: 8) (یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق) کا یہی معنی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ یعنی انبیاء علیہم السلام سے ہم پوچھیں گے۔ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ اور ہم ان ملائکہ سے پوچھیں گے جو ان کی طرف بھیجے گئے۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ میں لام قسمیہ ہے اور یہ حقیقۃً تاکید کے لیے ہے۔ اور اسی طرح فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ) ان پر (ان کے حالات) بیان کرے گا۔ وَّ مَا كُنَّا غَآىِٕبِیْنَ یعنی ہم ان کے اعمال کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ اور آیت اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ جاننے والا ہے۔

وَ الْوَزْنُ یَوْمَىِٕذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ ۝۹

''اور (اعمال کا) تولنا اس دن برحق ہے پس جن کے بھاری ہوئے ترازو تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور جن کے ہلکے ہوئے ترازو تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو بوجہ اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ الْوَزْنُ یَوْمَىِٕذِ الْحَقُّ یہ مبتدا اور خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ الْحَقُّ صفت ہو اور خبر یَوْمَىِٕذٍ ہو اور یہ بھی جائز ہے الْحَقُّ مصدر کی بنا پر منصوب ہو۔

اور وزن سے مراد میزان (ترازو) کے ساتھ بندوں کے اعمال کا وزن کرنا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بندوں کے صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا اور یہی صحیح ہے اور اسی کے بارے حدیث میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میزان سے مراد وہ کتاب ہے جس میں مخلوق کے اعمال درج ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میزان سے مراد نیکیوں اور گناہوں کا عیاں ہونا ہے۔ اور آپ سے حضرت ضحاک اور اعمش سے یہ بھی مروی ہے کہ وزن اور میزان عدل اور قضا (عدل وانصاف سے فیصلہ کرنا) کے معنی میں ہیں اور وزن کا ذکر بطور ضرب المثل ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا الکلام فی وزن ھذا وفی وزانہ یعنی یہ کلام اس کے مساوی اور ہم پلہ ہے اگرچہ وہاں کوئی وزن نہیں۔ زجاج نے کہا ہے: لغت اور زبان کے اعتبار سے یہ جائز ہے اور اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اس کی اتباع اور پیروی کی جائے جو ان صحیح احادیث میں ہے جو میزان کے ذکر میں وارد ہیں۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: اس بارے میں انہوں نے جو کہا خوب کہا کہ اگر میزان کو اس (مذکورہ معنی) پر محمول کیا جائے تو پھر چاہیے کہ پل صراط کو دین حق (کے معنی) پر محمول کیا جائے، جنت اور دوزخ اس معنی پر جو ارواح پر صادق آتا ہے نہ کہ اجسام پر اور شیاطین اور جنات کو اخلاق مذمومہ پر اور ملائکہ کو قوائے محمودہ کے معنی پر محمول کیا جائے، حالانکہ امت کا دور اول میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہ تمام الفاظ بغیر کسی تاویل کے اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ اور تاویل نہ ہونے پر اجماع ہے تو پھر ظاہر معنی مراد لینا واجب ہے اور یہ ظواہر ہی نصوص ہو گئے۔

ابن فورک نے کہا ہے: معتزلہ نے اس بنا پر میزان کا انکار کیا ہے کہ اعراض کا وزن کرنا محال ہے، کیونکہ وہ بالذات قائم ہی نہیں ہوتے۔ اور متکلمین میں سے بعض کہتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام میں بدل دے گا اور وہ قیامت کے دن ان

کا وزن کرے گا۔ اور یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ موازین ان کتابوں کے سبب بوجھل اور بھاری ہوں گے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں اور انہیں کے سبب خفیف اور ہلکے ہوں گے۔ اور حدیث طیبہ میں وہ مروی ہے جو اس کو ثابت کرتا ہے اور وہ اس طرح مروی ہے کہ بعض لوگوں کا میزان (ترازو) قریب ہے کہ نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے پھر اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے گا جس پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھا ہو گا تو وہ بھاری ہو جائے گا، تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ ان کتابوں کے وزن کی طرف راجع ہے جن میں اعمال لکھے ہوئے ہیں نہ کہ نفس اعمال کی طرف اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میزان کو ہلکا کر دے گا جب چاہے گا اور بھاری کر دے گا جب ارادہ فرمائے گا اس شے کے ساتھ جو ان صحف میں سے اس کے پلڑوں میں رکھی جائے گی جن میں اعمال درج ہیں۔

اور صحیح مسلم میں صفوان بن محرز سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: آپ نے کیا سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نجوی (سرگوشی) کے بارے کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک مومن کو قیامت کے دن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا اور اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا: کیا تو (اسے) پہچانتا ہے۔ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں، تو رب کریم فرمائے گا: چونکہ میں نے اسے دنیا میں تجھ پر مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے اور میں اسے آج بھی تیرے لیے معاف فرماتا ہوں، پس اسے اس کی نیکیوں کا صحیفہ عطا کر دیا جائے گا۔ اور رہے کفار اور منافقین تو انہیں بھی مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا'' (1)۔ پس آپ کا قول: **فیعطی صحیفة حسناته** یہ اس پر دلیل ہے کہ اعمال صحف میں لکھے جاتے ہیں اور ان کا وزن کیا جائے گا۔

اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا اور اس پر ننانوے رجسٹر (دفتر) کھل جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نگاہ تک ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو اس میں سے کسی کا انکار کرتا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا میرے کراماً کاتبین فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: نہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا: کیا تیرا کوئی عذر ہے، کیا تیری کوئی نیکی ہے؟ تو وہ آدمی ڈر جائے گا اور عرض کرے گا: نہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا: (کیوں نہیں) بلکہ ہمارے پاس تیری نیکیاں ہیں اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہو گا، پھر اس کے لیے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں یہ لکھا ہو گا أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله (میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں) تو وہ پوچھے گا: اے میرے رب! ان رجسٹروں کے ہوتے ہوئے اس کاغذ کے ٹکڑے کی کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: بلاشبہ تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا پس وہ کاپیاں (اور رجسٹر) ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو کاپیوں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہو جائے گا'' (2)۔ ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں:

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 328

فلا یثقل مع اسم اللہ شئ (1) پس اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی شی بھاری نہیں ہو سکتی۔ اور فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اس بارے مزید بیان سورۃ الکہف اور سورۃ الانبیاء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝، مَوَازِيْنُهٗ یہ میزان کی جمع ہے اور اس کی اصل موزان ہے، واؤ ماقبل مکسور کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ وہاں ایک عامل کے لیے کئی میزان ہوں اور ہر میزان کے ساتھ ایک نوع کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میزان ایک ہو اور اسے لفظ جمع کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہو، جیسے آپ کہتے ہیں: خرج فلان إلى مكة على البغال، اور خرج إلى البصرة في السفن۔ اور قرآن کریم میں ہے: كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الشعراء) اور كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الشعراء) اور بلاشبہ دو تاویلوں میں سے ایک کے مطابق وہ رسول ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الموازین، موزون کی جمع ہے، نہ کہ میزان کی اور موازین سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا وزن کیا جائے گا۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ اس کی تفسیر بھی مذکورہ تفسیر کی مثل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نیکیوں اور بدیوں کا وزن ایسے ترازو میں کیا جائے گا جس کی ایک لسان (یعنی وہ حصہ جو تولتے وقت ہاتھ میں رہتا ہے) اور دو پلڑے ہیں، پس جہاں تک مومن کا تعلق ہے تو اس کے عمل کو انتہائی حسین صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو اس کی نیکیاں اس کی بدیوں پر غالب آ جائیں گی اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، اور کافر کے عمل کو انتہائی قبیح صورت میں لایا جائے گا اور اسے ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس کا وزن ہلکا ہو جائے گا یہاں تک کہ وہ جہنم میں گر جائے گا۔ اور جس کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اشارہ کیا ہے وہ اس کے قریب ہے جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال میں سے ہر جز کا جوہر تخلیق فرمائے گا اور اسی جوہر کا وزن کیا جائے گا اور اسے ابن فورک وغیرہ نے رد کیا ہے۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''جب مومن کی نیکیاں کم ہوں گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کے پورے کی مثل کاغذ کا ٹکڑا نکالیں گے اور اسے میزان کے اس دائیں پلڑے میں ڈال دیں گے جس میں اس کی نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں بڑھ جائیں گی (یعنی یہ پلڑا بھاری ہو جائے گا) پس وہ بندہ مومن حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کرے گا: آپ پر میرے ماں باپ نثار! آپ کا چہرہ مبارک کتنا حسین ہے اور آپ کے اخلاق کتنے خوبصورت ہیں (یہ تو بتائیے) آپ کون ہیں؟ تو آپ فرمائیں گے: أنا محمد نبيك وهذه صلواتك التي كنت تصلي علي قد وفيتك أحوج ما تكون إليها (میں تیرا نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور یہ تیرا درود پاک ہے جو مجھ پر تو پڑھتا تھا اور میں نے تیری وہ حاجت پوری کر دی جس کا تو زیادہ حاجت مند تھا۔ اسے قشیری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے (2) اور بیان کیا کہ یہ بطاقہ (با کے کسرہ کے ساتھ) کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جس میں سامان (متاع)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فیمن یموت وهو یشهد ان لا اله الا الله، حدیث نمبر 2583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر کبیر، جلد 13، صفحہ 27

کی تفصیل لکھی جائے یہ اہل مصر کی لغت کے مطابق ہے۔

اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ محمد بن یحییٰ نے بیان کیا کہ بطاقۃ لکھی ہوئی پرچی (رقعہ) کو کہتے ہیں (1) اور اہل مصر رقعۃ کو بطاقۃ کہتے ہیں۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن وزن کرنے والے حضرت جبریل امین علیہ السلام ہوں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: یا جبریل زِنْ بینهم فردساً من بعض علی بعض (اے جبریل! ان کے درمیان وزن کراور بعض سے بعض کی طرف لوٹا دے) فرمایا: وہاں کوئی سونا اور چاندی نہ ہوگا۔ پس اگر ظالم کی نیکیاں ہوں گی تو اس کی نیکیاں لے کر مظلوم کی طرف لوٹا دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ لے کر ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پس وہ آدمی لوٹے گا اور اس پر پہاڑ کی مثل (بوجھ) ہوگا (2)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ''کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم! میزان کے پاس کرسی کی جانب جاؤ اور اپنی اولاد کے ان اعمال کی طرف دیکھو جو تمہاری طرف اٹھائیں جائیں گے پس جس کی نیکی شر پر رائی کے دانہ کے برابر بھی بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جنت ہے اور جس کا شر اس کی نیکی پر رائی کے دانہ کی مقدار بھاری ہو جائے گی تو اس کے لیے جہنم ہے یہاں تک کہ تو جان لے گا کہ میں ظالم کے سوا کسی کو عذاب نہیں دوں گا''۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

''اور یقیناً ہم نے ہی آباد کیا تمہیں زمین میں اور مہیا کر دیئے تمہارے لیے اس میں زندہ رہنے کے اسباب۔ بہت ہی کم تم شکر ادا کرتے ہو''۔

یعنی ہم نے زمین کو تمہارے لیے سکونت کی جگہ اور بچھونا بنا دیا اور ہم نے تمہارے لیے اس میں اسباب معیشت پیدا فرما دیئے۔ مَعَايِش معیشة کی جمع ہے، یعنی کھانے پینے میں سے وہ چیزیں جن کے لیے کوشش کی جاتی ہے اور جن کے ساتھ زندگی قائم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عاش یعیش عیشاً و معاشا و معیشا و معیشة و عیشة۔ اور زجاج نے کہا ہے: معیشة سے مراد وہ سبب زندگی ہے جس کے ساتھ زندگی متصل ہوتی ہے۔ اخفش اور کثیر نحویوں کے نزدیک معیشة مفعلة کے وزن پر ہے (یعنی مصدر میمی)۔ اور اعرج نے معائش ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح خارجہ ابن مصعف نے نافع سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہمزہ غلطی ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ واحد معیشة ہے اور اس کی اصل مَعْيِشَة ہے، پھر الف وصل کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ اور یا دونوں ساکن ہیں، پس حرکت دینا ضروری ہے، کیونکہ حذف کا کوئی راستہ نہیں۔ اور الف کو حرکت نہیں دی جا سکتی پس یا کو وہ حرکت دی گئی جو اس کے لیے واحد میں ثابت ہے اور واؤ میں اس کی مثال منارۃ و مناور اور مقام و مقاوم ہے، جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

واِنّي لقوّام مقاوِمُ لم یكن　جرير ولا مَوْلَى جريرٍ يَقُومها

اور اسی طرح مصیبة و مَصَاوِب ہے۔ یہ جید اور عمدہ ہے اور لغت شاذہ مصائب ہے۔ اخفش نے کہا ہے: بلاشبہ مصائب

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 69

جائز ہے، کیونکہ اس کا واحد معتل ہے (یعنی اس میں حرف علت موجود ہے)۔

زجاج نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس طرح ان پر مقائم کہنا لازم آئے گا، البتہ یہ قول ہے کہ یہ وسادۃ اور إسادۃ کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَعَایِشَ میں ہمزہ جائز نہیں، کیونکہ معیشۃ مفعلۃ کے وزن پر ہے، اس میں یا اصلیہ ہے اور ہمزہ تب ہوتا ہے جب یا زائدہ ہو جیسے مدینۃ و مدائن اور صحیفۃ و صحائف اور کریمۃ و کرائم اور وظیفۃ و وظائف اور ان کے مشابہ الفاظ میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ⑪

"اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل وصورت بنائی تمہاری پھر حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے نہ تھا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ جب الله تعالیٰ اپنی نعمت کا ذکر کر چکا تو اس نے اپنی تخلیق کی ابتدا کا ذکر فرمایا۔ اور خلق کا معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں نطفہ کی صورت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہاری خاص شکل وصورت بنائی پھر ہم تمہیں خبر دے رہے ہیں کہ ہم نے ملائکہ کو کہا: آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

اور حضرت ابن عباس اور ضحاک وغیرہما سے روایت ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا پھر ہم نے اس کی پشت میں تمہیں خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ اور اخفش نے کہا: ثُمَّ بمعنی واؤ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، بعد ازاں ہم نے ملائکہ کو کہا: تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، پھر ہم نے تمہیں خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ تو یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یعنی آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا کیا، تو ان کا ذکر لفظ جمع کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ آپ ابوالبشر ہیں۔ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یہ ضمیر بھی آپ ہی کی طرف راجع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: نحن قتلناکم یعنی قتلنا سیدکم (کہ ہم نے تمہارے سردار کو قتل کر دیا) پھر کہا: ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اور اس بنا پر تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ مراد حضرت آدم علیہ السلام اور مائی حوا علیہا السلام ہیں۔ پس حضرت آدم علیہ السلام خاک سے ہیں اور حضرت حواء علیہا السلام آپ کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، پھر اس کے بعد شکل وصورت بنی۔ سو معنی یہ ہوا: تحقیق ہم نے تمہارے والدین (حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حوا علیہا السلام) کو پیدا فرمایا پھر ہم نے ان دونوں کو خاص شکل وصورت عطا فرمائی۔ حسن نے یہی کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں اس وقت خاص شکل وصورت عطا کی جس

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 321

وقت ہم نے تم سے میثاق (وعدہ) لیا۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اسے آپ سے ابن جریج اور ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ تمام اقوال میں سے اچھا قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اس طرف جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر انہیں اس وقت شکل وصورت عطا فرمائی جب ان سے میثاق لیا، پھر ملائکہ کو سجود کا حکم اس کے بعد ہوا۔ اور اسے یہ ارشاد تقویت دیتا ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الاعراف: 172) (اور اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو) اور یہ حدیث طیبہ بھی ''کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چیونٹیوں کی طرح نکالا اور ان سے میثاق لیا'' (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ اخبار کے لیے ہے، یعنی ہم نے تمہیں آدم علیہ السلام کی پشت میں تخلیق فرمایا، پھر ہم نے تمہیں ارحام میں شکل وصورت عطا فرمائی۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ صحیح قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان تمام اقوال کا احتمال ہوسکتا ہے، البتہ ان میں سے صحیح وہ ہے جس کی تائید قرآن کریم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (المومنون) (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے)

اس میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور مزید فرمایا: وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسا: 1) (اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا)

پھر فرمایا: جَعَلْنٰهُ یعنی ہم نے ان کی نسل اور اولاد کو بنایا۔ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ الآیہ (المومنون) (پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں) پس حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا گیا پھر شکل وصورت بنائی گئی اور انہیں سجود کی عزت وتکریم سے نوازا گیا اور ان کی نسل اور اولاد کی شکلیں اور صورتیں ماؤں کے رحموں میں بنائی گئیں رحموں میں اور باپوں کی صلبوں میں تخلیق کیے جانے کے بعد، حالانکہ سورۃ الانعام کی ابتدا میں گزر چکا ہے کہ ہر انسان کو نطفہ اور مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، پس اس میں غور کرلو۔ اور یہاں فرمایا: خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ۔

اور سورۃ الحشر کے آخر میں فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (وہ اللہ سب کا خالق، سب کو پیدا کرنے والا (سب کی مناسب) صورت بنانے والا ہے) تو اس میں تصویر (شکلیں بنانے) کا ذکر (برئ) جامہ خلقت پہنانے کے بعد ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے ارواح کو پہلے پیدا کیا پھر بعد میں جسموں کو شکل وصورت عطا کی۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ یہ استثنا من غیر جنسہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے استثنا ہے تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا نہیں؟ جیسے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2455، روایت بالمعنی

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے، ابلیس نے کہا: (کیونکہ) میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا مجھے آگ سے اور تو نے پیدا کیا اسے کیچڑ سے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا مَنَعَكَ، مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے، یعنی أیُّ شئٍ منعك؟ (کون سی شے ہے جس نے تجھے روکا ہے؟) یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اَلَّا تَسْجُدَ یہ محل نصب میں ہے، یعنی مِنْ أنْ تسجد (تجھے سجدہ کرنے سے) اور لا زائدہ ہے۔ اور سورہ ''ص'' آیت 75 میں ہے مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے) اور شاعر نے کہا ہے:

أَبَى جُودُهُ لا البخلَ فاستعجلت به نَعَمْ من فتىً لا يمنعُ الجودَ نائلُه(1)

اس میں مراد أبی جودہ البخل ہے، اس میں لا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لا زائدہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں منع قول اور دعا کی ایک طرف ہے، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ فرمایا: من قال لك ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے کہا کہ تو سجدہ نہ کرے؟) یا من دعاك إلى ألّا تسجد؟ (کس نے تجھے اس طرف دعوت دی کہ تو سجدہ نہ کرے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قد قلت لك ألّا تفعل كذا (تحقیق میں نے تجھے کہا کہ تو اس طرح نہ کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے، تقدیر عبارت ہے: مَا مَنَعَكَ من الطاعةِ وأحوجك إلى ألّا تسجد (کون سی شی نے تجھے اطاعت سے روکا ہے اور تجھے اس کا محتاج بنا دیا ہے کہ تو سجدہ نہ کرے؟)

علماء نے کہا ہے: وہ شے جس نے اسے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا تھا وہ تکبر اور حسد تھا۔ اور اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا جب اسے اس کے بارے حکم دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ (ص) (کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے)

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ (ص) (پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھر پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے) تو گویا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ کے قول سے اس میں امر عظیم (بہت بڑا اضطراب) داخل ہو گیا، کیونکہ اس سجدہ کرنے میں سجدہ کرنے والے کی ذلت و رسوائی اور جس کے لیے کیا گیا اس کی عزت و تکریم ہے پس اس نے اپنے دل میں یہ رکھ لیا کہ وہ سجدہ نہیں کرے گا جس وقت اسے اس کا حکم دیا گیا۔ پس جب حضرت آدم علیہ السلام میں روح پھونکی گئی تو ملائکہ سجدے میں گر گئے اور وہ ان کے درمیان کھڑا باقی رہا، پس اس نے اپنے قیام اور سجدہ ترک کرنے کے ساتھ اسے ظاہر کر دیا جو اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ یعنی میرے حکم کی پیروی سے تجھے کس نے روکا ہے؟ تو اس نے اپنے دل کا راز نکال دیا اور کہا: اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 378

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَمَرْتُكَ یہ اس پر دلیل ہے جو فقہاء کہتے ہیں کہ جب امر مطلق بغیر قرینہ کے ہو تو وہ وجوب کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اس میں مذمت اس امر مطلق کو ترک کرنے پر معلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (آدم کو سجدہ کرو) اور یہ بین اور واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ یعنی سجدہ کرنے سے مجھے میری اس فضیلت نے روکا ہے جو مجھے اس پر حاصل ہے۔ ابلیس کی طرف سے یہ جواب بالمعنی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لمن هذه الدار؟ یہ گھر کس کا ہے؟ تو مخاطب کہتا ہے: مالكها زيد (اس کا مالک زید ہے) تو یہ عین جواب نہیں ہے، بلکہ ایسا کلام ہے جو معنی جواب کی طرف راجع ہے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ پس اس نے گمان کیا کہ آگ مٹی سے اشرف و اعلیٰ ہے، اس لیے کہ یہ بلند مرتبہ ہے، بلندی کی طرف چڑھنے والی ہے اور تیز رفتار ہے اور اس لیے بھی کہ یہ ایک روشن جوہر ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور اس نے قیاس میں غلطی کی پس جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا اللہ تعالیٰ اسے ابلیس کے ساتھ ملا دے گا۔ ابن سیرین نے کہا: سورج و چاند کی عبادت صرف اور صرف قیاسوں کے مطابق کی گئی۔

اور حکماء نے کہا ہے: اللہ کے اس دشمن نے اس بارے میں خطا اور غلطی کی ہے کہ اس نے آگ کو مٹی پر فضیلت دی ہے، اگرچہ یہ دونوں جامد مخلوق ہونے کے اعتبار سے ایک درجہ میں ہیں، پھر بھی مٹی آگ سے چار وجہ سے افضل و برتر ہے۔

(۱) مٹی کے جوہر میں استحکام اور سکون ہے، وقار اور بردباری ہے، حلم، حیا اور صبر ہے اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کو مذکورہ سعادت و اعزاز کے بعد توبہ، تواضع اور عجز و انکساری کی طرف دعوت دینے والا ہے، پس اس نے آپ کو مغفرت، اجتباء اور ہدایت کا وارث بنا دیا۔ اور آگ کے جوہر میں خفت (ذلت) طیش، حرارت، بلندی اور اضطراب ہے اور یہ ابلیس کو مذکورہ شقاوت و بدبختی کے بعد تکبر اختیار کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی دعوت دینے والا ہے، پس اس نے اسے ہلاکت، عذاب، لعنت اور شقاوت کا وارث بنا دیا۔ یہ قفال نے کہا ہے۔ (۲) بے شک حدیث اس پر ناطق ہے کہ جنت کی مٹی انتہائی خوشبودار کستوری (کی مثل) ہے اور اس پر کوئی حدیث نہیں کہ جنت میں آگ ہے اور (نہ اس پر) کہ جہنم میں مٹی ہے۔ (۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ آگ عذاب کا سبب ہے اور یہ اللہ کا عذاب اس کے دشمنوں کے لیے ہے، لیکن مٹی عذاب کا سبب نہیں ہے۔

(۴) مٹی آگ کی محتاج نہیں اور آگ مکان کی محتاج ہے اور اس کا مکان مٹی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک پانچویں قول کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مٹی سجدہ کرنے کی جگہ اور پاک کرنے والی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔ اور آگ ڈرانے والی اور عذاب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (الزمر: 16)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابلیس کے لیے قیاس کی نسبت اطاعت و فرمانبرداری اولیٰ اور بہتر تھی لیکن اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور یہ وہ پہلا فرد ہے جس نے اپنی رائے کے مطابق قیاس کیا اور نص کی مخالفت میں قیاس مردود ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قیاس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ کچھ اس کے قائل ہیں اور کچھ اسے رد کرنے والے ہیں۔ پس جو اس کے قائل ہیں وہ صحابہ، تابعین، اور ان کے بعد آنے والے جمہور ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً جائز ہے اور شرعاً ایسا واقع ہوا ہے اور یہی صحیح ہے۔

شافعیہ میں سے قفال اور ابو الحسین بصری اس طرف گئے ہیں کہ اس کے مطابق عقلاً عمل کرنا واجب ہے اور نظام نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ اور بعض اہل ظواہر نے اس کا رد کیا ہے، لیکن پہلا (قول) صحیح ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ" میں کہا ہے: اس کا معنی ہے لا عصمۃ لِأحد إلا فی کتاب اللہ او سنۃ نبیہ اوفی إجماع العلماء اذا وجد فیھا الحکم فإن لم یوجد فالقیاس (کسی کے لیے عصمت اور بچاؤ نہیں ہے مگر کتاب میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں علماء کے اجماع میں جب کہ اس میں حکم پایا جائے اور اگر حکم نہ پایا جائے تو پھر قیاس ہے) اور اسی بنا پر انہوں نے عنوان باندھا باب من شبہ اصلا معلوما بأصل مبین قد بین اللہ حکمھا لیفھم السائل (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے کسی اصل معلوم کو اس اصل مبین کے ساتھ تشبیہ دی جس کے حکم کو اللہ نے بیان فرما دیا تا کہ سائل سمجھ جائے) اور اس کے بعد یہ عنوان ذکر کیا۔ باب الأحکام التی تعرف بالدلائل و کیف معنی الدلالۃ و تفسیرھا (یہ باب ان احکام کے بیان میں ہے جو دلائل سے پہچانے جاتے ہیں اور دلالۃ کا معنی اور اس کی تفسیر کیا ہے)۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: کتاب اللہ، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اجماع امت سے اجتہاد و استنباط کرنا ہی حق واجب ہے اور اہل علم کے لیے فرض لازم ہے اور اس بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے کئی احادیث و روایات مروی ہیں۔ اور ابو تمام مالکی نے کہا ہے: امت نے قیاس پر اجماع کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کا زکوٰۃ میں سونے اور چاندی کے قیاس پر اجماع ہے۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: أقیلونی بیعتی (تم میری بیعت توڑ دو) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ لا نقیلک ولا نستقیلک، رضیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا أفلا نرضاک لدنیانا؟! (1) (قسم بخدا! نہ ہم آپ کی بیعت توڑیں گے اور نہ توڑنے کا مطالبہ کریں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہمارے دین کے لیے پسند فرمایا ہے تو ہم کیوں نہ آپ کو اپنی دنیا کے لیے پسند کریں گے) تو اس میں آپ نے امامت کو نماز پر قیاس کیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا اور فرمایا: واللہ لا أفرق بین ما جمع اللہ (2) (قسم بخدا! میں ان کے درمیان تفریق نہیں کروں گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے جمع فرمایا ہے) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں شراب پینے والے کے بارے میں قیاس کی تصریح کر دی اور فرمایا: إنہ إذا سکر ھذی، و اذا ھذی افتری، فحدہ حد القاذف (بے شک جب وہ نشے میں ہوتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان کہتا ہے تو بہتان تراشی کرتا ہے پس اس کی حد تہمت لگانے والے کی حد کی مثل ہوگی) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف ایک خط لکھا اور اس میں فرمایا: الفھم الفھم فیما یختلج فی صدرک فما لم یبلغک فی الکتاب و السنۃ، أعرف الأمثال والأشباہ،

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 133، روایت بالمعنی
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 67

ثم قس الامور عند ذالك، فاعمد الى أحبها إلى الله تعالى وأشبهها بالحق فيما ترى، الحديث بطوله ذكره الدارقطنی (1) (خوب سمجھو اور غور فکر کرو ایسے امر میں جس کے بارے میں تمہارے دل میں کوئی خلش اور شک پیدا ہو جائے اور اس کے بارے کتاب وسنت کا حکم تمہیں نہ پہنچے تو اس کی امثال واشباہ کو پہچانو، پھر ان امور میں سے کسی پر قیاس کرلو اور اس پر اعتماد کرو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو اور تمہاری رائے میں حق کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہو۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیث وباء میں کہا، جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام سرغ سے واپس لوٹے! نَفِرّ من قَدَرِ الله؟ (کیا ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نعم! نَفِرّ من قَدَرِ الله إلى قَدَرِ الله (ہاں! ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: تمہاری کیا رائے ہے (2)... پس آپ نے اسے ان مسائل پر قیاس کیا اور ان کے مطابق اس میں غور وفکر کی جو اس سے مشابہت رکھتے تھے اور یہ سب مہاجرین وانصار کی موجودگی میں ہوا اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور اس معنی میں جہاں تک آثار اور آیات قرآنیہ کا تعلق ہے تو وہ کثیر اور بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس اصول دین میں سے ایک اصل ہے۔

اور مسلمانوں کی حفاظت اور بچاؤ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور عمل کرنے والے علماء اس کی پناہ لیتے ہیں اور اس کے ساتھ احکام مستنبط کرتے ہیں اور یہ ان کی جماعت کا قول ہے جو حجت ہیں اور جو ان سے الگ ہو گیا اس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ اور رہی مذموم رائے اور ایسا قیاس جس میں منھی عنه (وہ شی جس سے منع کیا گیا ہو) کے بارے تکلف کیا گیا ہو تو وہ اس مذکورہ اصول پر نہیں، کیونکہ وہ ظن اور شیطان کی جانب سے دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء: 36) (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں) اور قیاس کی مذمت میں جتنی کمزور اور ضعیف اخبار واحادیث قیاس کے مخالف لاتے ہیں تو وہ قیاس مذموم کی اس نوع پر محمول ہیں، جس کی شریعت میں کوئی اصل معلوم نہیں۔ اس بارے مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اتر جا یہاں سے مناسب نہیں ہے تیرے لیے کہ تو غرور کرے یہاں رہتے ہوئے پس نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی فرمایا: تو آسمان سے اتر جا۔ فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا کیونکہ اس کے باسی تواضع اور انکساری کرنے والے فرشتے ہیں۔ فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ پس تو نکل جا بلاشبہ تو ذلیلوں میں سے ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے اپنے مولیٰ کی نافرمانی کی تو وہ ذلیل ہے۔

ابوروق اور بجلی نے کہا: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو اپنی اس صورت سے الگ ہو جا جس میں تو ہے، کیونکہ اس نے اس پر فخر کیا کہ

1۔ سنن دارقطنی، حدیث نمبر 4471 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1683 مختصر

وہ آگ سے ہے پس اس کی صورت تاریکیوں کے ساتھ اور اس کی چمک اور روشنی کے زوال کے ساتھ بدشکل ہو گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فَاهْبِطْ مِنْهَا یعنی تو زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف منتقل ہو جا، جیسے کہا جاتا ہے: هبطنا ارض كذا یعنی ہم دوسری جگہ فلاں زمین کی طرف منتقل ہو گئے، تو گویا اسے زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف نکال دیا گیا؛ اور اس کا غلبہ اور سلطنت انہیں میں ہے اور وہ زمین جس میں داخل نہیں ہو سکتا مگر چور کی حالت کی طرح وہ اس میں ڈرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس سے نکل جاتا ہے۔ پہلا قول اظہر اور واضح ہے اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۱۵﴾

''بولا مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے''۔

اس نے قبروں سے اٹھانے اور حساب کے دن تک باقی رہنے کی مہلت مانگی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ وہ نہ مرے، کیونکہ یوم البعث کے بعد پھر کوئی موت نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی وغیرہما رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے نفخہ اولیٰ تک مہلت دی کہ اس وقت تمام مخلوق مر جائے گی۔ اور اس کا مہلت کا مطالبہ نفخہ ثانیہ تک تھا جس وقت لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے اٹھیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار فرما دیا۔ اور فرمایا: اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اور جسے اٹھایا جائے گا اس کا ذکر پہلے نہیں کیا، کیونکہ یہ قصہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے بارے میں ہے، پس قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہی ہیں جنہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا۔

قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَ عَنۡ اَیۡمَانِهِمۡ وَ عَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِیۡنَ ﴿۱۷﴾

''کہنے لگا اس وجہ سے کہ تو نے مجھے (اپنی رحمت سے) مایوس کر دیا میں ضرور تاک میں بیٹھوں گا ان (کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستہ پر۔ پھر میں ضرور آؤں گا ان کے پاس (بہکانے کے لیے) ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو نہ پائے گا ان میں سے اکثر کو شکر گزار''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ اغواء کا معنی ہے ایقاع الغی فی القلب (دل میں گمراہی کو واقع کرنا) یعنی اس وجہ سے کہ تو نے میرے دل میں گمراہی، عناد اور تکبر ڈال دیا۔ اور یہ اس لیے (کہا) کیونکہ ابلیس کا کفر کفر جہالت نہیں، بلکہ وہ کفر عناد و تکبر ہے۔ اور اس کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی قسم ہے، یعنی تیرے مجھے گمراہ کرنے کی قسم میں ضرور بضرور ان کے لیے تیرے راستے

پر، یا تیرے راستے میں بیٹھوں گا، پس کلام میں حذف ہے فباغوائك إیای لأقعدن لهم علی صراطك أو فی صراطك اس قول کی دلیل اس کا وہ قول ہے جو سورہ ص میں ہے: فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۲﴾ (تیری عزت کی قسم! میں ضرور بضرور ان تمام کو گمراہ کروں گا) تو گویا ابلیس اللہ تعالیٰ کے اسے گمراہ کرنے کی مقدار سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں اسے بندوں پر تسلط اور غلبہ دینے کا ذکر ہے، پس اس نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی قدر کے عظیم ہونے پر قسم کھائی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی لام ہے، گویا اس نے یہ کہا: فلإغوائك إیای (تیرے مجھے گمراہ کرنے کی وجہ سے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ با بمعنی مع ہے اور معنی ہے فمع اغوائك إیای (پس تیرے مجھے گمراہ کرنے کے ساتھ) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استفہام ہے، گویا اس نے پوچھا بأیِ شیءٍ أغواه؟ (کون سی شے کے سبب اللہ نے اسے گمراہ کیا ہے) اور اس بنا پر یہ ہونا چاہیے: فِیم أغویتنی؟ (کیونکر تو نے مجھے گمراہ کیا؟)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فبما اهلكتنی بلعنك إیای (کس سبب سے تو نے مجھے اپنی لعنت کا مستحق قرار دے کر ہلاک کیا)؟ تو اس کے مطابق اغواء بمعنی اہلاک (ہلاک کرنا) ہوا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (مریم) ای ھلاکا (وہ ہلاکت کو جا ملیں گے)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی فبما أضللتنی (تو نے مجھے کس سبب سے گمراہ کیا؟) تو اس میں اغوا بمعنی اضلال (گمراہ کرنا) اور ابعاد (اپنی رحمت سے دور کرنا) ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: خیبتنی من رحمتك (تو نے مجھے اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے) اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وَمَنْ يَغْوَ لَا يَعْدَمْ عَلَى الْغَيِّ لَائِمًا

ای مَنْ یَخِب (جو محروم ہو جاتا ہے)

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: غوی الرجل (یغوی) غیا جب آدمی پر اس کا معاملہ فاسد ہو جائے یا اس کے دل میں وہ فاسد ہو جائے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ﴿۱۲۱﴾ (طٰہٰ) (اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا) کے معانی میں سے ایک ہے یعنی جنت میں اس کا رہنا فاسد ہو گیا۔

اور کہا جاتا ہے: غَوِی الفَصِیل (جب اونٹ کے بچے کو بدہضمی ہونا اور لاغری سے قریب بہ ہلاکت ہونا) جب وہ اپنی ماں کا دودھ نہ پی سکے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا اور اس میں کفر پیدا کر دیا، اسی وجہ سے اس ارشاد میں اغوا (گمراہ کرنے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور یہی حقیقت ہے اور موجود کوئی شے نہیں ہے مگر وہ اس کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہی سب صادر ہوتا ہے۔ قدریہ وغیرہ نے ابلیس کی مخالفت کی ہے جس کی اطاعت و مطاوعت انہوں نے ہر اس معاملے میں کی جسے اس نے ان کے لیے مزین اور آراستہ کیا، لیکن اس مسئلہ میں انہوں نے اس کی پیروی نہ کی اور وہ کہتے ہیں: ابلیس نے غلطی اور خطا کی ہے اور وہ خطا کا اہل تھا اسی وجہ سے اس نے گمراہی کی نسبت اپنے رب کی طرف کی، اللہ تعالیٰ اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ تو انہیں کہا جائے گا: ابلیس اگر خطا کا اہل ہے تو تم نبی علیہ السلام کے

بارے میں کیا کرو گے جو مکرم اور معصوم ہے اور وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا: وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؀ (ہود) (اور نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی اگرچہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے وہ پروردگار ہے تمہارا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت طاؤس کے پاس مسجد حرام میں ایک آدمی آیا اور وہ قدریہ (فرقہ سے) متہم تھا اور وہ بڑے اور عظیم فقہاء میں سے تھا۔ پس وہ آپ کے پاس بیٹھ گیا تو حضرت طاؤس نے اسے کہا: تو اٹھے گا یا تجھے اٹھایا جائے گا؟ تو حضرت طاؤس کو عرض کی گئی: آپ یہ الفاظ ایک فقیہ آدمی کو کہہ رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: ابلیس افقه منه (ابلیس اس سے بڑھ کر فقیہ ہے) ابلیس کہتا ہے: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (الحجر:39) (اے میرے رب! کس سبب سے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے) اور یہ کہتا ہے: أنا أغوی نفسی (میں اپنے آپ کو گمراہ کرتا ہوں)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی (میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور ان کی تاک میں بیٹھوں گا) اس سے اعراض کرنے کے ساتھ اور باطل کو مزین و آراستہ کرنے کے ساتھ یہاں تک کہ وہ اسی طرح ہلاک ہو جائیں جیسے وہ ہلاک ہوا یا وہ انہیں اسی طرح گمراہ کر دے جیسے وہ گمراہ ہوا یا وہ انہیں اسی طرح محروم کر دے جیسے اسے محروم کیا گیا، جیسا کہ یہ تینوں معانی اَغْوَيْتَنِيْ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ اور صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے۔ اور صِرَاطَكَ منصوب ہے اس بنا پر کہ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پہلے علی یا فی محذوف ہے، جیسے سیبویہ نے بیان کیا ہے ضرب زید الظهر و البطن اور یہ شعر بھی کہا:

لَدْنٌ بِهَزِّ الكَفِّ يَعْسِلُ مَتْنُه   فيه كما عَسَل الطريقَ الثَّعْلَبُ(1)

(دونوں مثالوں میں الظهر و البطن اور الطریق سے پہلے حروف جار محذوف ہے)

اور اس قول: ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ کی تاویل میں جو احسن ترین قول کہا گیا ہے (وہ یہ ہے): میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا حق سے اور انہیں دنیا میں رغبت دلاؤں گا اور انہیں آخرت کے بارے میں شک میں مبتلا کروں گا اور گمراہی میں یہ انتہا ہے، جیسے اس نے کہا: وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ (النسا:119) جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور سفیان نے منصور سے اور اس نے حکم بن عتیبہ سے روایت کیا ہے(2) کہ اس نے کہا: مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ یعنی ان کی دنیا کی جانب سے۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ ان کی آخرت کی جانب سے۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان کی نیکیوں کی جانب سے۔ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں اور برائیوں کے اعتبار سے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور اس کی شرح یہ ہے کہ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ کا معنی ہے میں ضرور ان کے پاس آؤں گا ان کی دنیا کی جانب سے، یہاں تک کہ وہ اس میں موجود آیات اور امم ماضیہ کی اخبار کو جھٹلانے لگیں وَمِنْ خَلْفِهِمْ اور ان کی آخرت کی جانب سے یہاں تک کہ وہ اس کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 380
2۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 162

تکذیب کردیں۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ ان کی نیکیوں اور ان کے امور دینیہ کی جانب سے۔ اور اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے: اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾ (الصافات) (کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کروفر سے)

وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ یعنی ان کے گناہوں کی طرف سے، یعنی وہ شہوات کی اتباع و پیروی کریں گے، کیونکہ وہ شہوات کو ان کے لیے مزین و آراستہ کردے گا۔ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ اور تو ان میں سے اکثر کو موحد، اطاعت کرنے والا فرمانبردار اور اظہار شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

”فرمایا: نکل جا یہاں سے ذلیل (اور) راندہ ہوا جس کسی نے پیروی کی تیری ان سے تو یقیناً میں بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے“۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا فرمایا: تو جنت سے نکل جا۔ مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا، مذءوما بمعنی مذموما (مذمت کیا ہوا، ذلیل و خوار) ہے اور الذام میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عیب ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: مَذْءُوْمًا اور مذموما معنی کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذأمته و ذممته اور ذمته تمام کا معنی ایک ہے۔ اور اعمش نے مذوما پڑھا ہے۔ اور معنی ایک ہے، مگر انہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مذءوم کی نفی کی گئی ہے اور دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور مدحور کا معنی دور کیا ہوا، بھگایا ہوا ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے اور اس کا اصل معنی الدفع (دفع کرنا) ہے۔ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ اس میں لام، لام قسم ہے اور جواب قسم لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَمَنْ تَبِعَكَ میں لام توکید ہے۔ اور لَاَمْلَئَنَّ میں لام قسم ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ غیر قراءت میں پہلی لام کو حذف کرنا جائز ہے اور دوسری کو حذف کرنا جائز نہیں ہوتا۔ کلام میں شرط اور جزا کا معنی ہے۔ بمعنی من تبعك عذبته (جس نے تیری اتباع کی میں اسے عذاب دوں گا) اور اگر تو کہے: من تبعك أعذبه تو یہ جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ تو ارادہ یہ کرے لأعذبه اور عاصم نے ابوبکر بن عیاش کی روایت سے لِمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ کو لام مسکور کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے من أجل من تبعك۔ واللہ اعلم۔

جیسے کہا جاتا ہے: أكرمت فلانا لك اور کبھی معنی ہوتا ہے: الدحر لمن تبعك (دفع کرنا اور بھگایا جانا اس کے لیے ہے جو تیری اتباع کرے گا) اور مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ کا معنی ہے یعنی تم میں سے اور اولاد آدم میں سے۔ کیونکہ اس کا ذکر ہی چل رہا ہے کیونکہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ یہ اولاد آدم کو خطاب ہے۔

وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

''اور اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے''۔

ابلیس کو آسمان سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا: تم اور حواء دونوں جنت میں رہو۔ اور سورۃ البقرہ میں اسکان (سکونت اختیار کرنے کے لیے کہنا) کا معنی گزر چکا ہے اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کا معنی وہاں گزر چکا ہے۔ والحمد للہ

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰

''پھر وسوسہ ڈالا ان کے (دلوں میں) شیطان نے تاکہ بے پردہ کر دے ان کے لیے جو ڈھانپا گیا تھا ان کی شرمگاہوں سے اور (انہیں) کہا کہ نہیں منع کیا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لیے کہ کہیں نہ بن جاؤ تم دونوں فرشتے یا کہیں نہ ہو جاؤ ہمیشہ زندہ رہنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ یعنی ان دونوں کی طرف شیطان نے وسوسہ اندازی کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جنت کے اندر سے کہ اس نے سانپ کی صورت میں اپنے آپ کو جنت میں داخل کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنت کے باہر سے، اس اختیار کے ساتھ جو اسے دیا گیا۔ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور وسوسہ کا معنی ہے: الصوت الخفی (1) (مخفی اور پوشیدہ آواز) اور وسوسۃ کا معنی ہے: حدیث النفس (اندر کی بات (دل میں اٹھنے والا خیال)۔ کہا جاتا ہے: وسوسٙت إليه نفسه وسوسة ووسواسا (اس کے نفس نے اس میں یہ بات ڈال دی) اور وسواس (واؤ کے فتحہ کے ساتھ) اسم ہے، مثلاً زلزال اور شکار کرنے والے اور کتے کی آہٹ اور آہستہ آواز اور زیورات کی آواز کو وسواس کہا جاتا ہے۔ اعشی نے کہا ہے:

تَسْمَعُ للحَلْي وَسواسا إذا انصرفَتْ　كما استعانَ بريح عِشْرِقٌ زَجِلُ

اور وسواس شیطان کا نام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝ (الناس)

لِيُبْدِيَ لَهُمَا تاکہ ان دونوں کے لیے ظاہر کر دے۔ اس میں لام لام عاقبت ہے، جیسے اس ارشاد میں ہے: ليكون لهم عدوا وحزنا (تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کی ہے۔ اور وٗرِيَ کا معنی ہے ان سے جو چھپایا گیا ہے اور ڈھانپا گیا ہے۔ اور غیر قرآن میں اسے اوری پڑھنا بھی جائز ہے، جیسے أُقِتَت۔ اور مِنْ سَوْاٰتِهِمَا کا معنی ہے ان کی شرمگاہوں سے (اى من عوراتهما) اور فرج (شرمگاہ) کو عورت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ اسے ظاہر کرنا اس کے صاحب کو برا لگتا ہے۔ اور یہ شرمگاہ کو ننگا کرنے کے قبیح اور برا ہونے پر دلیل ہے، سو یہ کہا گیا کہ ان کی شرمگاہیں ان دونوں کے لیے ظاہر ہیں ان کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ ان دونوں پر پتے اور کلیاں ہیں جن کے سبب ان کی شرمگاہوں کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا پھر وہ کلیاں زائل ہو گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 137

ہے کہ ان پر کپڑا تھا اور پھر وہ ساقط ہوگیا (گر گیا) واللہ اعلم

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اس میں اَنْ محل نصب میں ہے، بمعنی اِلَّآ ہے، اَنْ کو مکروہ قرار دیتے ہوئے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ اور کوفی کہتے ہیں: لئلا تکونا (تاکہ تم دونوں نہ ہو جاؤ)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ای الا ان لا تکونا ملکین تعلمان الخیر والشر (مگر یہ کہ تم دونوں نہ ہو جاؤ فرشتے جو خیر و شر کو جانتے ہیں)۔ اور کہا گیا ہے: حضرت آدم علیہ السلام نے ہمیشہ رہنے کا طمع کیا، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ ملائکہ یوم قیامت تک نہیں مریں گے۔

نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر ساری مخلوق پر فرشتوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اور ایک یہ ہے وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام:50) (اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں) اور یہ بھی ہے: وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النسا:172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)۔ اور حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو شکل و صورت، پروں اور عزت و تکریم کے اعتبار سے فضیلت دی ہے(1)۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے طاعت اور ترک معصیت کی وجہ سے انہیں فضیلت دی، پس اس وجہ سے ہر شی میں فضیلت واقع ہوتی ہے۔

اور ابن فورک (2) نے کہا ہے: اس آیت میں یہ دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس معنی میں دو فرشتے مراد ہوں کہ ان دونوں کے لیے کھانے کی طلب نہیں ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، زجاج اور بہت سے علماء کی پسند یہ ہے کہ مومنین کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، سوائے فرشتوں کے ایک گروہ کے اور وہ ہیں حضرت جبریل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام اور حضرت ملک الموت علیہ السلام، کیونکہ یہ من جملہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔ اور ہر فریق نے شریعت کے ظاہر سے استدلال کیا ہے اور فضیلت اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لام کے کسرہ کے ساتھ مَلِكَيْنِ قراءت کی ہے اور یہی قراءت یحییٰ بن ابی کثیر اور ضحاک کی ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے لام کے کسرہ کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کوئی ملک نہ تھا کہ دو ملک ہو جائیں۔

حضرت نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس قراءت کی بنا پر لام کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے، لیکن پہلی قراءت میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (3) نے فرمایا کہ یہ دونوں ملک کی جہت سے ملعون ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ) (کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو)۔ اور ابو عبید نے گمان کیا ہے کہ یحییٰ بن ابی کثیر کا استدلال اس قول کے ساتھ ہے۔ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى اور یہ حجۃ بینہ ہے، لیکن لوگوں نے اسے ترک کر دیا ہے اسی لیے ہم نے بھی اسے ترک کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 88 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 385 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 167

ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ شاذ قراءت ہے۔

ابوعبید کے اس کلام کا انکار کیا گیا ہے اور اسے فحش غلطی قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ وہم ہوا ہو کہ وہ جنت کی بادشاہی سے زیادہ تک پہنچ سکتے ہیں، حالانکہ جنت ہی طالبین کی انتہا اور غایت ہے۔ بلاشبہ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى کا معنی جنت کی بادشاہی میں قائم رہنا، اور اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝

''اور قسم اٹھائی ان کے سامنے کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: وَقَاسَمَهُمَآ یعنی ان دونوں کے لیے قسم اٹھائی، کہا جاتا ہے: أقسم إقساما! بمعنی حلف (اس نے قسم اٹھائی) شاعر نے کہا ہے:

وقاسمها بالله جهدا لأنتم ألذ من السلوى إذا ما نشورها(1)

اور اس میں ایک کی جانب سے باب مفاعلہ ذکر کیا ہے۔ اور اس سے اس کا رد ہوتا ہے جس نے کہا ہے کہ باب مفاعلہ دونوں (فاعل اور مفعول) کی جانب سے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ، لکما صلہ میں داخل نہیں ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: إنی ناصح لکما لمن الناصحین (بلاشبہ میں تم دونوں کو نصیحت کر رہا ہوں، کیونکہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)

یہ ہشام نحوی نے کہا ہے۔ اور اس کی مثال سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور کلام کا معنی ہے: اتبعانی أرشد کما (تم دونوں میری اتباع کرو میں تمہاری رہنمائی کروں گا) اسے قتادہ نے ذکر کیا ہے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

''پس شیطان نے نیچے گرا دیا ان کو دھوکہ سے، پھر جب دونوں نے چکھ لیا درخت سے تو ظاہر ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور چھپانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے اور ندا دی انہیں ان کے رب نے، کیا نہیں منع کیا تھا میں نے تمہیں اس درخت سے اور کیا نہ فرمایا تھا تمہیں کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ دونوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لیے اور نہ رحم

1۔ احمر راوتیز، جلد 2، صفحہ 385

فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیچے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک"۔

قولہ تعالیٰ: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ یعنی شیطان نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے انہیں قسم کے ساتھ دھوکہ دیا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام یہ گمان رکھتے تھے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا، پس شیطان نے انہیں اپنی وسوسہ اندازی اور قسم کے ساتھ دھوکہ میں ڈال دیا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس نے ان دونوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائی یہاں تک کہ انہیں دھوکے میں ڈال دیا۔ اور مومن اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ کھا جاتا ہے(1)۔ بعض علماء کہتے ہیں: جس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ دھوکہ دیا ہم وہ دھوکہ کھا گئے (2)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: المؤمن غِرٌّ کریم والفاجر خَبٌّ لَئِیمٌ(3) (مومن ناتجربہ کار دھوکہ کھانے والا اور سخی ہے اور فاجر دغاباز اور لعین ہے) اور نفطویہ نے کہا ہے:

إنّ الکریم إذا تَشَاءُ خَدَعتَه　　وتری اللَّئِیمَ مُجرِبًا لَا یُخْدَعُ

بے شک کریم کو جب تو چاہے اسے دھوکے میں مبتلا کر دے اور تو لئیم کو تجربہ کار دیکھے گا اسے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا"۔

فَدَلّٰىهُمَا کہا جاتا ہے: أدلیٰ دلوہ اس نے اپنا ڈول نیچے لٹکایا۔ و دلاھا اور اسے نکالا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دلاھما کا معنی ہے اس نے ان دونوں کو جرات دلائی۔ یہ الدالۃ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے جرأت کرنا یعنی اس نے انہیں معصیت پر جرأت دلائی تو وہ جنت سے نکل گئے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ یعنی جب انہوں نے اس درخت سے کھایا۔ اور سورۃ البقرہ میں اس درخت کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کیسے کھایا۔

بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا پہلے حضرت مائی حوا علیہا السلام نے کھایا تو انہیں کوئی شے نہ پہنچی (یعنی کوئی تکلیف نہ پہنچی) پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کھایا تو سزا نافذ ہوگئی، کیونکہ اس کے قریب جانے کی نہی دونوں کے لیے تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کلیاں اور پتے جوان کا لباس تھے وہ اتر گئے اور ہاتھوں اور پاؤں میں ناخن آ گئے۔

مسئلہ نمبر 2۔ وَ طَفِقَا اس میں فا کو ساکن پڑھنا جائز ہے اور اخفش نے طَفَقَ یَطْفِقُ بیان کیا ہے، مثلاً ضرب یضرب کہا جاتا ہے: طفق یعنی وہ کام میں شروع ہوا۔ یَخْصِفٰنِ حسن نے اسے خا کے کسرہ اور صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اصل میں یختصفان تھا اس میں ادغام کیا گیا (تا کو صاد سے بدلنے کے بعد صاد کو صاد میں) اور التقاء ساکنین کی وجہ سے خا کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 459　　2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 959　　3۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 110

کسرہ دیا گیا ہے۔ اور ابن بریدہ اور یعقوب نے خا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے تا کی حرکت اس کو دی ہے اور یُخَصِّفان کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یہ خَصَّفَ یُخَصِّفُ سے ماخوذ ہے۔

اور زہری نے یُخْصِفان پڑھا ہے یہ أخْصَفَ سے ہے۔ اور یہ دونوں ہمزہ یا تضعیف سے منقول ہے اور معنی یہ ہے: وہ دونوں پتے کاٹنے لگے اور انہیں چپٹانے لگے تاکہ وہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ سکیں۔ اور اسی سے خَصَفَ النعل (اس نے جوتے کا چمڑا چپٹایا) ہے۔ اور خصاف وہ ہوتا ہے جو جوتے سیتا ہے۔ اور مِخْصَف مِثْقَب (برما) کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد انجیر کے پتے ہیں (1)۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی شرمگاہ ننگی اور ظاہر ہوگئی تو وہ جنت کے درختوں کا چکر لگانے لگے تاکہ وہ ان سے پتے لیں اور ان کے ساتھ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکیں، تو جنت کے درختوں نے آپ کو روک دیا (ڈانٹ دیا) یہاں تک کہ انجیر کے درخت نے آپ پر رحم کیا اور پتا آپ کو عطا کیا، تو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حواء علیہما السلام جنت کے پتے اپنے اوپر چپٹانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انجیر کو بدلا یہ دیا کہ حلاوت اور منفعت میں اس کے ظاہر اور باطن کو ایک جیسا کر دیا اور اسے ایک سال میں دو بار پھل عطا فرمایا۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت میں کشف عورۃ کے قبیح ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر اسے ڈھانپنا واجب کر دیا، اس لیے انہوں نے اسے ڈھانپنے میں جلدی اور تیزی کی، اور یہ اس کے مانع نہیں ہے کہ اس کے بارے انہیں یہ حکم جنت میں دیا گیا، جیسے انہیں یہ کہا گیا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (الاعراف: 19)

اور صاحب البیان نے امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ جو آدمی درخت کے پتوں کے سوا کوئی شی ایسی نہ پائے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ سکتا ہو، تو اس پر انہیں کے ساتھ ڈھانپنا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ یہ ظاہری پردہ ہے جس کے ساتھ پردہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو سکتا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں کیا۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا: کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا ربنا (اے ہمارے رب!) یہ ندا مضاف ہے۔ اصل میں یہ یا ربنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک "یا" کو حذف کرنے میں تعظیم کا معنی ہے، پس انہوں نے اپنی خطا کا اعتراف کیا اور توبہ کر لی۔ اس کی بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور قول باری تعالیٰ: قَالَ اهْبِطُوْا کا معنی آخر آیت تک پہلے گزر چکا ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

"(نیز) فرمایا: اسی زمین میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے تم اٹھائے جاؤ گے"۔

اس میں مذکورہ تمام ضمیریں الارض (زمین) کے لیے ہیں۔ اور قَالَ میں واؤ ذکر نہیں کی گئی۔ اور اگر وہ ذکر ہوتی تو بھی جائز ہوتا اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: قال زید لعمرو کذا قال له کذا (اس میں قال له کذا سے پہلے واؤ ذکر کر دی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 211

جائے تو وہ درست اور صحیح ہے)

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶

”اے اولاد آدم بے شک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو اور باعث زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے یہ الله کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ بہت سے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ شرمگاہ کو ڈھانپنا واجب ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا: يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اور ایک قوم (گروہ) نے کہا ہے کہ اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے، بلکہ اس میں فقط اس کے انعام ہونے پر دلیل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور من جملہ نعمتوں میں سے ایک شرمگاہ کو ڈھانپنا بھی ہے۔ پس یہ بیان کیا ہے کہ الله سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی اولاد کے لیے وہ کچھ پیدا فرمایا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی شرمگاہوں کو ڈھانپ سکتے ہیں اور یہ پردے کے امر پر دلیل ہے۔ اور لوگوں کی نگاہوں سے ستر عورت کے واجب ہونے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ شرمگاہ کیا ہے؟ تو ابن ابی ذئب نے کہا ہے: یہ مرد میں سے صرف اس کی شرمگاہ ہے، یعنی قبل اور دبر اس کے سوا کوئی حصہ شرمگاہ نہیں۔ اور داؤد اہل ظاہر، ابن ابی مسلمہ اور طبری کا یہی قول ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ، بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا، لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا۔

اور بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(1)۔ کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی گلیوں میں اپنی سواری پر چل رہے تھے۔ اور اس میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اپنی رانوں سے اوپر چڑھالی یہاں تک میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کی سفیدی دیکھ لی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ناف شرمگاہ نہیں ہے اور آدمی کے لیے مکروہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے اپنی ران کھول دے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: گھٹنا شرمگاہ ہے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صحیح روایت کے مطابق ناف اور دونوں گھٹنے شرمگاہ میں سے نہیں ہیں۔

اور ابوحامد ترمذی نے بیان کیا ہے کہ ناف کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جو آپ نے جرہد کو فرمایا:(2) غط فخذك فإن الفخذ عورة(3) (اپنی ران کو ڈھانپ لے کیونکہ ران شرمگاہ ہے) اسے امام بخاری نے تعلیقاً بیان کیا ہے۔ اور فرمایا: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور حضرت جرہد کی حدیث میں زیادہ احتیاط ہے یہاں تک کہ وہ ان (علماء) کے اختلاف سے نکل جائے۔ اور جرہد کی یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53
2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستئذان والادب، جلد 2، صفحہ 103
3۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53

حدیث اس کے خلاف دلالت کرتی ہے جو کچھ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ناف پر بوسہ دیا اور کہا: میں تمہیں اسی جگہ بوسہ دے رہا ہوں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں بوسہ دیتے تھے (1)۔ پس اگر ناف شرمگاہ ہوتی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہاں بوسہ نہ دیتے اور نہ ہی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ انہیں اس کی اجازت دیتے۔ اور جہاں تک آزاد عورت کا تعلق ہے تو اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا اس کا سارا بدن شرمگاہ ہے اور یہی نظریہ اکثر اہل علم کا ہے۔

تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَرَادَ أَنْ يَتَزَوَّجَ امْرَأَةً فَلْيَنْظُرْ إِلَى وَجْهِهَا وَكَفَّيْهَا (2) (جو آدمی کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کو دیکھ لے) اور اس لیے بھی کہ احرام میں بھی چہرے کو ننگا کرنا واجب ہے۔ ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے: عورت کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور رہی ام ولد (ایسی کنیز جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) تو اس کے بارے اثرم نے کہا ہے: میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ان سے ام ولد کے بارے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ نماز کیسے پڑھے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ اپنا سر اور اپنے پاؤں ڈھانپ لے گی، کیونکہ اسے بیچا نہیں جا سکتا اور وہ اسی طرح نماز پڑھے گی جیسے آزاد عورت پڑھتی ہے۔ اور جہاں تک لونڈی کا تعلق ہے تو اس کا وہ سارا جسم شرمگاہ ہے جو پستانوں سے نیچے ہے اور اس کے لیے اپنے سر اور اپنی کلائیوں کو ننگا کرنا جائز ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا حکم مرد کے حکم کی مثل ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لیے اپنے سر اور سینے کو ننگا کرنا مکروہ ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لونڈیوں کو اپنے سر ڈھانپنے پر سزا دیتے تھے اور فرماتے تھے: تم آزاد عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر اس کی ران ننگی ہوئی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے۔ اور ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام نے کہا ہے کہ لونڈی کے اعضاء میں سے ہر عضو شرمگاہ ہے یہاں تک کہ اس کے ناخن بھی۔ اور یہ فقہاء کے اقوال سے خارج ہے، کیونکہ ان کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد عورت کے لیے جائز ہے کہ فرض نماز پڑھے اور اس کے دونوں ہاتھ اور چہرہ مکمل طور پر ننگے ہوں اور وہ ان کے ساتھ زمین کو مس کر رہی ہو۔ تو پھر لونڈی کے لیے بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہوگا اور ام ولد کی حالت لونڈی سے زیادہ گہری ہے۔ اور صغیر بچے کی شرمگاہ کی کوئی حرمت نہیں ہے۔ اور جب بچی اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے آنکھ کا اشارہ ہو سکتا ہو اور اسے شہوت دلائی جا سکتی ہو تو پھر وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔

اور ابو بکر بن عبد الرحمن کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (الاحزاب: 59) (اے نبی مکرم! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو) اور حضرت

1۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 255　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 289

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کون سے کپڑوں میں عورت نماز پڑھ سکتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ قمیص اور ایسی اوڑھنی میں جو اس کے پاؤں کے ظاہر کو ڈھانپ سکتی ہو نماز پڑھ سکتی ہے (1)۔ اسے مرفوع روایت کیا گیا ہے اور جنہوں نے اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پر موقوف روایت کیا ہے وہ زیادہ ہیں اور زیادہ حافظ ہیں۔ ان میں مالک اور ابن اسحاق وغیرہ ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے: عبدالرحمن بن عبداللہ بن دینار نے اسے محمد بن زید عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مرفوع روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ ابوعمر نے کہا ہے: ان کے نزدیک یہ عبدالرحمن ضعیف راوی ہے، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بعض احادیث کو روایت کیا ہے۔ اور اس باب میں اجماع خبر سے زیادہ قوی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا یعنی ہم نے تم پر وہ بارش برسائی جو روئی اور کتان (السی کا پودا جس سے کپڑے بنائے جاتے ہیں) اگاتی ہے اور ان جانوروں کو قائم رکھتی ہے جن سے اون اور بال وغیرہ حاصل ہوتے ہیں اور یہ مجازی مفہوم ہے اور اسی کی مثل یہ آیت ہے وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس انزال سے مراد لباس میں اس شے کو اتارنا ہے جو حضرت آدم اور حضرت مائی حواء علیہما السلام کے ساتھ تھی، تاکہ وہ اپنے غیر کے لیے مثال بن جائے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ یعنی ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر: 6) اس میں بھی انزل بمعنی خلق ہے، جیسے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے تمہیں اسے بنانے کی کیفیت کے بارے الہام کیا (یعنی تمہارے ذہنوں میں اسے بنانے کا طریقہ ڈال دیا)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ رِيَاشًا ابوعبدالرحمن، حسن اور عاصم نے مفضل ضبی کی روایت سے، ابوعمرو نے حسین بن علی جعفی کی روایت سے وریاشا پڑھا ہے اور ابوعبید نے اسے حسن کے سوا کسی سے بیان نہیں کیا اور اس کے معنی کی تفسیر بیان نہیں کی۔ یہ ریش کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ زینت ہے جو مال اور لباس کے سبب ہو۔ اور فراء (2) نے کہا ہے: ریش و ریاش جیسے کہا جاتا ہے: لبس و لباس اور ریش الطائر (پرندے کے پر) وہ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد زندگی کی فراخی اور خوشحالی ہے۔ اور وہ معنی جسے اکثر اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ ریش لباس یا معیشت میں سے وہ شی ہے جو ڈھانپ لے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فَرِيشِي منكم وهَوايَ معكم وإنْ كانت زيارَتكم لِماما (3)

اور ابوحاتم نے ابوعبیدہ سے بیان کیا ہے: وهبت له دابة بريشها اسے سواری لباس سمیت دی گئی، مراد وہ کپڑے ہیں جو اس پر ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ بیان فرمایا کہ تقویٰ بہترین اور اچھا لباس ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 94 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 139 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 214

إذا المرء لم يلبس ثياباً من التقیٰ　　تقلب عريانا وإن كان كاسيا

جب آدمی تقویٰ کا لباس نہیں پہنتا تو وہ ننگا ہی لگتا ہے اگر چہ لباس پہنے ہوئے ہو۔

وخير لباس المرء طاعة ربه　　ولا خير فيمن كان لله عاصيا

اور آدمی کا بہترین لباس اپنے رب کی اطاعت ہے اور اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

اور قاسم بن مالک نے عوف سے اور انہوں نے معبد جہنی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: لِبَاسُ التَّقْوٰی تقویٰ کا لباس حیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد عمل صالح ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد چہرے پر حسین خاموشی ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی اور اس کے بارے رہنمائی فرمائی۔ اور یہ قول بھی ہے: لِبَاسُ التَّقْوٰی سے مراد اون اور کھدر کے کپڑے پہننے ہیں۔

یہ ان میں سے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع وانکساری کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کی عبادت کی جاتی ہے اور یہ دوسرے لباس سے بہتر ہے۔ اور زید بن علی نے کہا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰی سے مراد زرہ اور خود، دو کلائیاں اور دو پنڈلیاں ہیں، جن کے ساتھ جنگ میں اپنی حفاظت کی جاتی ہے (2)۔ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ڈر ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے خوف کا احساس کرنا ہے ان تمام امور میں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور جن سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی صحیح ہے، اور اسی کی طرف حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہم کا قول راجع ہے۔ اور حضرت زید بن علی کا قول حسن اور اچھا ہے، کیونکہ انہوں نے جہاد پر ابھارا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد شرمگاہ کو ڈھانپنا ہے (4)۔ اور یہ اس میں تکرار ہے، کیونکہ پہلے ارشاد فرمایا: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد کھدر کا لباس پہننا ہے، کیونکہ یہ تواضع اور ترک رعونت کے زیادہ قریب ہے تو یہ ایک دعویٰ ہے، حالانکہ علماء میں سے فضلاء تقویٰ کے حصول کے ساتھ ساتھ انتہائی قیمتی اور اعلیٰ لباس پہنتے ہیں، جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اہل مدینہ اور کسائی نے لباس کو پہلے لباساً پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ یعنی وانزلنا لباس التقوى اور باقیوں نے مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور ذالك اس کی صفت ہے اور خير مبتدا کی خبر ہے۔ اور اس کا معنی ہے: تقویٰ کا لباس جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ ہے جسے تم جانتے ہو، تمہارے لیے ان کپڑوں کے پہننے سے بہتر ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتے ہیں اور یہ وہ زینت ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل فرمائی، پس تم اسے پہن لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ھو ضمیر مضمر ہے، یعنی ھو لباس التقوى

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389　　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 463

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 389　　4۔ ایضاً

یعنی وہ ستر عورت ہے اور اسی کے مطابق ابن زید کا قول ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے ولباس التقوی ھو خیر یعنی ذالک بمعنی ھو ہے اور پہلی ترکیب ہی زیادہ احسن ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اور اعمش نے ولباس التقوی خیرٌ پڑھا ہے۔ انہوں نے ذالک نہیں پڑھا۔ اور یہ مصحف کے خلاف ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ ان علامات اور نشانیوں میں سے ہے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کا خالق ہے اور ذالک صفت یا بدل یا عطف بیان ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

”اے اولاد آدم! نہ فتنہ میں مبتلا کر دے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے (اور) اتروا دیا ان سے ان کا لباس تاکہ دکھلا دے انہیں ان کے پردہ کی جگہیں۔ بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں۔ بلاشبہ ہم نے بنا دیا شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَفْتِنَنَّكُمُ یعنی شیطان تمہیں دین سے پھیر نہ دے، جیسے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال کر فتنہ میں مبتلا کیا۔ ابٌ مذکر کے لیے اور ابۃٌ مونث کے لیے آتا ہے۔ پس اسی بنا پر ابوان کہا گیا ہے۔ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے اور مِّنَ الْجَنَّةِ پر وقف کیا جائے گا۔ لِيُرِيَهُمَا یہ لام کی کے سبب منصوب ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ، یراکم اصل میں یرء اکم تھا پھر ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ اور وقبیلہ اس کا عطف ضمیر پر ہے اور ھو برائے تاکید ہے تاکہ عطف احسن ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرہ: 35) یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رأیتك وعمرو کہنا قبیح ہے، (یعنی ضمیر متصل پر عطف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ضمیر منفصل سے اس کی تائید لگائی جائے)۔ اور اس پر کہ مضمر، مظہر کی طرح ہوتا ہے۔ اور اس میں ستر عورت کے واجب ہونے پر بھی دلیل ہے۔ کیونکہ ارشاد گرامی ہے: يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا اور دوسروں نے کہا ہے: بلاشبہ اس میں زوال نعمت سے تحذیر اور ڈراوا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا۔ یہ تب ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت ہم پر لازم ہوتی ہے اور معاملہ اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ اس میں قَبِيْلُهٗ سے مراد شیطان کا لشکر ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد جن اور شیاطین ہیں (1)۔ ابن زید نے کہا ہے: قَبِيْلُهٗ سے مراد اس کی نسل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی قوم مراد ہے۔ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ جن دیکھے نہیں جا سکتے (2)، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے ہو)۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 141	2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 98

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا دکھائی دینا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انہیں دکھانے کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کے جسموں سے پردہ ہٹا دیتا ہے یہاں تک کہ انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جن نہیں دکھائی دیتے مگر اس وقت کے نبی علیہ السلام کو (دکھائی دیتے ہیں) تاکہ یہ اس کی نبوت پر دلیل ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خلقت میں تخلیق فرمایا ہے جس میں وہ دکھائی نہیں دیتے، ہاں جب وہ اپنی اصلی صورتوں سے کسی اور شکل میں منتقل ہوتے ہیں تو پھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ ان معجزات میں سے ہے جو انبیاء وقت صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے سوا ظاہر نہیں ہو سکتا۔

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے عادت جاریہ بنا دی ہے کہ آج (دنیا میں) اولاد آدم شیاطین کو نہیں دیکھ سکتی۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: إن الشيطان يجري من ابن آدم مجرى الدم (1) (بے شک شیطان انسان کی رگ خون میں چلتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ (الناس) (جو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے لوگوں کے دلوں میں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن للملك لمة وللشيطان لمة (2) (بے شک (دل میں) ایک خیال فرشتے کی جانب سے آتا ہے اور ایک شیطان کی جانب سے) پس جہاں تک فرشتے کے خیال کا تعلق ہے تو خیر اور بھلائی کا وعدہ اور حق کی تصدیق ہوتا ہے اور جہاں تک شیطان کے خیال کا تعلق ہے تو وہ شر کا وعدہ اور حق کی تکذیب کے بارے ہوتا ہے) اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور شیاطین اور (جنات) کی رؤیت کے بارے میں اخبار صحیح موجود ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (3) کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد فرمائی اور آگے انہوں نے طویل قصہ بیان کیا اور اس میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اس جن کو پکڑ لیا جو کھجوریں اٹھاتا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ما فعل أسيرك البارحة (4) (گزشتہ رات تیرے قیدی نے کیا کیا) اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والله لولا دعوة أخي سليمان لأصبح موثقا يلعب به ولدان أهل المدينة (5) (قسم بخدا! اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو میں صبح کے وقت اسے بندھا ہوا چھوڑ دیتا یہاں تک کہ اہل مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیلتے) اور اس عفریت کے بارے میں جو آپ پر اچانک حاضر ہو جاتا تھا سورۃ ص میں اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ہم نے ان کی سزا میں اضافہ کرتے ہوئے شیاطین کو ان کا دوست بنا دیا اور ہم نے انہیں حق سے انحراف کرنے میں مساوی اور برابر قرار دیا۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 918 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 123
3۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310 4۔ ایضاً 5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 205

''اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں: پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔ آپ فرمادیجئے: بے شک اللہ حکم نہیں دیتا بے حیائیوں کا۔ کیا ایسی بات لگاتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے''۔

اکثر مفسرین کے قول کے مطابق یہاں فَاحِشَۃً سے مراد ان کا ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرنا ہے (1)۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد شرک اور کفر ہے (2)۔ اور اس پر انہوں نے ان کی اپنے اسلاف کی تقلید کرنے سے استدلال کیا ہے اور اس سے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بارے حکم دیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا (اور اللہ نے بھی ہمیں اس کا حکم دیا ہے) یہ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اس (نظریہ) کو ناپسند کرتا جس پر ہم ہیں تو ہم یقیناً اس سے منتقل ہو جاتے (3)۔ قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ بیان فرمایا کہ وہ اپنی رائے اور مرضی سے فیصلہ دے رہے ہیں اور انہوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور تقلید کی مذمت اور ان کی بہت سی جہالتوں کی مذمت گزر چکی ہے۔ اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۣ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْہَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِیْقًا ہَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْہِمُ الضَّلٰلَۃُ ؕ اِنَّہُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّہُمْ مُّہْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

''آپ فرمائیے حکم دیا ہے میرے رب نے عدل وانصاف کا، اور سیدھا کرو اپنے چہرے (قبلہ کی طرف) ہر نماز کے وقت اور عبادت کرو اس کی اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لیے عبادت کو جس طرح اس نے پہلے پیدا کیا تھا تمہیں ویسے ہی تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دے دی اور ایک گروہ ہے کہ مقرر ہو گئی ان پر گمراہی، انہوں نے بنالیا شیطانوں کو (اپنا) دوست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قسط کا معنی عدل ہے (5)، یعنی اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے پس تم اس کی اطاعت کرو اور کلام میں حذف ہے۔ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْہَكُمْ اور ہر نماز میں تم اپنے چہروں کو قبلہ شریف کی طرف متوجہ کرو۔ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ جس مسجد میں بھی تم ہو۔ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ یعنی تم اسے وحدہ لاشریک مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ اس کی مثل یہ آیت ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (الانعام: 94) (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اور کاف محل نصب میں ہے، یعنی

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 99　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 216　　3۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 91
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 464　　5۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 183

تعودون کما بدأکم یعنی جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ تمہیں لوٹائے گا۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اپنے ماقبل کے متعلق ہے۔

یعنی ومنھا تُخرَجون کما بدأکم تعودُون (اس سے تم نکالے جاؤ گے جیسے اس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ فَرِيْقًا هَدٰى اس میں فَرِيْقًا، تعودون کی ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای تعودون فریقین تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم دو فریق ہو گے۔ ایک سعادت مند، خوش بخت لوگوں کا گروہ اور دوسرا اشقیا اور بدبخت لوگوں کا گروہ۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت اسے تقویت دیتی ہے: تعودون فریقین فریقا ھدی و فریقا حق علیھم الضلالۃ یہ کسائی سے منقول ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے اس قول باری تعالیٰ: فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ کے ضمن میں کہا ہے: جس کی تخلیق ابتداء اللہ تعالیٰ نے گمراہی وضلالت کے لیے کی وہ اسے گمراہی کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے ہدایت یافتہ لوگوں کے اعمال جیسے اعمال کیے۔ اور جسے ابتداء اللہ تعالیٰ نے ہدایت پر تخلیق فرمایا تو اسے ہدایت کی طرف منتقل کر دے گا، اگرچہ اس نے گمراہ لوگوں کے اعمال کی مثل عمل کیے۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ابتداءً ہی گمراہی پر پیدا کیا اور اس نے فرشتوں کے ساتھ مل کر سعادت وخوش بختی کے اعمال کیے، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اسی کی طرف لوٹا دیا جس پر اسے ابتداءً پیدا فرمایا تھا۔ اور فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ) (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا) اس میں قدریہ اور ان کے تبعین کا واضح رد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَرِيْقًا، هَدٰى کے سبب منصوب ہے۔ اور دوسرا فریقا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے، یعنی و أضل فریقا (اور اس نے ایک گروہ کو گمراہ کر دیا) سیبویہ نے بھی کہا ہے:

أصبحتُ لا أحمل السِّلاحَ ولا أملِكُ رأسَ البعيرِ إن نَفَرا

والذِّئبُ أخشاه إن مررتُ به وَحْدِي وأخشَى الرياحَ والمطرا

فراء نے کہا ہے: اگر مرفوع ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور عیسیٰ ابن عمر نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ أنھم پڑھا ہے۔ یعنی لأنھم

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱

"اے آدم کی اولاد! پہن لیا کرو اپنا لباس ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ یہ خطاب سارے عالم کو ہے، اگرچہ اس سے مقصود عرب کے وہ لوگ ہیں جو ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے، کیونکہ یہ حکم ہر مسجد میں نماز کے لیے عام ہے، کیونکہ اعتبار عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب

کا۔ اور بعض علماء نے اس سے طواف مراد ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ طواف تو صرف اور صرف ایک مسجد میں ہوتا ہے اور وہ جو ہر مسجد کو شامل ہے وہ نماز ہے۔ یہ قول ان کا ہے جن پر مقاصد شریعت مخفی رہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک عورت بیت اللہ شریف کا طواف کر رہی تھی اس حال میں کہ وہ برہنہ تن تھی اور کہہ رہی تھی: کون ہے جو مجھے طواف کے کپڑے عاریۃً دے گا؟ (کہ) وہ اسے اپنی شرمگاہ پر رکھ لے گی۔ اور کہہ رہی تھی:

الیومَ یَبْدُو بعضُه أوكلّه وما بَدَا منه فلا أحِلّه (1)

تب یہ آیت نازل ہوئی: خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور یہ عورت ضباعہ بنت عامر بن قرط تھی۔ یہ حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: عرب لوگ بیت اللہ شریف کا طواف ننگے بدن کرتے تھے سوائے حمس کے اور حمس سے مراد قریش اور ان کی اولاد ہے، وہ ننگے بدن طواف کرتے رہتے تھے مگر یہ کہ قریش انہیں کپڑے عطا کر دیں پس مرد مردوں کو دیتے تھے اور عورتیں عورتوں کو دیتی تھیں۔ اور قریش مزدلفہ سے نہیں نکلتے تھے اور سارے کے سارے لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ اور مسلم کے سوا کسی اور میں ہے: وہ کہتے تھے ہم اہل حرم ہیں، پس عربوں میں سے کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ہمارے کپڑوں کے بغیر طواف کرے اور جب وہ ہماری سرزمین میں داخل ہو جائے تو پھر وہ ہمارے کھانے کے سوا کھانا نہ کھائے، پس عرب میں سے جس کا مکہ مکرمہ میں کوئی دوست نہ ہوتا تو اسے کپڑا عاریۃً دیتا اور نہ کوئی ایسا خوشحال ہوتا جو اسے اس کے عوض اجرت پر رکھ لیتا تو اس کے لیے دو میں سے ایک امر ضروری ہوتا کہ یا تو وہ ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے یا وہ اپنے کپڑوں میں طواف کرے اور جب وہ اپنے طواف سے فارغ ہو تو اپنا لباس اتار کر پھینک دے اور پھر اسے کوئی بھی مس نہ کرے۔ اور اس کپڑے کو اللقی (پھینکا ہوا) کہا جاتا تھا۔ عرب کے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

كفَى حَزَنًا كَرِّی علیه كأنه لقًى بين أيدی الطائفين حَرِیمُ (2)

چنانچہ وہ اسی جہالت، بدعت اور گمراہی پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ، الآیہ اور رسول اللہ ﷺ کے منادی نے یہ اعلان کیا: ألا لا يطوف بالبيت عُرْيان (خبردار! غور سے سنو! کوئی بھی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز ہے اور اس کی زینت جوتا ہے، کیونکہ کرز بن وبرہ نے اسے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے ایک دن فرمایا: خذوا زينة الصلوٰة (تم نماز کی زینت کو اختیار کرو) تو عرض کی گئی: نماز کی زینت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: البسوا نعالكم فصلّوا فيها (تم اپنے جوتے پہن لو اور ان میں نماز پڑھو)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ستر عورت واجب ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے اور جمہور اہل علم نے یہ موقف

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 777 2۔ ایضاً

اختیار کیا ہے کہ یہ نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ اور ابہری نے کہا ہے: یہ بھی من جملہ ایک فرض ہے اور آدمی پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے رکھے چاہے وہ نماز میں ہو یا نہ ہو۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اپنے کپڑے کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے لے لو اور تم ننگے بدن نہ چلو" (1)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور اسماعیل قاضی نے یہ کہا ہے کہ ستر عورت نماز کی سنتوں میں سے ہے اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ستر عورت نماز میں فرض ہوتا تو ننگے آدمی کے لیے نماز پڑھنا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ہر وہ شے جو نماز میں فرض ہے اس پر قدرت ہوتے ہوئے اس پر عمل کرنے یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے بدل کو لانا واجب ہوتا ہے، یا پھر ساری کی ساری نماز ساقط ہو جائے گی، حالانکہ صورت حال اس طرح نہیں ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جب ہم نے کہا ہے کہ ستر عورت نماز میں فرض ہے اور امام کا تہبند گر جائے اور اس کی دبر ننگی ہو جائے اور وہ رکوع کی حالت میں ہو اور وہ اپنا سر اٹھائے اور اسے ڈھانپ لے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے، یہ ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور سحنون نے کہا ہے: مقتدیوں میں سے جس کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے۔ اور سحنون سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ (امام) بھی نماز کا اعادہ کرے گا اور مقتدی بھی اعادہ کریں گے، کیونکہ ستر عورت نماز کی شرائط میں سے ایک شرط ہے اور جب شرمگاہ ظاہر ہو جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس کی اصل طہارت (پاکیزگی) ہے۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے (2)؟ جنہوں نے کہا ہے کہ ان کی نماز باطل نہ ہوگی تو انہوں نے کسی شرط کو مفقود نہیں پایا۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ (اس کپڑے کو) اپنی جگہ باندھ لے اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کی نماز باطل ہوگی جس نے اس کی طرف دیکھ لیا تو یہ ایسی غلطی ہے جسے مٹانا واجب ہوتا ہے اور اس میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ اور بخاری اور نسائی میں حضرت عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب میری قوم حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس سے واپس لوٹ کر آئی تو انہوں نے بتایا آپ ﷺ نے فرمایا ہے: لیؤمکم اکثرکم قرأۃ للقرآن (3) (چاہیے کہ تم میں سے زیادہ قرآن کریم پڑھنے والا تمہاری امامت کرائے) اس نے بیان کیا: پس انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے رکوع و سجود کے بارے سکھایا۔ پس میں انہیں نماز پڑھاتا تھا اور مجھ پر پھٹی ہوئی چادر ہوتی تھی۔ اور وہ میرے باپ کو کہتے تھے: کیا تو اپنے بیٹے کی دبر ہم سے ڈھانپ نہیں سکتا۔ یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ اور حضرت سہل بن سعد سے ثابت ہے کہ انہوں نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چادریں تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی گردنوں میں باندھے ہوتے تھے جیسے بچے کرتے ہیں۔ تو کسی کہنے والے نے کہا: اے عورتوں کے گروہ! تم اپنے سر (سجدوں سے) نہ اٹھاؤ یہاں تک کہ مرد (پہلے) اٹھالیں (4)۔ اسے بخاری، نسائی اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب کوئی اپنی شرمگاہ کو دیکھے تو اس کے بارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 154
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 780
3۔ سنن نسائی، کتاب القبلۃ، جلد 1، صفحہ 125
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 92

نے کہا: ہے جب کپڑا تنگ ہو تو وہ اسے بٹن لگا لے یا اسے کسی شے کے ساتھ سی لے تاکہ قمیص دور نہ ہٹے کہ گریبان سے شرمگاہ دکھائی دے، اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی شرمگاہ دیکھ لی وہ اپنی نماز کا اعادہ کرلے۔ اور یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام مالک نے حالت نماز میں قمیص کے بٹنوں کو کھلا رکھنے کی رخصت دی ہے اور وہ شلوار (پائجامہ) پہنے ہوئے ہو۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ اور ابوثور رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی قول ہے۔ اور حضرت سالم کھلے بٹنوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اور داؤد الطائی نے کہا ہے: جب ڈاڑھی بڑی ہو تو اس کے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اسی معنی کو اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ پس اگر وہ امام ہو تو وہ نماز نہیں پڑھائے گا مگر اپنی چادر اوڑھ کر، کیونکہ یہ زینت میں سے ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: زینت میں سے نماز جوتوں میں پڑھنا بھی ہے۔ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نماز کی زینت رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ہے۔ ابوعمر نے کہا ہے: ہر شے کے لیے زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت تکبیر اور رفع یدین ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ تم پر وسعت فرمائے تو بھی اپنے آپ کو وسعت دو (1)، آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے جمع کرے، نماز پڑھے ازار (تہبند) اور ردا (اوپر چڑھنے والی چادر) میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قبا (میں) شلوار اور ردا میں، شلوار اور قمیص میں، شلوار اور قبا میں۔ اور میں تو گمان کرتا ہوں کہ انہوں نے فرمایا: تبان (اتنا قلیل کپڑا جس سے صرف شرمگاہ ڈھانپی جاسکے) اور قمیص میں، تبان اور ردا میں، اور تبان اور قبا میں۔ بخاری اور دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہر اس شی کا کھانا پینا حلال قرار دیا ہے جب تک وہ فضول خرچی یا تکبر و نخوت ہو (2)۔ اور رہی وہ شی جس کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے وہ ہے جو بھوک کا ازالہ کردے، پیاس میں سکون عطا کردے، پس اسے عقلاً اور شرعاً کھانا مستحب ہے، کیونکہ اس میں جان کی حفاظت اور حواس کی نگہداشت ہے، اسی لیے شریعت نے صوم وصال سے منع کیا ہے، کیونکہ وہ جسم کو کمزور کردیتا ہے اور نفس کو ماردیتا ہے اور عبادت سے کمزور کردیتا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اس سے منع کرتی ہے اور عقل اس کا دفاع کرتی ہے، اور جس نے حاجت اور ضرورت کی مقدار سے بھی اپنے آپ کو روک کر رکھا تو اس کے لیے نہ کوئی نیکی میں سے حصہ اور نہ ہی زہد میں ہے، کیونکہ عجز اور ضعف کے سبب وہ طاعت و عبادت کے جس عمل سے محروم ہوا ہے وہ اجر و ثواب کے اعتبار سے زیادہ اور عظیم ہے۔ اور حاجت و ضرورت کی مقدار سے زائد کے بارے میں دو مختلف قول ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حرام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مکروہ ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی صحیح ہے (3)، کیونکہ سیر ہونے کی مقدار شہروں اور زمانوں کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح دانت اور اشتہاء طعام بھی اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ کم کھانے میں کثیر فوائد ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں کہ آدمی جسم کے اعتبار سے صحت مند ہوتا ہے، قوت حفظ کے اعتبار سے عمدہ و اعلیٰ اور فہم کے اعتبار سے انتہائی ذکی اور ذہین ہوتا ہے، نیند کم ہوتی ہے اور جان ہلکی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 53 2۔ تفسیر ابن عباس، جلد 1، صفحہ 420 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 781

پھلکی رہتی ہے اور زیادہ کھانے میں معدہ بوجھل اور بدہضمی کی بو ہوتی ہے اور اسی سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی نسبت زیادہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کم کھانے کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: آکبر الدواء تقدیر الغذاء (سب سے بڑھ کر دوا غذا کی ایک مقدار مقرر کرنا ہے)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کو انتہائی شافی بیان کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور وہ اطباء کے کلام سے مستغنی کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما ملأ آدمیٌ وعاءً شرا من بطن بحسب ابن آدم لقیمات یقِمنَ صُلبَه فإن کان لا محالة فثلثٌ لطعامه وثلثٌ لشرابه وثلث لنفسه (1) (انسان ہونے کے اعتبار سے آدمی پیٹ کے برتن کو جس شی سے بھر سکتا ہے وہ چند لقمے ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھتے ہیں اور اگر ضروری بھی ہو تو پھر ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی مشروبات کے لیے اور ایک تہائی اس کے سانس کے لیے ہو)

ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے اسے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر بقراط یہ تقسیم سن لیتا تو بالیقین اسے اس حکمت پر تعجب ہوتا۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ رشید کے پاس ایک عیسائی ماہر حکیم تھا تو اس نے حضرت علی ابن الحسین رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہاری کتاب میں علم طب کی کوئی شی نہیں ہے اور علم دو طرح کا ہے: ایک علم الادیان اور ایک علم الابدان۔ تو حضرت علی نے اسے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ساری طب کو ہماری کتاب کی نصف آیت میں جمع کر دیا ہے۔ تو اس نے پوچھا: وہ کون سی ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا۔ پھر نصرانی نے کہا: تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے علم طب کی کوئی شی مروی نہیں ہے۔ تو حضرت علی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑے الفاظ میں ساری طب کو جمع کر دیا ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المعدة بیت الأدواء والحِمْیَة رأسُ کلّ دواء وأعط کل جسد ما عوّدته (معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز دوا کی اصل ہے اور تو ہر جسم کو وہ دے جس کا تو نے اسے عادی بنایا ہے) تو وہ نصرانی بولا: ما ترك کتابکم ولا نبیکم لجالینوس طباً (2) (تمہاری کتاب اور تمہارے نبی علیہ السلام نے جالینوس کی طب کی کوئی شے چھوڑی ہی نہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہا جاتا ہے بے شک مریض کا علاج دو حصوں میں منقسم ہے: نصف دوا ہے اور نصف پرہیز ہے۔ پس اگر یہ دونوں جمع ہوں تو مریض تندرست اور صحت یاب ہو جائے گا، ورنہ اس میں پرہیز اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ پرہیز ترک کرنے کے ساتھ دوا فائدہ نہیں دیتی، حالانکہ پرہیز دوا چھوڑ دینے کے باوجود فائدہ دیتی ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أصل کل دواء الحِمیة (ہر دوا کی اصل پرہیز ہے) اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے کہ پرہیز ہر دوا سے غنی کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم

اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہند کا بڑا علاج پرہیز ہے، مریض کھانے، پینے، کلام سے چند دن تک پرہیز کرتا ہے تو وہ تندرست اور صحت یاب ہو جاتا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60
2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 100

مسئلہ نمبر 5۔ مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے'' (1)۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دنیا میں سے انتہائی قلیل حاصل کرنے اور اس میں انتہائی زہد و قناعت اختیار کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور عرب کم کھانے کے سبب مدح و تعریف کرتے ہیں اور زیادہ کھانے کے سبب مذمت کرتے ہیں، جیسا کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

تكفيه فِلْذَة كِبْد إن أَلَمّ بها　　من الشِّواء ويُروي شُرْبَهُ الغُمَرُ

اسے جگر کا ایک ٹکڑا کافی ہوتا ہے اگر وہ روست شدہ میں سے اس پر اصرار کرے اور ایک چھوٹا سا پیالہ اس کی پیاس کو بجھا دیتا ہے۔

اور ام زرع نے ابن ابی زرع کے بارے کہا ہے: بھیڑ کے چار ماہ کے بچے کے بازو اسے سیر کرتے ہیں، اور حاتم طائی نے زیادہ کھانے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے:

فإنك إن أعطيتَ بطنك سؤْلَه　　وفرجَك نالا مُنتهى الذَّم أجمعا

اگر تو پیٹ اور فرج کو اس کی خواہش کے مطابق دیتا رہے گا تو وہ دونوں مذمت کی انتہا کو پالیں گے۔

اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المؤمن يأكل في معى واحد (2) کا معنی یہ ہے کہ پیٹ بھرنے سے کم کھاتا ہے اور وہ اپنے نفس پر دوسرے کو ترجیح دیتا ہے اور وہ اپنے کھانے میں دوسرے کے لیے باقی رکھتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کھالے اسی پر وہ قناعت کر لیتا ہے۔ پہلی تاویل اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد: والكافر يأكل في سبعة أمعاء (3) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ کبھی مومن کی نسبت کافر کم کھانے والا پایا جاتا ہے اور کبھی کافر اسلام قبول کرتا ہے لیکن اس کا کھانا کم و بیش نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ ایک معین (فرد) کی طرف ہے۔ ایک کافر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مہمان ٹھہرا، کہا جاتا ہے کہ وہ جہجاہ غفاری تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثمامہ بن اثال تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نضلہ بن عمرو غفاری تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ بصرہ بن ابی بصرہ غفاری تھا۔ اس نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا، پھر صبح کے وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اس نے ایک بکری کا دودھ پیا اور اسے بھی مکمل طور پر نہ پی سکا۔ تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا (4) گویا کہ آپ نے اس طرح فرمایا: هذا الكافر (یہ کافر) واللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل جب نور توحید کے ساتھ منور ہو جاتا ہے تو وہ طاعت و عبادت کے لیے تقویٰ کی آنکھ سے کھانے کی طرف دیکھتا ہے اور اس سے بقدر حاجت لے لیتا ہے اور جب وہ کفر کے ساتھ تاریک تھا اس کا کھانا ایسا تھا جیسے چوپایہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، جلد 2، صفحہ 186　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، باب ماجاء ان المومن یاکل فی معی واحد، حدیث نمبر 1741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چرتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پتلا پاخانہ کر دیتا ہے۔

اور ان آنتوں میں اختلاف ہے، کیا یہ حقیقی مراد ہیں یا نہیں؟ تو کہا گیا ہے کہ مراد حقیقی انتڑیاں ہیں اور طب وتشریح کے علماء کے نزدیک ان کے معروف نام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان سات اسباب میں سے کنایہ ہیں جن کے ساتھ پیٹو کھاتا ہے: وہ حاجت اور ضرورت کے لیے، کوئی خبر سننے کے لیے، چکھنے کے لیے، سونگھنے کے لیے، دیکھنے کے لیے، مس کرنے کے لیے کھاتا ہے اور فوائد ومنافع میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ اس کے کھانے کی مثل کھاتا ہے جس کی سات انتڑیاں ہوں۔ اور مومن اپنے کم کھانے کے سبب اس کی مثل کھانا کھاتا ہے جس کی صرف ایک آنت ہوتی ہے، پس وہ کافر کے ساتھ اس کے کھانے کے اجزاء میں ایک جز کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور کافر اس پر سات گناہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور معی کا لفظ اس حدیث میں معدہ کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب یہ پختہ ہوگیا تو پھر جان لے کہ آدمی کے لیے کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھوں کو دھونا مستحب ہے، کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: الوضوء قبل الطعام و بعدہ برکۃ(1) (کھانے سے پہلے اور بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) باعث برکت ہے) اور اسی طرح تورات میں ہے۔ اسے زاذان نے سلمان سے روایت کیا ہے۔ اور امام مالک پاک صاف ہاتھوں کو دھونا مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن حدیث طیبہ کی اقتدا و پیروی کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور کوئی (آدمی) کھانا نہ کھائے یہاں تک کہ یہ جان لے کہ آیا وہ گرم ہے یا ٹھنڈا؟ کیونکہ اگر وہ گرم ہوگا تو اسے تکلیف اور اذیت ہوگی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ابردوا بالطعام فان الحار غیر ذی برکۃ(2) (کھانے کو ٹھنڈا کرلو کیونکہ گرم کھانا برکت والا نہیں ہوتا) یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکی ہے۔ اور کھانے کو سونگھے نہیں کیونکہ یہ چوپاؤں کا عمل ہے، بلکہ اگر اسے پسند ہو تو اسے کھالے اور اگر پسند نہ ہو تو اسے چھوڑ دے۔ اور لقمہ چھوٹا بنائے اور اسے زیادہ دیر تک چبائے تاکہ پیٹو اور حریص شمار نہ ہو۔ اور شروع میں بسم اللہ شریف پڑھے اور آخر میں الحمد کہے۔ اور یہ مناسب نہیں کہ وہ الحمد للہ کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک تمام ساتھی کھانے سے فارغ ہو جائیں، کیونکہ آواز بلند کرنے میں انہیں کھانے سے روکنے کی طرف اشارہ ہے۔ کھانے کے آداب بہت زیادہ ہیں، یہ تمام انہیں میں سے ہیں۔ اور ان میں سے بعض سورۂ ہود میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور پینے کے بھی معروف آداب ہیں۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا اکل احدکم فلیاکل بیمینہ واذا شرب فلیشرب بیمینہ فان الشیطان یاکل بشمالہ ویشرب بشمالہ(3) (جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے اور جب کوئی مشروب پیے تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے پینا چاہیے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، جلد 2، صفحہ 172
2۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 249، حدیث نمبر 40802
3۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 172

سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے)

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی کھانے کی کثرت میں (تم فضول خرچی نہ کرو) اور اس میں سے کثرت شرب بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ (زیادہ کھانا یا پینا) معدے کو بوجھل کر دیتا ہے اور یہ آدمی کو اپنے مالک کی خدمت سے روک لیتا ہے اور خیر اور نیکی کے اضافی کاموں میں حصہ لینے سے روک دیتا ہے۔ اور اگر اس نے اس حد سے انتہائی تجاوز کر لیا کہ فرض قیام سے اس نے روک دیا تو یہ اس پر حرام ہو جائے گا، حالانکہ اس نے اپنے کھانے اور پینے میں اسراف اور زیادتی کی ہے۔ اسد بن موسیٰ نے عون بن ابی جحیفہ عن أبیہ کی حدیث روایت کی ہے اس نے بیان کیا: میں نے موٹے گوشت کے ساتھ ثرید بنا کر کھایا، پھر میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میں (معدہ بھر جانے کے سبب) ڈکار لے رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''ابا جحیفہ! اپنے ڈکار روک لے، کیونکہ دنیا میں اکثر لوگ پیٹ بھرے ہوتے ہیں قیامت کے دن ان کی بھوک طویل ہو جائے گی'' (1)۔ پس اس کے بعد ابو جحیفہ نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا یہاں تک کہ دنیا سے وصال فرما گئے، وہ جب صبح کا کھانا کھا لیتے تھے تو شام کا نہ کھاتے تھے اور جب کبھی شام کا کھاتے تو پھر صبح کا کھانا نہ کھاتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المؤمن یأكل فی معی واحد (2) کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ایمان تام، کیونکہ آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے ایمان کا کمال یہ ہے کہ ابو جحیفہ کی طرح ایسے امور میں فکر کرتا ہے جو اسے موت اور اس کے بعد پیش آئیں گے اور ان احوال میں سے خوف اور ڈر سے اپنی شہوت کو پورا کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

اور ابن زید نے کہا ہے: وَلَا تُسْرِفُوْا کا معنی ہے: تم حرام نہ کھاؤ (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ السرف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) کہ تو ہر وہ شی کھائے جس کی تجھ میں طلب اور چاہت پیدا ہو (4)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اسراف سے ماخوذ ہے (اس کا معنی ہے) پیٹ بھرنے کے بعد مزید کھانا۔ اور یہ سب ممنوع ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا: اے بیٹے! (ایک بار) پیٹ بھرنے کے اوپر مزید پیٹ بھر کر نہ کھا، کیونکہ تیرا اسے کتے کے لیے ڈال دینا اس میں سے بہتر ہے کہ تو اسے کھائے۔ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا: اس نے کیا کیا؟ انہوں نے بتایا: اسے گزشتہ رات بدہضمی ہو گئی۔ آپ نے کہا: اسے بدہضمی ہوئی؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ اگر وہ مر جاتا تو میں اس پر نماز نہ پڑھتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے ایام حج میں چکنائی نہ [illegible]تے تھے اور کھانے کی قلیل مقدار پر اکتفا کرتے تھے اور ننگے بدن طواف کرتے تھے۔ تو ان کو فرمایا گیا: خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا یعنی تم اس شے کو حرام کرنے میں زیادتی اور اسراف نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام نہیں کیا۔

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 217، حدیث نمبر 6220
2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، جلد 2، صفحہ 186
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 218
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، جلد 1، صفحہ 248

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

"آپ فرمایئے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے، آپ فرمایئے: یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی (اور) صرف انہیں کے لیے ہیں قیامت کے روز، یونہی ہم مفصل بیان کرتے ہیں آیتوں کو ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) جانتے ہیں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنی طرف سے ایسی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام نہیں کیا۔ یہاں زینت کا لفظ خوبصورت اور حسین لباس کے لیے ہے، جب اسے پہننے والا اس پر قادر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد تمام کپڑے ہیں، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: إذا وسع الله عليكم فأوسعوا (1) (جب اللہ تعالیٰ تمہیں وسعت اور خوشحالی عطا فرمائے تو تم بھی اپنے نفسوں کو راحت اور وسعت عطا کرو) یہ قول پہلے بھی گزر چکا ہے۔

حضرت علی بن حسین ابن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ ان کے بارے روایت ہے کہ وہ ریشم اور ان سے بنا ہوا کپڑا پچاس دینار کے عوض خرید کر موسم سرما میں وہ لباس پہنتے تھے اور جب گرمیوں کا موسم آتا تو اسے صدقہ کر دیتے یا اسے بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دیتے اور موسم گرما میں وہ مصری کپڑوں میں سے سرخ مٹی سے رنگے ہوئے دو کپڑے پہنتے تھے اور یہ کہتے تھے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو یہ آیت قیمتی اور عمدہ لباس پہننے اور جمعہ اور عید کے دنوں میں لباس کے ساتھ حسن و جمال کا اظہار کرنے پر دلیل ہے، (اسی طرح) لوگوں سے ملاقات کرنے کے وقت اور بھائیوں کی زیارت و ملاقات کے وقت حسین لباس پہننے پر بھی دلیل ہے۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں تو وہ حسن و جمال کا اہتمام کریں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے (2) کہ انہوں نے ایک ریشمی حلہ دیکھا جو مسجد کے دروازے کے پاس بیچا جا رہا تھا، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اسے جمعہ کے دن پہننے کے لیے اور وفود سے ملاقات کے وقت پہننے کے لیے خرید لیں جب وہ (وفود) آپ سے ملاقات کے لیے آتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما يلبس هذا من لاخلاق له في الآخرة (3) (اسے وہ پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو) تو اس میں آپ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 52
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 189
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 122

نے تجمل وخوبصورتی کے سبب اس کا انکار نہیں کیا، بلکہ اس کے ریشمی ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کیا، حالانکہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درہم کے عوض ایک حلہ خریدا آپ اس میں نماز پڑھتے تھے۔

اور حضرت مالک بن دینار عدن کا بنا ہوا عمدہ کپڑا پہنتے تھے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا کپڑا تقریباً ایک دینار کے عوض خریدا جاتا تھا۔ یہ کہاں ان میں سے ہیں جن سے اعراض کیا جاتا ہے اور آپ کھدر کے لباس کو السی اور اون کے کپڑوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اور فرماتے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ غور کرو! جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کیا آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تقویٰ کا لباس ترک کر دیا؟ نہیں۔ قسم بخدا! بلکہ وہ تو اہل تقویٰ ہیں اور صاحب عقل وعرفان ہیں اور ان کے سوا صرف اہل دعویٰ ہیں، ان کے دل تقویٰ سے خالی نہیں۔ خالد بن شوذب نے کہا ہے: میں حسن کے پاس حاضر تھا اور ان کے پاس فرقد آیا اور حسن نے اسے اس کے کپڑوں سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور فرمایا: اے فریقد، اے ام فریقد کے بیٹے! بے شک نیکی اس لباس میں نہیں ہے، بلکہ نیکی وہ ہے جو سینے میں راسخ ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ اور میرے بھتیجے ابو محمد معروف بالکرخی ابوالحسن بن یسار کے پاس تشریف لے گئے اور وہ اون کا جبہ پہنے ہوئے تھے، تو ابوالحسن نے انہیں کہا: اے ابا محمد! تو نے اپنے دل کو صوفی بنایا ہے یا اپنے جسم کو؟ اپنے دل کو صوفی بنا اور اپنے بدن کو قہستانی کپڑا پہنا۔ ایک آدمی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا: آپ کے اصحاب (ساتھیوں) کی ایک جماعت آئی ہے اور وہ جامع میں ہیں، پس آپ چلے اور آپ نے ان پر پیوند لگے ہوئے کپڑے اور پٹیاں (چھوٹے چھوٹے رومال) دیکھیں تو آپ یہ کہنے لگے:

أما الخيام فإنها كخيامهم   وأرى نساء الحي غير نسائه

''جہاں تک خیموں کا تعلق ہے تو یہ ان کے خیموں کی طرح ہیں اور میں محلے کی عورتوں کو اجنبی عورتیں دیکھ رہا ہوں''۔

ابوالفرج ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں چار وجہ سے پٹیاں اور پیوند لگے کپڑے پہننا ناپسند کرتا ہوں: ایک تو اس لیے کہ یہ اسلاف کا لباس نہیں ہے، بلاشبہ وہ اہم ضرورت کے وقت پیوند لگاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لباس فقر وافلاس کے دعویٰ کو متضمن ہوتا ہے، حالانکہ آدمی کو حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اثر کو ظاہر کرے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں زہد کا اظہار ہے، حالانکہ ہمیں اسے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے یہ ان لوگوں کے ساتھ مشابہت ہے جو شریعت سے دور ہٹنے والے ہیں۔ اور جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے وہ انہیں میں سے ہوتا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس نے خطا اور غلطی کی ہے جس نے بالوں اور اون کے لباس کو روئی اور کتان کے لباس پر ترجیح دی ہے، بشرطیکہ وہ اس کا لباس پہننے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور جس نے سبزی اور دال کھائی اور اسے گندم کی روٹی کی نسبت زیادہ پسند کیا۔ اور جس نے اس خوف سے گوشت کھانا چھوڑ دیا کہ اس سے اس میں عورتوں کی خواہش اور طلب پیدا ہوگی۔ حضرت بشر بن حارث سے اونی لباس کے بارے پوچھا گیا، تو ان پر یہ شاق گزرا اور ان کے چہرے میں کراہیت اور ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر فرمایا: شہروں میں میرے نزدیک خز (ریشم) اور معصفر پہننا اون پہننے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اور ابوالفرج نے کہا ہے: اسلاف متوسط لباس پہنتے تھے، نہ زیادہ اعلیٰ اور نہ زیادہ گھٹیا اور وہ جمعہ، عید اور بھائیوں سے

ملاقات کے لیے عمدہ اور خوبصورت لباس پسند کرتے تھے اور ان کے نزدیک عمدہ لباس پسند کرنا، قبیح نہیں تھا۔ اور رہا وہ لباس جو اپنے پہننے والے کے لیے عیب ہوتا ہے، چونکہ وہ اظہار زہد اور اظہار فقر کو متضمن ہوتا ہے، تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کی زبان ہے اور یہ پہننے والے کی حقارت اور ذلت کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہ سب مکروہ ہے اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور کوئی کہنے والا کہے: لباس کا عمدہ اور ارفع ہونا تو نفس کی خواہش ہے، حالانکہ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس میں (اعلیٰ اور قیمتی لباس میں) مخلوق کے لیے تزیین و آرائش ہے، حالانکہ ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہمارے افعال اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لیے ہوں نہ کہ مخلوق کے لیے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ ہر شی (یا عمل) جس کی خواہش نفس کرتا ہے وہ قابل مذمت نہیں ہوتی، لہٰذا لوگوں کے لیے جو بھی زیب و زینت کی جائے گی وہ مکروہ نہ ہوگی، البتہ اس سے ضرور روکا جائے گا جب شریعت نے اس سے منع کیا ہو یا دین کے معاملے میں ریا کی وجہ سے (اس سے منع کیا جائے گا) کیونکہ انسان کے لیے واجب ہے کہ وہ خوبصورت دکھائی دے۔ یہ نفس کا وہ حصہ ہے جو قابل ملامت نہیں، اسی وجہ سے وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور شیشے میں دیکھتا اور اپنی دستار کو درست کرتا ہے اور وہ ایسا لباس پہنتا ہے جس کا کپڑا اندر کی جانب سے کھردرا ہوتا ہے اور باہر کی جانب سے اس کا ظاہر انتہائی حسین اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو مکروہ ہو اور نہ ہی اس کی مذمت کی جاسکتی ہے۔

حضرت مکحول نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا ایک گروہ دروازے پر آپ کا انتظار کر رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ارادہ سے باہر تشریف لائے اور گھر میں ایک برتن تھا جس میں پانی تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں دیکھنے لگے اور اپنی ریش مبارک اور اپنے بال سیدھے اور درست فرمانے لگے۔ تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی یہ کر رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم إذا خرج الرجلُ إلى أخوانه فليهئ من نفسه فإنّ الله جميل يحب الجمال (ہاں جب آدمی اپنے بھائیوں کے پاس جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو تیار کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر(1) (جنت میں وہ داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا) تو ایک آدمی نے عرض کی: بے شک آدمی تو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا حسین ہو اور اس کے جوتے حسین ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ الله جميل يحب الجمال الكِبْرُ بطرُ الحق وغمطُ الناس (2) (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال (خوبصورتی) کو پسند کرتا ہے اور تکبر حق کو قبول کرنے سے انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے) اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، وہ تمام کی تمام نظافت اور حسن ہیئت پر دلالت کرتی ہے۔

محمد بن سعد نے بیان کیا ہے کہ فضل بن دکین نے ہمیں خبر دی، انہوں نے کہا ہمیں مندل نے ثور کے واسطہ سے خالد بن معدان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوران سفر کنگھی، شیشہ، تیل، مسواک اور سرمہ اپنے ساتھ رکھتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 65 2۔ ایضاً

تھے۔ اور ابن جریج سے مروی ہے: کنگھی ہاتھی دانت کی تھی اس کے ساتھ آپ کنگھی کرتے تھے۔ ابن سعد نے کہا ہے: ہمیں قبیصہ بن عقبہ نے بتایا ہے انہوں نے بیان کیا سفیان نے ربیع بن صبیح عن یزید رقاشی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے سر مبارک کو تیل لگاتے تھے اور اپنی ریش مبارک کو پانی کے ساتھ کنگھی کرتے تھے۔

یزید ابن ہارون نے ہمیں خبر دی ہے کہ عباد بن منصور نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرمہ دانی تھی جس سے آپ سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ ڈالتے تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، طیبات کا اسم ہر اس شی کے لیے عام ہے جو کمائی اور کھانے کے اعتبار سے پاکیزہ اور طیب ہو۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم (1) نے بیان کیا ہے: مراد رزق میں سے وہ پاکیزہ اور حلال چیزیں ہیں جنہیں اہل جاہلیت نے حرام قرار دیا مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ (یہ سبھی جانور ہیں جنہیں انہوں نے اپنے لیے حرام کر رکھا تھا)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ سے مراد ہر لذیذ کھانا ہے، تحقیق طیبات کو ترک کرنے اور لذات سے اعراض برتنے میں اختلاف ہے، پس ایک قوم نے کہا ہے: اس کا تعلق قربات سے نہیں ہے اور مباحات میں عمل کرنا اور نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں فی ذاتہ کوئی قربت نہیں ہے، بلکہ یہ تو دنیا میں زہد اختیار کرنے، دنیا میں اپنی طویل امید کو کم کرنے اور اس کی وجہ سے تکلف ترک کرنے کا ایک ذریعہ اور راستہ ہے۔ اور یہ اس کے لیے مستحب امر ہے اور مستحب سبب قربت ہے۔ اور ایک اور فریق نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے: اگر ہم چاہتے تو ہم صلاء، صلائق اور صناب بناتے لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کو کئی اقوام کی مذمت کرتے ہوئے سنا ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں) اور صرائق را کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور صلائق اور صرائق دونوں کا معنی روٹی ہے۔ اور صلائق (لام کے ساتھ) سے مراد وہ ہے جو گوشت اور سبزی کے ساتھ لگائی جائے۔ اور صلاء (صاد کے کسرہ اور مد کے ساتھ) سے مراد بھنا ہوا گوشت ہے۔ اور صناب سے مراد رائی اور کشمش سے بنائی ہوئی چٹنی ہے۔ اور دوسروں نے ان تمام کی موجودگی میں کلفت اور غیر کلفت کے ساتھ فرق کیا ہے۔ ابو الحسن علی بن مفضل جو ہمارے اشیاخ کے شیخ ہیں انہوں نے فرمایا ہے: یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ

کیونکہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو محض اس کے عمدہ اور طیب ہونے کی وجہ سے اسے کھانے سے منع فرمایا ہو، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلوہ، شہد، تربوز اور پکی کھجوریں تناول فرماتے تھے، البتہ ان کے لیے تکلف کرنا اس لیے مکروہ ہے کہ ان میں شہوات دنیا کے سبب امور آخرت سے غافل ہونا لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

میں (مفسر کہتا ہوں: بعض صوفیاء نے لذیذ کھانے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 194

طرح ہے تو پھر فواحش میں سے ظاہر زنا ہے۔ واللہ اعلم

وَالْاِثْمَ حسن نے کہا ہے: اس سے مراد خمر (شراب) ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

شربتُ الإثم حتى ضلّ عقلی　　كذاك الإثمُ تذهبُ العقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل جاتی رہی اسی طرح گناہ عقلوں کو ختم کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

نشرب الإثم بالصُّوَاع جِهارًا　　وترى المسك بيننا مُستعارا (1)

اس میں بھی اثم کا لفظ شراب کے معنی میں مذکور ہے۔

وَالْبَغْیَ اس کا معنی ظلم کرنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

اور ثعلب نے کہا ہے: البغی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی کے بارے میں کچھ دعویٰ کرتا ہے اور اس بارے میں گفتگو کرتا ہے اور وہ بغیر حق کے اس سے مطالبہ کرتا ہے، مگر یہ کہ وہ حق کے ساتھ اس پر غالب آ جائے۔ (یعنی اگر دوسرا حق کے ساتھ اس پر غالب نہ آئے تو یہ اس سے ناحق چیز لے لیتا ہے) اور اثم اور بغی کو فواحش سے الگ ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں بھی فواحش میں سے ہیں، تو یہ فحش میں ان کے انتہائی برا ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ پس ان دونوں کے امر کی تاکید کے لیے اور ان کے بارے زجر و توبیخ کا قصد کرتے ہوئے ان کے ذکر پر نص بیان فرمائی۔ اور اسی طرح وَ اَنْ تُشْرِكُوْا اور وَ اَنْ تَقُوْلُوْا ہیں۔ یہ دونوں ماقبل پر معطوف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہیں۔ اور ایک جماعت نے اثم بمعنی خمر ہونے کا انکار کیا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اثم سے مراد وہ گناہ ہے جو حد اور لوگوں پر لمبا ہونے (انتہائی شاق ہونے) سے کم ہو۔ نحاس نے کہا ہے: رہا یہ کہ اثم بمعنی خمر ہو تو یہ معروف نہیں۔ اور اثم کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ تمام گناہ اثم کہلاتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا ہے:

إنى وجدتُ الأمرَ أرشَدُهُ　　تقوى الإلهِ وشرُّهُ الإثمُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عربی نے بھی اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: "شعر میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے"۔ کیونکہ اگر وہ کہتا: شربتُ الذنب یا شربتُ الوزر لکان کذالک (میں نے گناہ کیا یا میں نے بوجھ (گناہ کا) اٹھایا تو اس طرح ہوا) اس قوت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ذنب اور وزر دونوں شراب کے اسماء میں سے ہیں، اسی طرح لفظ اثم بھی ہے۔ اور جس نے اس قسم کی مثالوں کے ساتھ گفتگو اور تکلم کو ثابت کیا ہے جو لغت اور معانی میں طریقہ استدلال سے جہالت اور ناواقفی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے اسے حسن سے ذکر کیا ہے اور جوہری نے صحاح میں کہا ہے: کبھی خمر کو اثم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

شربتُ الإثم.........البيت (2)

اور ہروی نے اپنی غریب میں کہا ہے کہ خمر اثم (گناہ) ہے پس یہ بعید نہیں ہے کہ اثم کا لغوی اطلاق تمام گناہوں پر ہوتا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 146　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 220

ہے اور خمر پر بھی اور اس میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اور بغی کا معنی ظلم میں تجاوز کرنا (اور حد سے بڑھنا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فساد ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، سو جب آجائے ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ یعنی ہر امت کے لیے ایک وقت ہے جو مقرر کر دیا گیا ہے۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ یعنی جب ان کا وہ وقت آجائے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم اور معین ہے۔

ابن سیرین نے صیغہ جمع کے ساتھ جآء اٰجالہم پڑھا ہے۔ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ تو نہ وہ اس سے ایک لحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ ایک لحہ سے کم، مگر یہ خاص طور پر ساعت کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اوقات کے اسماء میں سے اُقل اور کم یہی ہے اور یہ ظرف زمان ہے۔

وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں) تو یہ اس پر دلیل ہے کہ مقتول اپنا مقررہ وقت آنے پر ہی قتل کیا جاتا ہے۔ اور أجل الموت سے مراد موت کا مقررہ وقت ہے، جیسے اجل الدین قرض کی ادائیگی کا مقررہ وقت ہے۔ اور ہر وہ شی جس کے ساتھ کسی شی کو موقت کر دیا جائے تو وہی اس کے لیے اُجل ہوتی ہے۔ اور انسان کی اُجل سے مراد وہ خاص وقت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ لامحالہ اس وقت خاص میں زندہ آدمی مرجائے گا۔ اور یہ وہ وقت ہے جس سے اس کی موت کا موخر ہونا جائز نہیں ہوتا، اس حیثیت سے نہیں کہ اس کی تاخیر مقدر نہیں۔ اور بہت سے معتزلہ نے کہا ہے سوائے اس کے جس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی ہے: بے شک مقتول اپنے اس مقرر وقت سے پہلے مرجاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور یہ کہ اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو وہ ابھی زندہ رہتا۔ یہ غلط ہے، کیونکہ مقتول اس وجہ سے نہیں مرا کہ دوسرے نے اسے قتل کیا ہے، بلکہ اس وجہ سے اسے موت آئی ہے) جو فعل اللہ تعالیٰ نے اس کی جان ختم کرنے کے بارے اس وقت کیا جب اسے ضرب لگی۔ پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر وہ اپنے مقررہ وقت پر مرا ہے تو پھر اس کے قاتل کو قتل کیوں کیا جاتا ہے اور اس سے قصاص کیوں لیا جاتا ہے؟ تو جواب یہ دیا جائے گا: ہم اسے اس لیے قتل کرتے ہیں کہ اس نے حد سے تجاوز کیا ہے اور اس نے ایسا تصرف کیا ہے جس میں اسے تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا، اس کا سبب مقتول کی موت اور اس کے جسم سے روح کا نکلنا نہیں، کیونکہ یہ اس (قاتل) کا فعل نہیں۔ اگر وہ لوگوں کو اور اس کی اس تعدی اور زیادتی کو بغیر قصاص کے چھوڑ دے تو بالیقین یہ فساد اور لوگوں کو ہلاکتوں تک پہنچا دے۔ یہ بالکل واضح اور بین ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ اُولٰٓىِٕكَ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اے اولاد آدم! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں سے جو بیان کریں تم پر میری آیتیں تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور غرور کیا ان سے وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یہ شرط ہے۔ ما کے دخول کی وجہ سے نون تاکید داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما صلہ ہے، یعنی أن یأتکم (اگر تمہارے پاس رسول آئیں) اس میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی طرف ان میں سے رسول بھیجے گا تاکہ ان کا قبول کرنا (آسان اور) اقرب ہو۔ اور قصص سے مراد لگاتار اور تسلسل کے ساتھ بات کرنا ہے۔

آیاتی یعنی میرے فرائض اور میرے احکام (وہ تم پر میرے فرائض اور میرے احکام بیان کریں)۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ یہ شرط ہے اور اس کا مابعد اس کا جواب ہے اور پھر یہ پہلی شرط کا جواب ہے، یعنی جس نے اصلاح کر لی اس کی جو میرے اور اس کے درمیان ہے۔ وأصلح منكم ما بيني وبينه۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ اس پر دلیل ہے کہ قیامت کے دن مومنین نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ انہیں غم لاحق ہوگا اور نہ ان پر کوئی رعب اور ڈر طاری ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کے اہوال اور خوف تو انہیں لاحق ہوگا لیکن ان کا انجام امن اور سکون ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ کا جواب وہ ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے، یعنی فاطیعوهم فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ (پس تم ان کی اطاعت کرو اور جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی (1)) پہلا قول زجاج کا ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ

الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْۤا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ

دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو انہیں مل جائے گا ان کا حصہ جو ان کی قسمت میں لکھا ہے، یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے جو قبض کریں گے ان کی روحوں کو تو (ان سے) کہیں گے: کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا؟ کہیں گے: وہ گم ہو گئے ہم سے اور گواہی دیں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے''۔

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 102

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے سے اور اس کی آیات کو جھٹلانے سے زیادہ بڑا اور شنیع ظلم کون سا ہے۔ پھر فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ یعنی رزق، عمر اور عمل میں سے جو ان کے لیے لکھا جا چکا ہے وہ انہیں مل جائے گا۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ اور ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شقاوت و سعادت میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ حصہ انہیں مل جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خیر اور شر میں سے جو ان کی قسمت میں لکھا ہے (وہ انہیں مل جائے گا) حسن اور ابو صالح نے کہا ہے: ان کے کفر کی مقدار کے برابر عذاب انہیں مل جائے گا۔ اور علامہ طبری کی پسند یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: ما كُتِبَ لهم، اى ما قُدِّرَ لهم من خيرٍ و شرٍ و رزقٍ و عملٍ و أجلٍ (1) (جو ان کے لیے لکھا گیا ہے یعنی خیر اور شر، رزق، عمل اور اجل (عمر) میں سے جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سب انہیں مل جائے گا)، جیسا کہ ابن زید، حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال میں سے پہلے گزر چکے ہیں۔ فرمایا: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس کے پیچھے یہ ارشاد گرامی ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ یعنی یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے موت کے فرشتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد قرآن کریم ہے، کیونکہ کفار کا عذاب اس میں مذکور ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے۔ حسن بن علی حلوانی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے علی بن مدینی نے لکھوایا ہے اور کہا ہے، میں نے عبدالرحمن بن مہدی سے قدر کے بارے پوچھا، تو انہوں نے مجھے کہا: ہر شئی تقدیر کے مطابق ہے، طاعت و معصیت بھی تقدیر کے ساتھ ہیں اور سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی یہ کہے: بے شک گناہ تقدیر کے ساتھ نہیں ہیں۔ علی نے بیان کیا اور عبدالرحمن بن مہدی نے مجھے کہا: علم، قدر اور کتاب بھی ہم معنی اور برابر ہیں۔ اور جب میں نے عبدالرحمن بن مہدی کا کلام یحییٰ بن سعید پر پیش کیا تو انہوں نے کہا: اس کے بعد قلیل و کثیر کوئی شئی باقی نہیں رہی۔

اور یحییٰ بن معین نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں مروان فزاری نے بیان کیا کہ ہمیں اسماعیل بن سمیع نے بکیر الطویل سے، انہوں نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (2) سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ کے بارے کہا کہ یہ وہ قوم ہے جو ایسے اعمال کریں گے جو اعمال کرنا ان کے لیے لازم اور ضروری ہیں۔

اور حتی غایت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ان کے بارے ابتدائے خبر کے لیے ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: حتی، إمّا اور إلّا ان میں امالہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ حروف ہیں اور ان کے درمیان اور اسماء کے درمیان واضح فرق ہے، جیسے حبلی اور سکری۔ زجاج نے کہا ہے: حتیٰ کو یا کے ساتھ لکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ سکری کے مشابہ ہے اور اگر الّا کو یا کے ساتھ لکھا جائے تو یہ الی کے مشابہ ہو جائے گا۔ اور اما کو یا کے ساتھ نہیں لکھا گیا، کیونکہ یہ ان ہے اس کے ساتھ ما ملایا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ سوال زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور تَدْعُوْنَ کا معنی تعبدون ہے (تو کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے تھے) قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا کہیں گے: وہ ہم سے گم ہو گئے یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 203　2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 201

وہ باطل ہیں اور وہ چلے گئے ہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ (سب) آخرت میں ہوگا۔

وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ یعنی وہ اپنے بارے میں کفر کا اقرار کرلیں گے۔

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: داخل ہو جاؤ ان امتوں میں سے جو گزر چکی ہیں تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے (ان کے پاس) دوزخ میں (داخل ہو جاؤ) جب بھی داخل ہوگی کوئی امت تو وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر یہاں تک کہ جب جمع ہو جائیں گی اس میں سب امتیں، تو کہے گی آخری امت پہلی امتوں کے متعلق: اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس دے ان کو دگنا عذاب آگ سے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اور کہیں گی پہلی امتیں پچھلی امتوں سے کہ نہیں ہے تمہیں ہم پر کوئی فضیلت پس چکھو عذاب بوجہ اس کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ، ای مع أمم یعنی تم داخل ہو جاؤ ان امتوں کے ساتھ۔ تو اس میں فی بمعنی مع ہے۔ اور یہ ممتنع نہیں ہے، کیونکہ تیرا قول: زید فی القوم بمعنی زید مع القوم ہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فی اپنے معنی میں ہی ہے(1)۔ أی أدخلوا فی جملتھم (تم بھی ان کے اجتماع میں داخل ہو جاؤ) اور قائل (کہنے والا) کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم داخل ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ داروغہ جہنم مالک ہے۔ (یعنی وہ انہیں کہے گا: تم داخل ہو جاؤ)۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا جب بھی کوئی امت داخل ہوگی تو وہ اس پر لعنت بھیجے گی جو اس سے پہلے جہنم کی طرف جا چکی ہے اور یہ دین اور ملت کے اعتبار سے اسی کی طرح ہے(2)۔ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا یہاں تک کہ جب سب امتیں اس میں جمع ہو جائیں گی۔ اعمش نے تدارکوا پڑھا ہے اور یہ اصل ہے، پھر اس میں ادغام ہوا اور اسے ہمزہ وصل کی ضرورت پڑی۔ اسے مہدوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔ حتی إذا أدرکوا یعنی جب بعض بعض کو پالیں گے۔ اور عصمہ نے ابو عمرو سے حتی إذا إدّارکوا نقل کیا ہے اس میں اجتماع ساکنین کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 398 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 149

اور بیان کیا ہے کہ یہ دونوں قرائتیں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور اس کے لیے مال کا دو تہائی ہے۔ اور ابو عمرو سے یہ بھی منقول ہے: إِذَا ادَّارَكُوا یعنی الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، تو گویا انہوں نے تذکر کے لیے اذا پر سکوت کیا۔ اور جب ان کا سکوت طویل ہوا تو ہمزہ وصل قطعی ہو گیا جیسے اس سے ابتدا کی جائے۔ اور شعر میں الف وصل بطور قطع استعمال ہوا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

یا نفسُ صبراً کلّ حیّ لاقِ وکلّ إثنین إلی إفتراقِ

حضرت مجاہد اور حمید بن قیس سے حَتّٰی إِذَا ادَّارَكُوا مروی ہے (یعنی) اس میں التقاء ساکنین کی وجہ سے اذا کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے اور دال کے بعد والے الف کو بھی حذف کر دیا گیا ہے اور جَمِيعًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ قَالَتْ أُخْرٰىهُمْ لِأُوْلٰىهُمْ یعنی بعد میں داخل ہونے والی امت اور یہ اتباع کرنے والے ہیں پہلی امتوں کے بارے کہے گی۔ اور وہ قیادت کرنے والے والیاں ہیں۔ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۔ لِأُوْلٰىهُمْ میں لام لام اجل ہے، کیونکہ انہوں نے پہلی امتوں کو خطاب نہیں کیا، بلکہ انہوں نے پہلی امتوں کے حق میں کہا: رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا (اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا)

اور الضعف سے مراد ایک مقدار پر اسی کی مثل زائد مقدار چاہے ایک بار یا کئی بار۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہاں الضعف سے مراد اژدہا اور سانپ ہیں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ (الاحزاب) (اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت) اور وہاں ضعف کا ذکر اس سے کثیر معنی اور جو احکام اس پر مترتب ہو رہے ہیں ان کے لیے آ رہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) تابع اور متبوع ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یہ ان کی قراءت ہے جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہر فریق اس (عذاب) کے بارے نہیں جانتا جو دوسرے فریق کے لیے ہے، کیونکہ اہل جہنم میں سے بعض جب یہ جان لیں کہ کسی اور کا عذاب اس کے عذاب سے زیادہ ہے تو یہ بھی اس کے لیے راحت اور تسلی کی ایک قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ یعنی لیکن تم نہیں جانتے اے مخاطبین! جو عذاب وہ پا رہے ہیں۔ اور جائز ہے کہ معنی یہ ہو لیکن تم نہیں جانتے اے اہل دنیا! اس عذاب کی مقدار جس میں وہ مبتلا ہیں۔

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ یعنی پہلی امتیں پچھلی امتوں کو کہیں گی: تحقیق تم نے کفر کیا اور تم نے وہی کیا جو ہم نے کیا، پس تم عذاب میں کسی تخفیف کے مستحق نہیں ہو۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے نہ کھولے جائیں گے ان کے لیے آسمان کے

دروازے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں جرم کرنے والوں کو۔ ان کے لیے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی ان کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اسی لیے صحیح احادیث موجود ہیں جو ہم نے کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں کافر کی روح قبض کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا: اس سے ایسی ہوا (بو) خارج ہوتی ہے جو سطح زمین پر پائے جانے والے مردار سے زیادہ بدبوار ہوتی ہے، پس وہ اسے لے کر اوپر کی جانب چڑھتے ہیں اور ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں: یہ خبیث روح کس کی ہے؟ تو یہ بتاتے ہیں: فلاں بن فلاں کی۔ اور یہ اس کا وہ قبیح ترین نام لیتے ہیں جس کے ساتھ اسے دنیا میں پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ آسمان دنیا تک پہنچ کر رک جاتے ہیں اور وہ اسے کھولنے کی درخواست کرتے ہیں لیکن اس کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جاتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے جب وہ دعا مانگیں گے۔ حضرت مجاہد اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہی کہا ہے (1)۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے ان کے لیے جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، کیونکہ جنت آسمانوں میں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ اور اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہیں ہو سکتا پس وہ بھی بالیقین جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اور یہ اس پر قطعی دلیل ہے کہ ان کے لیے عفو و درگزر جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان مسلمانوں کا اجماع ہے تو ان پر خطا کا اطلاق کرنا جائز نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کی۔

قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا ہے: اگر کوئی کہنے والا کہے اس امت کا یہ اجماع کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ متکلمین کی ایک جماعت نے یہ گمان کیا ہے کہ کافروں میں سے یہود و نصاریٰ اور دیگر کی تقلید کرنے والے دوزخ میں نہیں ہوں گے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جنہوں نے اپنے اندر پیدا ہونے والے شبہ کی بنا پر مقلد کے کافر ہونے کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ نظریہ ہی نہیں کہ مقلد کافر ہے اور اسی بنا پر کہا ہے کہ وہ جہنم میں نہیں ہوگا اور اس بارے علم کہ مقلد کافر ہے یا نہیں بطریق نظر حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس کا انحصار توقیف اور خبر پر ہے۔

حمزہ اور کسائی نے لا یُفتح یا مضمومہ کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر ہے اور باقیوں نے جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر تا کے ساتھ قراءت کی ہے جیسے فرمایا: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿ (ص) پس اسے مؤنث لایا گیا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کی ہے، اس معنی کی بنا پر کہ تخفیف قلیل و کثیر کے لیے ہوتی ہے اور تشدید تکثیر و

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت

تکریر کے لیے ہوتی ہے کسی اور کے لیے نہیں (اور تکریر کا معنی ہوتا ہے یکے بعد دیگرے بار بار کوئی کام کرنا) اور یہاں تشدید اولیٰ ہے، کیونکہ یہ کثیر پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور الجمل ابل (اونٹ) میں سے ہے۔ فراء نے کہا ہے: جمل زوج الناقة (1) (نراونٹ کو کہتے ہیں)۔

اور اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا (2) جب ان سے اونٹ (جمل) کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ زوج الناقہ ہے۔ گویا جس نے آپ سے اس کے بارے پوچھا اس نے ایسی چیز سے جہالت اور ناواقفی کا اظہار کیا جسے تمام لوگ جانتے ہیں۔ اور اس کی جمع جمال، اجمال، جمالات اور جمائل ہے۔ اور اسے جمل کا نام دیا جاتا ہے جب کہ یہ چوپایہ ہے۔ اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: حتی یلج الجملُ الأصفر فی سم الخیاط اسے ابو بکر انباری نے ذکر کیا ہے، سند اس طرح ہے حدثنا ابی حدثنا نصر بن داؤد حدثنا ابو عبید حدثنا حجاج عن ابن جریج عن ابن کثیر عن مجاهد قال فی قراۃ عبد اللہ ...... اور آگے ذکر کیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الجُمَّل جیم کو ضمہ کے ساتھ اور میم کو فتحہ اور شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد کشتی کی وہ رسی ہے جسے قلس کہا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ رسیاں ہیں جو اکٹھی ہوں، یہ جملة کی جمع ہے، یہ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ موٹی رسی ہے (3) جو قنب کی چھال سے بنائی گئی ہو۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ رسی جس کے ساتھ کھجور کے درخت پر چڑھا جاتا ہے وہ مراد ہے۔

اور ان سے بھی اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے: الجُمَل جیم کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ اور اس کا معنی بھی کشتی کی موٹی رسی اور مطلق رسی ہے، جیسے ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور ان سے الجُمُل جیم اور میم دونوں کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ یہ جمل کی جمع ہے، جیسے أسد اور أُسُد ہے۔ اور الجُمْل مثلاً أسْدٌ اور أُسْد ہے۔ اور ابو السمال سے الجَمْل جیم کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ یہ جمل کی تخفیف ہے۔

اور سَمِّ الْخِيَاطِ کا معنی سوئی کا سوراخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور بدن میں ہر باریک سوراخ سَمّ اور سِم کہلاتا ہے۔ اور اس کی جمع سموم ہے۔ اور السم القاتل (قتل کرنے والا زہر) کی جمع سمام آتی ہے۔ اور ابن سیرین نے فی سُم سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الخیاط وہ سوئی جس کے ساتھ کپڑا سیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خِیاط و مِخْیَط جیسے إزَار و مِئزر اور قِنَاع و مِقْنَع اور مِهَاد، فراش (بچھونا) کو کہتے ہیں۔ اور غواش، غاشیة کی جمع ہے، یعنی وہ آگ جو انہیں ڈھانپ لے گی۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی ہم کافروں کو اسی طرح کا بدلہ دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ١ؗ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ١ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۴۲

"اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم تکلیف نہیں دیتے کسی کو مگر جتنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 211 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 104 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 214

اس کی طاقت ہے، وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ یہ کلام معترضہ ہے، یعنی والذین أمنوا وعملوا الصالحات أولئك أصحاب الجنة هم فيها خالدون (اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ کا معنی یہ ہے کہ اس نے کسی کو بیویوں کے نفقہ کا مکلف نہیں بنایا مگر صرف اتنی مقدار کا جسے وہ پالے اور اس پر قدرت رکھتا ہو، نہ کہ اتنی مقدار کا جس تک اس کا ہاتھ پہنچ ہی نہ سکے۔ اور اس سے، فعل سے پہلے استطاعت ثابت کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن الطیب نے کہا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا (الطلاق: 7) (اور تکلیف نہیں دیتا اللہ تعالیٰ کسی کو مگر اس قدر جتنا اسے دیا ہے)

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نکال لیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہے رواں ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے تھے اگر نہ ہدایت دیتا ہمیں اللہ تعالیٰ، بے شک آئے ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ۔ اور ان (خوش نصیبوں) کو آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے وارث بنائے گئے ہو تم جس کے بوجہ ان عملوں کے جو تم کیا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں ذکر فرمایا ہے جن کے ساتھ وہ اہل جنت پر انعام فرمائے گا (اور وہ) ان کے سینوں سے کینہ کو نکال دینا ہے۔ اور النزع کا معنی الإستخراج (نکالنا) ہے اور الغل کا معنی وہ کینہ ہے جو سینے میں مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اس کی جمع غلال ہے، یعنی ہم جنت میں اس کینہ وغیرہ کو ختم کر دیں گے جو دنیا میں ان کے دلوں میں مخفی تھا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے دروازے پر کینہ بٹھائے ہوئے اونٹ کی طرح ہو گا تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے دلوں سے نکالا ہو گا''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم ان میں سے ہوں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جنت میں کینہ نکالنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے ساتھ ان کی قرابت اور درجات کی فضیلت کے سبب حسد نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ جنت کی شراب کے سبب ہو گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ (الدہر) یعنی وہ شراب سینوں سے تکلیف دہ چیزوں کو نکال کر انہیں پاک کر دے گی۔ اس کا بیان سورۃ الانسان اور زمر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 401

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا اور وہ کہیں گے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں راہ دکھائی اس ثواب (اور ٹھکانے) کی، اس طرح کہ اس نے ہماری رہنمائی فرمائی اور ہمارے لیے ہدایت کو تخلیق فرمایا (یعنی ہدایت کو ہمارا مقدر بنا دیا۔ اور یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَ مَا كُنَّا ابن عامر کی قرأت بغیر واؤ کے ہے۔ اور باقیوں کی قراءت واؤ کے ساتھ ہے(1)۔ لِنَهْتَدِیَ اس میں لام کی ہے۔

لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ یہ محل رفع میں ہے۔ وَ نُوْدُوْۤا یہ اصل میں نودیوا ہے۔ ان یہ محل نصب میں مخففہ عن المثقلہ، یعنی بانہ تلکم الجنۃ اور کبھی تفسیر اسی شے کی ہوتی ہے جس کے ساتھ ندا دی گئی، کیونکہ ندا تو قول ہے، پس اس کا کوئی محل نہ ہوگا یعنی انہیں کہا جائے گا: تِلْكُمُ الْجَنَّةُ (یہی وہ حقیقت ہے) کیونکہ اس کے بارے دنیا میں ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا، یعنی انہیں کہا جائے گا: هذه تلكم الجنة التی وعدتم بها یہ وہی جنت ہے جس کے بارے تم سے وعدہ کیا گیا تھا یا انہیں یہ دخول سے پہلے کہا جائے گا جس وقت وہ اسے دور سے دیکھیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تلکم بمعنی هذه ہے(2)۔ اور اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کا معنی ہے۔ تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے محلات کے وارث بنا دیئے گئے ہو اور تمہارا اس میں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ساتھ ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ (النساء: 70) (یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا) اور مزید فرمایا: فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ (النساء: 175) تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ولا أنا إلا أن يتغمدنی الله برحمة منه و فضل(3) (مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و فضل کے ساتھ ڈھانپ لے)

اور صحیح کے علاوہ کسی اور میں ہے: کوئی کافر اور کوئی مومن نہیں(4) مگر اس کے لیے جنت اور جہنم میں ایک ٹھکانا ہے۔ جب اہل جنت جنت میں اور اہل جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو اہل جہنم کے لیے جنت بلند کی جائے گی اور وہ اس میں اپنے ٹھکانوں کی طرف دیکھ لیں گے اور انہیں کہا جائے گا: یہ تمہارے ٹھکانے تھے اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کا عمل کرتے، پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! تم ان کے وارث بن جاؤ ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو، پس ان کے محلات اہل جنت کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں ہے: ''کوئی مسلمان آدمی نہیں مرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ جہنم میں ایک یہودی یا عیسائی کو داخل کرتا ہے''(5)۔ پس یہ بھی میراث ہے۔ وہ جسے چاہے اپنے فضل کے ساتھ انعام عطا فرمائے اور جسے چاہے اپنے عدل کے ساتھ عذاب میں ڈال دے۔ الختصر یہ کہ جنت اور اس کے محلات اس کی رحمت کے بغیر نہیں پائے جا سکتے، پس

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 154 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، صفة المنافقین واحکامهم، جلد 2، صفحہ 377
4۔ تفسیر المراغی، جلد 3، صفحہ 304 5۔ صحیح مسلم، کتاب التوبة، جلد 2، صفحہ 360

جب وہ اپنے اعمال کے سبب اس میں داخل ہوں گے تو تحقیق وہ اس کی رحمت کے ساتھ اس کے وارث بنیں گے اور اس کی رحمت کے ساتھ ہی اس میں داخل ہوں گے"۔ کیونکہ ان کے اعمال بھی ان کے لیے اس کی جانب سے رحمت اور ان پر اس کا فضل و احسان ہے۔ اور بغیر ادغام کے أورثتموها پڑھا گیا ہے اور تا کو تا میں ادغام کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور آواز دیں گے جنتی دوزخیوں کو بے شک ہم نے پالیا جو وعدہ فرمایا تھا ہمارے ساتھ ہمارے رب نے سچا تو کیا تم نے بھی پایا جو وعدہ کیا تھا تمہارے رب نے سچا، وہ کہیں گے: ہاں۔ تو پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان یہ کہ لعنت ہو اللہ کی ظالموں پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہ سوال مزید اضطراب میں ڈالنے کے لیے اور عار دلانے کے لیے ہے۔ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مثلاً أن تلكم الجنة (کہ یہی وہ جنت ہے یعنی ہم نے تو اسے پالیا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نفس ندا ہے۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ یعنی پھر ایک پکارنے اور آواز دینے والا آواز دے گا اور وہ ملائکہ میں سے ہوگا۔ بَيْنَهُمْ یہ ظرف ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أعلم وسطهم (میں ان کے وسط کو جانتا ہوں)۔ اعمش اور کسائی نے نعِم عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس لغت پر عین کو سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: جس نے عین کلمہ کو کسرہ کے ساتھ نعم پڑھا ہے تو اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ نعم جو کہ حرف جواب ہے اور نعم جو کہ اونٹ، گائے اور بکری کا اسم ہے کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے۔ اور حضرت عمر سے جواب میں نعم بفتح العین کا انکار بھی مروی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ نعم کا استعمال قلیل ہے۔ اور نَعَم اور نَعِم یہ دونوں لغتیں ہیں بمعنی وعدہ کرنا اور تصدیق کرنا، پس وعدہ کا معنی تب پایا جاتا ہے جب تو موجب کے بارے میں سوال کرے مثلاً تیرا یہ قول: أيقوم زيد؟ (کیا زید کھڑا ہے؟) تو وہ جواب میں کہے: نعم (ہاں) اور تصدیق کا معنی پایا جاتا ہے جب تو کسی وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کے بارے خبر دے، تو کہے: قد كان كذا و كذا (واقعہ اس اس طرح ہوا)، تو وہ کہے: نعم (ہاں) اور جب تو منفی کے بارے میں سوال کرے تو پھر جواب میں بلیٰ ہوگا، جیسے تیرا یہ قول ألم أكرمك (کیا میں نے تیری عزت و تکریم نہیں کی؟) تو وہ کہے گا بلیٰ (کیوں نہیں) پس نعم، اس سوال کے جواب کے لیے ہے جو ایجاب پر داخل ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے۔ اور بلیٰ اس استفہام کے جواب کے لیے ہے جو نفی پر داخل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى (اعراف: 172)

بزی، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔ اور باقیوں نے أن کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظ اللعنة کو مبتدا ہونے کی بنا پر رفع دیا ہے پس ان دونوں قراءتوں کے مطابق حرف جر کو ساقط کرنے کی بنا پر محل نصب

میں ہے۔ اور مخففہ میں جائز ہوتا ہے کہ اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو اور وہ مفسرہ ہو جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اعمش سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ اِنَّ لَعْنَةُ اللهِ پڑھا ہے۔ اور یہ قول کو مضمر ماننے کی بنا پر ہے جیسے کوفیوں نے قراءت کی ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ (آل عمران: 39) اور روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت طاؤس ہشام بن عبدالملک کے پاس تشریف لے گئے اور اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور یوم الاذان (کی شدت) سے بچ۔ تو اس نے کہا: یوم الأذان کون سا دن ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یہ سن کر ہشام بیہوش ہو گیا، اس پر حضرت طاؤس نے کہا: یہ ذلت و رسوائی تو فقط بیان کی ہے تو مشاہدہ اور معاینہ کی ذلت کیسی ہوگی۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۞

"جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور چاہتے ہیں اسے کہ ٹیڑھا ہو جائے اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ الظّٰلِمِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اس سے پہلے ھم یا اعنی مضمر ماننے کی بنا پر اس کا محل رفع اور نصب میں ہونا بھی جائز ہے، یعنی جو دنیا میں لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں۔ اور یہ الصد سے ماخوذ ہے جس کا معنی منع کرنا اور روکنا ہے یا جو ذاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے راستے سے اعراض کرتے ہیں۔ اور یہ الصدود سے ماخوذ ہے۔

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وہ اسے ٹیڑھا کرنے کی خواہش اور طلب رکھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں سو اس کے ساتھ ایمان نہیں لاتے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ، ای وکانوا بھا کافرین (اور وہ اس (آخرت) کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں) پس اسے کلام سے حذف کیا گیا ہے اور یہ کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۞

"اور ان دونوں (جنت و دوزخ) کے درمیان پردہ ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو پہچانتے ہوں گے سب کو ان کی علامت سے اور وہ آواز دیں گے جنتیوں کو کہ سلامتی ہو تم پر (اور ابھی) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ یعنی جہنم اور جنت کے درمیان پردہ ہے، کیونکہ انہیں دو کا ذکر جاری ہے۔ حجاب کا معنی حاجز (رکاوٹ، پردہ) یعنی دیوار ہے اور یہ سور (دیوار) وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ (الحدید: 13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار)

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یعنی علی أعراف السور یعنی دیوار کی بلندیوں پر کچھ مرد ہوں گے۔ اور اسی سے عرف الفرس (گھوڑے کی گردن کے بال) اور عرف الدیك (مرغ کی کلغی) ہیں۔ عبداللہ بن ابی یزید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اعراف سے مراد بلند اور اونچی شے ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اعراف سے مراد دیوار ہے جس کی بلندی مرغ کی کلغی کی طرح ہوگی۔ اور لغت میں اعراف بلند جگہ کو کہتے ہیں اور یہ عرف کی جمع ہے۔ یحییٰ بن آدم نے کہا ہے: میں نے کسائی سے اعراف کی واحد کے بارے پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ تو میں نے کہا: ہمیں اسرائیل نے جابر سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الاعراف سور له عرف كعرف الديك (1) تب انہوں نے کہا: ہاں قسم بخدا! اس کی واحد یہی ہے اور جمع اعراف ہے، اے لڑکے کاغذ لاؤ، پھر آپ نے اسے لکھ لیا اور یہ کلام محل مدح میں بیان ہوا ہے، جیسے اس بارے میں فرمایا: رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37) (وہ (جوان) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید وفروخت یاد الٰہی سے)۔ اور اصحاب اعراف کے بارے میں علماء کے دس اقوال ہیں:

پس حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، حضرت شعبی، حضرت ضحاک اور حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ وہ جماعت ہے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر اور مساوی ہوں گی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور مسند خیثمہ بن سلیمان کے پندرہویں جز کے آخر میں ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا اور نیکیوں اور بدیوں کا وزن کیا جائے گا اور جس کی نیکیاں بدیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھی بھاری ہو جائیں گی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کے گناہ اس کی نیکیوں پر جوں کے انڈے کے برابر بھاری ہو جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا''۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہو گئیں؟ (وہ کہاں ہوگا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اصحاب اعراف ہیں وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور اس میں داخل ہونے کے خواہشمند ہوں گے'' (2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اصحاب اعراف سے مراد صالحین فقہاء و علماء کی جماعت ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہداء ہیں۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: اور یہ بھی قول ہے کہ مومنین میں سے فضلاء اور شہداء ہیں، جو اپنی ذاتوں میں مشغول ہونے سے فارغ ہوئے اور لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جب وہ اصحاب نار کو دیکھیں گے تو وہ جہنم کی طرف لوٹائے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور معلوم کا خلاف بھی مقدور ہوتا ہے اور جب وہ اہل جنت کو دیکھیں گے اور وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے اس کے بعد وہ اپنے لیے اس میں داخل ہونے کے امیدوار ہوں گے۔ اور شرحبیل ابن سعد نے کہا ہے: اصحاب اعراف سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ شہید ہونے والے لوگ ہیں جو اپنے آباء کی نافرمانی کرتے ہوئے نکلے تھے۔

طبرانی نے اس بارے میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ان کی نافرمانی اور ان کی شہادت کو برابر قرار دیا جائے گا۔ اور ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ وَ عَلَى

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 244 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 228

الْاَعْرَافِ رِجَالٌ کے بارے میں ذکر کیا ہے فرمایا: اعراف پل صراط پر بلند جگہ ہے، یہی نظریہ حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت جعفر ذوالجناحین رضی اللہ عنہم کا ہے، وہ اپنے محبت کرنے والوں کو چہروں کی سفیدی اور نور سے اور بغض رکھنے والوں کو چہروں کی سیاہی سے پہچان لیں گے۔ اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ قیامت کے دن وہ عدل کرنے والے لوگ ہیں جو لوگوں پر ان کے اعمال کے بارے شہادت دیں گے اور یہ ہرامت میں ہوں گے۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: جو کچھ اس بارے میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے اور یہ اس دیوار پر ہوں گے جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: وہ گروہ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ قوم ہے جن کے صغیرہ گناہ تھے وہ ان سے دنیا میں مصائب وآلام کے ساتھ ختم نہیں ہوئے اور انہوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا پس انہیں جنت سے روک دیا جائے گا تا کہ اس کے سبب انہیں غم اور اضطراب لاحق ہو اور یہ ان کے صغیرہ گناہوں کے مقابلہ میں ہو جائے گا۔ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ اصحاب اعراف میں ہوں گے، کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ وہ گنہگار لوگ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد زنا سے پیدا ہونے والے لوگ ہیں۔ اسے قشیری (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصحاب اعراف سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو اس دیوار کے ساتھ مقرر ہوں گے، وہ کافروں کو مومنین سے انہیں جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے الگ کریں گے۔ اسے ابومجلز نے ذکر کیا ہے۔ تو ان کو کہا گیا: ملائکہ کو رجال نہیں کہا جاتا؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ وہ مذکر ہیں مؤنث نہیں ہیں، لہٰذا ان پر لفظ رجال کا اطلاق کرنا بعید نہیں ہے، جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اس کا اطلاق جنوں پر کیا گیا ہے: وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن: 6) (اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی)

پس یہ ملائکہ مومنین کو ان کی علامات سے اور کفار کو ان کی علامات سے پہچان لیں گے۔ اور وہ مومنین کو ان کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے بشارت دیں گے درآنحالیکہ وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے لیکن وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے۔ اور جب وہ اہل جہنم کو دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کے لیے عذاب سے سلامتی کی دعا کریں گے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اعراف پر اہل جنت میں سے وہ لوگ ہوں گے جن کا جنت میں داخل ہونا مؤخر ہوگا اور ان کے لیے وہ وصف واقع ہو سکتا ہے جس کا اعتبار دونوں فریقوں میں کیا گیا ہے۔ اور یَعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِیْمٰىهُمْ یعنی وہ سب کو ان کی علامات سے پہچانتے ہوں گے اور وہ اہل جنت میں چہروں کی سفیدی اور ان کا حسن ہے اور اہل جہنم میں چہروں کی سیاہی اور ان کا قبح ہے، علاوہ ازیں پہچان کے لیے ان کا اپنا محل ہوگا اور ان کا اپنا محل اور مکان ہوگا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تعیین کرنے سے توقف کیا گیا ہے، کیونکہ اثر اور تفصیل میں اضطراب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو جاننے والا ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 157　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404

پھر یہ کہا گیا ہے کہ اعراف عرف کی جمع ہے اور اس سے مراد ہر بلند اور اونچا مقام ہے، کیونکہ وہ اپنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے پست جگہ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور اعرف ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اعراف سے مراد پل صراط کی بلندیاں ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبل احد ہے اسے وہاں رکھا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور زہراوی نے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں قیامت کے دن جنت اور دوزخ کے درمیان اس کی تمثیل بنائی جائے گی اس پر کچھ قوموں کو روک لیا جائے گا ان تمام کو ان کی علامات سے پہچان لیا جائے گا اور وہ ان شاء اللہ تعالیٰ اہل جنت میں سے ہوں گے''۔ اور دوسری حدیث حضرت صفوان بن سلیم سے ذکر کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک احد جنت کے ارکان میں سے ایک رکن پر ہے'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمر نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں بلاشبہ وہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے'' (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ یعنی اصحاب اعراف اصحاب جنت کو آواز دیں گے۔ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ یعنی وہ انہیں کہیں گے: تم پر سلام ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم سزا سے سلامت ہو۔ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ یعنی اصحاب اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے، یعنی ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے۔ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور لغت میں طمع بمعنی علم معروف ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے کہ مراد اصحاب اعراف ہی ہیں۔

اور ابو مجلز نے کہا ہے: وہ اہل جنت ہیں (3)، انہیں اصحاب اعراف کہیں گے: تم پر سلام ہو اور ابھی تک اہل جنت جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ ان مومنین کے لیے جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے جو اصحاب اعراف کے پاس سے گزریں گے۔ اور وقف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر ہے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ اور اس قول پر لَمْ یَدْخُلُوْهَا پھر ابتدا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ سے ہوئی ہے۔ اس معنی پر کہ وهم یطمعون فی دخولها اور وہ جنت میں داخل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ حال ہو اور معنی یہ ہو: اصحاب اعراف کے پاس سے گزرنے والے مومنین جنت میں داخل نہیں ہوئے، حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں اور بلاشبہ وہ اس میں داخل ہوئے ہیں اس میں داخلے کی خواہش رکھے بغیر۔ تو اس طرح لَمْ یَدْخُلُوْهَا پر وقف نہیں کیا جائے گا۔

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 404
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 232
3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 233

''اور جب پھیری جائیں گی ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف (تو) کہیں گے: اے ہمارے رب! نہ کر تو ہمیں ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ اور جب ان کی نگاہیں اس جہت پھیری جائیں گی جس میں سامنے اہل جہنم ہوں گے۔ دو لفظوں کے بغیر تفعال کے وزن پر کوئی مصدر نہیں آیا اور وہ دو تلقاء اور تبیان ہیں اور باقی تمام فتحہ کے ساتھ آتے ہیں، مثلاً تسیار، تہمام اور تذکار۔ اور رہا اسم تو وہ اس میں کسرہ کے ساتھ کثیر آتا ہے، مثلاً تقصار اور تمثال۔ قَالُوْا یعنی اصحاب اعراف کہیں گے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں گے کہ وہ ان کے ساتھ (ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ) نہ کر دے، حالانکہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ انہیں ان کے ساتھ نہیں کرے گا۔ تو یہ علی سبیل التذلل اور عجز کی بنا پر ہے، جیسے اہل جنت کہیں گے: رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (التحریم: 8) (اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور مکمل فرما) اور کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بنا پر کہیں گے اور ان کے لیے اس میں لذت ہوگی۔

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝

''اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی علامتوں سے (انہیں) کہیں گے نہ فائدہ پہنچایا تمہیں تمہارے جتھے نے اور (نہ اس ساز و سامان نے) جس کی وجہ سے تم غرور کیا کرتے تھے۔ (اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انہیں اللہ اپنی رحمت سے۔ (دیکھو! انہیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ یعنی اعراف والے اہل نار میں سے ان لوگوں کو کہیں گے جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے۔ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ وہ انہیں کہیں گے: تمہیں دنیا کے لیے جمع کیے گئے مال نے اور ایمان سے تمہارے غرور اور تکبر کرنے نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ یہ اشارہ مومنین فقراء کے گروہ کی طرف ہے، جیسے حضرت بلال، حضرت سلمان اور حضرت خباب وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اَقْسَمْتُمْ کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں قسمیں اٹھایا کرتے تھے؟ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں عطا نہیں فرمائے گا۔ بِرَحْمَةٍ اپنی رحمت میں سے۔ اس کے ساتھ وہ انہیں جھڑکیں گے۔ اور وہ ان کے غم اور حسرت میں یہ کہہ کر اضافہ کریں گے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (کہ انہیں حکم مل چکا ہے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور عکرمہ نے دخلوا الجنة قراءت کی ہے یعنی الف کے بغیر اور دال مفتوح کے ساتھ۔ (وہ جنت میں داخل ہو چکے ہیں) اور طلحہ بن مصرف نے خاء کے

کسرہ کے ساتھ اُدْخِلُوا الْجَنَّةَ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ فعل ماضی ہے (یعنی وہ جنت میں داخل کر دیئے گئے ہیں)

اور یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اصحاب اعراف ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام ہیں، کیونکہ ان کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہے۔ اور جنہوں نے اصحاب اعراف گنہگاروں کو بنایا ہے تو اصحاب نار کے لیے ان کے قول کا آخر وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ہے۔ اور اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ آخر آیت تک اہل جہنم کو اس پر زجر و توبیخ کے لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور پہلا حسن سے مروی ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان ملائکہ کے کلام میں سے ہے جو اصحاب اعراف کے ساتھ مقرر ہوں گے، کیونکہ اہل جہنم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اصحاب اعراف ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے تو ملائکہ اصحاب اعراف کو کہیں گے: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے)

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور آواز دیں گے دوزخی جنتیوں کو کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی یا جو کچھ دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے جنتی کہیں گے کہ اللہ نے حرام کر دی ہیں یہ دونوں چیزیں کافروں پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ نَادٰۤى کہا گیا ہے: جب اہل اعراف جنت تک پہنچ جائیں گے تو اہل جہنم خواہش کریں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک جنت میں ہمارے رشتہ دار اور قرابت دار ہیں پس ہمیں اجازت عطا فرمائی جائے کہ ہم انہیں دیکھیں اور ان سے بات کریں۔ اور اہل جنت ان کے چہرے سیاہ ہونے کی وجہ سے انہیں نہ پہچان سکیں گے، تو وہ (اہل جہنم) انہیں کہیں گے: اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے) تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ عذاب میں ہو۔ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تو اہل جنت کہیں گے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کا طعام و شراب دونوں کافروں پر حرام کر دیئے ہیں۔ الافاضہ کا معنی التوسعۃ (وسعت دینا، کشادگی پیدا کرنا) کہا جاتا ہے: أفاض علیه نعمه (اس نے اس پر اپنی نعمتیں انڈیل دیں یعنی ان میں توسیع کر دی)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر بھی دلیل ہے کہ کسی کو پانی پلانا افضل ترین اعمال میں سے ہے۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: پانی، کیا تم اہل جہنم کی طرف دیکھتے نہیں کہ جس وقت وہ اہل جنت سے مدد طلب کریں گے تو وہ یہ کہیں گے: اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (کہ ہم پر پانی انڈیلو یا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے)

اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: آپ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ صدقہ کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی۔ اور ایک روایت میں ہے: پس انہوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا: ھذہ لأم سعد (1) (یہ کنواں سعد کی ماں کے نام ہے)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم أن أم سعد کانت تحب الصدقۃ، أفینفعها أن أتصدق عنها؟ قال: نعم وعلیك بالماء (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک سعد کی ماں صدقہ پسند کرتی تھی کیا میرا اس کی طرف سے صدقہ دینا اسے نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور تجھ پر پانی صدقہ کرنا لازم ہے)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس کی طرف سے (لوگوں کو) پانی پلائے۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی پلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ترین سبب قربت ہے۔ اور بعض تابعین نے کہا ہے: من کثرت ذنوبه فعلیه بسقی الماء (جس کے گناہ زیادہ ہو جائیں تو اس پر (لوگوں کو) پانی پلانا واجب ہے) اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادی جس نے کتے کو پانی پلایا، تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوگی جس نے ایک مومن موحد انسان کو پانی پلایا اور اسے زندگی بخش دی؟۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم میں سے ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا کہ اسے شدید پیاس نے آلیا چنانچہ وہ کنویں میں اترا اور اس سے پانی پی لیا پھر جب وہ باہر نکلا تو اچانک ایک کتے کو پیاس کی وجہ سے مٹی چاٹتے ہوئے دیکھا تو اس نے (دل میں) کہا اس کتے کو اسی طرح پیاس کے سبب (تکلیف) ہے جیسے مجھے پہنچی ہے چنانچہ اس نے اپنا خف (موزہ) پانی سے بھرا، اسے اپنے منہ (کے دانتوں) سے پکڑا، پھر اوپر چڑھا اور اس کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر افزائی فرمائی اور اس کی مغفرت فرما دی''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم (کیا) ہمارے لیے چوپایوں میں بھی اجر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر تر (زندہ) جگر رکھنے والی شے میں اجر ہے'' (3)۔ اور اس کے برعکس وہ روایت ہے جسے مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک عورت (4) کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا اس نے اسے قید کر رکھا تھا یہاں تک کہ وہ مرگئی پس اس میں اس نے اسے آگ داخل ہوگئی نہ اس نے اسے کچھ کھلایا اور نہ اسے پانی پلایا، کیونکہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ ہی اس نے اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی''۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کو ایک بار ایسی جگہ پانی پلایا جہاں پانی پایا جاتا ہو تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کر دیا (یعنی اسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب دیا جائے گا) اور جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ ایک بار پانی پلایا جہاں پانی نہ پایا جاتا ہو تو گویا اس نے اسے زندہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 236۔ ایضاً، حدیث 1431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، قتل الحیاۃ وغیرها، جلد 2، صفحہ 237 — 3۔ صحیح بخاری، المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 333

4۔ صحیح مسلم، قتل الحیاۃ وغیرها، جلد 2، صفحہ 236

کر دیا'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک حوض اور مشکیزے کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کے لیے اسے روکنا جائز ہے جو اس سے پانی لینا چاہے، کیونکہ اہل جنت کے اس قول: اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِیْنَ کا معنی ہے کہ تمہارے لیے اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک باب ذکر کیا ہے: باب من رأى أن صاحب الحوض والقربة أحق بمائه (یہ باب اس کے بیان میں ہے جس کی رائے ہے کہ حوض اور مشکیزے کا مالک اپنے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے) اور انہوں نے اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کچھ لوگوں کو اپنے حوض سے اس طرح دھتکار دوں گا جیسے اجنبی اونٹ کو حوض سے بھگا دیا جاتا ہے'' (2)۔ مہلب نے کہا ہے: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حوض کا مالک اس کے پانی کا زیادہ حق دار ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: لأذودن رجالا عن حوضي (3)۔

الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ فَالْیَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

''جنہوں نے بنا لیا تھا اپنے دین کو کھیل اور تماشا اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا انہیں دنیا کی زندگی سو آج ہم فراموش کر دیں گے انہیں جیسے بھلا دیا تھا انہوں نے اس دن کی ملاقات کو اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے''۔

اس میں الَّذِیْنَ کافرین کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ اور اضمار کے سبب محل رفع اور محل نصب میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اہل جنت کے قول میں سے ہے: فَالْیَوْمَ نَنْسٰىهُمْ یعنی آج ہم انہیں جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا یعنی جیسے انہوں نے (اس دن کی ملاقات کے مطابق) عمل ترک کر دیا تھا اور اسے جھٹلا دیا تھا۔ اور اس میں ما مصدر یہ ہے یعنی ان کے بھلا دینے کی طرح۔ وَ مَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ یہ اس پر معطوف ہے، یعنی وجحدھم ان کے ہماری آیتوں کا انکار کرنے کی طرح (آج ہم بھی انہیں فراموش کر دیں گے)

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور بے شک لے آئے ہم ان کے پاس ایک کتاب جسے ہم نے واضح کر دیا ہے (اپنے) علم (کامل) سے درآنحالیکہ وہ ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ اس میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ فَصَّلْنٰهُ ہم نے اسے واضح کر دیا ہے یہاں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الرہون، جلد 1، صفحہ 180
2۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318
3۔ صحیح بخاری، کتاب المساقات، جلد 1، صفحہ 318

تک کہ جس نے اس میں تدبر اور غور وفکر کیا اس نے اسے پہچان لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَصَّلْنٰهُ کا معنی ہے ہم نے اسے متفرق طور پر نازل کیا۔ عَلٰى عِلْمٍ اپنی طرف سے علم کامل کے ساتھ، لہٰذا اس میں کوئی سہو اور غلطی واقع نہیں ہوئی۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً زجاج نے کہا ہے: یعنی هادیاً و ذا رحمة(1) (درآنحالیکہ وہ ہدایت دینے والی اور سراپا رحمت ہے) انہوں نے اسے فَصَّلْنٰهُ کی ہا ضمیر سے حال بنایا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: هدىً و رحمةٌ پڑھنا بھی جائز ہے، بمعنی هو هدى و رحمة۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتاب سے بدل بناتے ہوئے جر کے ساتھ هدى و رحمةٍ پڑھنا بھی جائز ہے۔ امام کسائی اور فراء نے کہا ہے: کتاب کی صفت ہونے کی بنا پر هدى و رحمة جر کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (الانعام:155) کی مثل ہے۔ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ مومنین کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

”کافر کس چیز کے منتظر ہیں؟ یہ کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جس روز ظاہر ہوگا اس کا انجام تو کہیں گے جو بھلائے ہوئے تھے اسے اس سے پہلے کہ بے شک لائے تھے ہمارے رب کے رسول حق (پیغام) تو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں تو وہ سفارش کریں ہمارے لیے یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے تا کہ ہم عمل کریں اس کے برعکس جو ہم کیا کرتے تھے۔ بے شک انہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو اور گم ہو گیا ان سے جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ یہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور آل سے ماخوذ ہے اور اہل مدینہ ہمزے کی تخفیف کرتے ہیں۔ اور النظر کا معنی ہے انتظار کرنا، یعنی کیا وہ انتظار نہیں کر رہے مگر عقاب وحساب میں سے اس کے بارے جس کا قرآن کریم میں ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ يَنْظُرُوْنَ، النظر الی یوم القیامہ (یوم قیامت کی طرف دیکھنے) سے ماخوذ ہے۔ اور تَاْوِيْلَهٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور عاقبۃ الکتاب (کتاب کا انجام) وہ بعث وحساب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی جزاؤہ ہے یعنی ان کا کتاب کو جھٹلانے کا انجام اور جزا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تَاْوِيْلَهٗ کا معنی ہے عاقبت یعنی اس کا انجام، یہ دونوں معنی باہم متقارب ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی قیامت کے دن اس کا انجام ظاہر ہوگا۔ اور یوم یقول کے سبب منصوب ہے، یعنی یقول الذین نسوہ من قبل یوم یاتی تاویلہ۔ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ اس میں استفہام، تمنی اور آرزو

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 480

کے معنی میں ہے۔ فَيَشْفَعُوْا یہ جواب استفہام ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے أوهل نرد(1) (یا کیا ہم لوٹا دیئے جائیں گے) فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ زجاج نے کہا ہے: نرد کا عطف معنی پر کیا گیا ہے، یعنی هل يشفع لنا أحد أو نرد (کیا کوئی ہماری سفارش کرے گا یا ہم واپس لوٹائے جائیں گے) اور ابن اسحاق نے أو نرد فنعمل دونوں میں نصب پڑھی ہے اور معنی ہے إلا أن نرد (ورنہ ہمیں واپس لوٹا دیا جائے) جیسے کسی نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تَبْكِ عينُك إنما　نحاول مُلْكًا أو نموتَ فنُعْذَرَا

(اس میں أو نموت، إلا أن نموت کے معنی میں ہے)

اور حسن نے أو نرد فنعمل دونوں کو مرفوع پڑھا ہے۔ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یعنی انہوں نے اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا، اور ہر وہ جو اپنے آپ کو نفع نہ پہنچائے تحقیق انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے نعمتوں کو اور اپنے لطف و راحت کو نقصان پہنچایا۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ یعنی وہ باطل ہو گیا جو وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۫ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝54

"بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ڈھانکتا ہے رات سے دن کو درآنحالیکہ طلب کرتا ہے دن رات کو تیزی سے اور (پیدا فرمایا) سورج اور چاند اور ستاروں کو وہ سب پابند ہیں اس کے حکم کے، سن لو! اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔ بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ قدرت ایجاد میں منفرد اور یکتا ہے، پس وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

سِتَّةِ کی اصل سدسة ہے، پس انہوں نے دال کو سین میں ادغام کرنے کا ارادہ کیا اور وہ دونوں تا کے مخرج کے قریب مل گئے لہٰذا تا ان دونوں پر غالب آگئی۔ اور اگر چاہے تو کہے: دو سینوں میں سے ایک کو تا سے بدل دیا جائے اور پھر اسے دال میں ادغام کر دیا جائے، کیونکہ تو اس کی تصغیر میں کہتا ہے: سديسة اور اس کی جمع أسداس آتی ہے اور جمع اور تصغیر دونوں اسماء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: جاء فلان سادسا وسادتا وساتا پس جس نے سادتا کہا ہے اس نے سین کو تاء سے بدل دیا ہے۔ اور اليوم سے مراد سورج کے طلوع ہونے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک ہے۔ پس اگر سورج نہ ہو تو پھر یوم بھی نہ ہو۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 240

اور فرمایا: فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ کا معنی ہے آخرت کے ایام میں سے چھ دنوں میں، ان میں سے ہر دن ہزار برس کا ہوگا۔ اور یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی تعظیم بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چھ دن ایام دنیا میں سے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ (1) نے کہا ہے: ان میں سے پہلا دن اتوار کا دن تھا اور آخر جمعہ کا دن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مدت ذکر فرمائی ہے اگر وہ ایک لحظہ میں ان کی تخلیق کرنا چاہتا تو یقیناً ایسا کر دیتا۔ کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے کہتا: کونی (تو ہو جا) تو وہ ہو جاتا۔ لیکن اس نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ بندوں کو امور میں نرمی اور تثبت کی تعلیم دے اور تاکہ ملائکہ کے لیے یکے بعد دیگرے اس کی قدرت کا اظہار ہو۔

اور یہ ان کے نزدیک ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔ اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اس نے انہیں چھ دنوں میں پیدا فرمایا، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کی ایک مدت مقرر ہے۔ اور اس نے اس کے ذریعے گنہگاروں کو سزا دینے میں جلدی کرنے کو بھی بیان کیا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ہر شے کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور یہ اس کے اس قول کی طرح ہے: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﱪ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۞ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں، پس آپ صبر فرمایئے ان (کی دل دکھانے والی) باتوں پر)

اس کے بعد فرمایا: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا (ق:36) (اور قریش مکہ سے پہلے ہم نے برباد کر دیا بہت سی قوموں کو جو شوکت و قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں)

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یہ استواء کا مسئلہ ہے، اس بارے میں علماء کا بہت سا کلام اور جرأت کا اظہار ہے۔ ہم نے اس بارے میں علماء کے اقوال الکتاب الأسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی و صفاته العلی میں بیان کر دیئے ہیں اور وہاں ہم نے چودہ اقوال ذکر کیے ہیں۔ اکثر متقدمین اور متاخرین کی جانب سے یہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات جہت اور تحیز سے منزہ اور پاک ہے تو پھر اس کی ضرورت اور اس کے لواحق لازم میں سے یہ بھی ہے کہ عام علماء متقدمین کے نزدیک اور متاخرین میں سے محققین اور قائدین کے نزدیک اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات جہت سے پاک اور منزہ ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے اوپر کوئی جہت نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اسے جہت کے ساتھ خاص کر دیا جائے تو پھر وہ کسی مکان اور حیز میں ہو اور مکان اور حیز تسلیم کرنے پر متحیز کے لیے حرکت، سکون، تغیر اور حدوث ماننا لازم آتا ہے (اور رب کریم کی ذات ان تمام سے مبرا اور منزہ ہے)

یہ متکلمین کا قول ہے اور دور اوّل کے اسلاف رضی اللہ عنہم جہت کی نفی کے بارے کوئی کلام نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے بارے وہ بولتے تھے، بلکہ انہوں نے یہی بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے اثبات میں وہی کافی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرما دیا ہے اور اس کے رسولوں نے خبر دی ہے اور سلف صالح میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے کہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 408

اپنے عرش پر حقیقۃً متمکن ہوا ہے اور اس نے عرش کو اس لیے خاص کیا ہے، کیونکہ وہ اس کی مخلوقات میں سے بہت عظیم ہے، لیکن وہ اس استوا اور تمکن کی کیفیت سے ناواقف ہیں، کیونکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: لغت میں استوا معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے، لہٰذا اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے۔ اور اتنی مقدار کافی ہے اور جو اس سے زیادہ کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ علماء کی کتب سے اس مقام کا مطالعہ کرے۔ اور کلام عرب میں استوا کا معنی بلندی اور استقرار ہے۔ جوہری نے کہا ہے: إستوى من إعوجاج (وہ ٹیڑھا ہونے سے بچ گیا، سیدھا ہو گیا) إستوى على ظهر دابته (وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھ گیا) إستوى إلى السماء اس نے آسمان کا قصد کیا۔ اور إستوى بمعنی إستولى و ظهر (والی بننا اور غالب آنا) ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا:

قد إستوى بشرٌ على العراق من غير سيف ودمٍ مهراق(1)

تحقیق بشر نے عراق پر قبضہ جما لیا تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر۔

اور إستوى الرجل کا معنی ہے آدمی کی جوانی انتہا کو پہنچ گئی۔ إستوى الشئ کا معنی ہے شے معتدل اور سیدھی ہو گئی۔ ابوعمر بن عبدالبر نے ابوعبیدہ سے قول باری تعالیٰ: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) کے بارے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عرش پر بلند ہوا۔ اور شاعر نے کہا ہے:

فأوردتهم ماء بفَيْفاء قفْرَةٍ وقد حَلّق النجمُ اليمانِي فاستوى

اس میں استوی بلند ہونے کے معنی میں ہے بمعنی علا و ارتفع۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اللہ تعالیٰ کی بلندی اور ارتفاع اس کی عظمت و بزرگی، اس کی صفات اور بادشاہی کی بلندی اور رفعت سے عبارت ہے، یعنی اس سے اوپر کوئی نہیں ہے جس کے لیے عظمت وجلال کے ان معانی میں سے کوئی ایک ثابت ہو اور نہ ہی کوئی اور اس کے ساتھ ہے کہ اس کے اور اس کے مابین یہ رفعت و بلندی مشترک ہو، بلکہ یہ عظمت و رفعت اور بلندی بالاطلاق اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذات کے لیے ہے (اور کوئی دوسرا کسی اعتبار سے اس کے ساتھ شریک نہیں ہے)۔

قولہ تعالیٰ: عَلَى الْعَرْشِ یہ لفظ مشترک ہے ایک سے زیادہ معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ علامہ جوہری وغیرہ نے کہا ہے: عرش کا معنی سریر الملك (بادشاہ کا تخت) ہے قرآن کریم میں ہے نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا (النمل: 41) (شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی) وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: 100) (اور جب شاہی دربار میں پہنچے تو آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر) اور عرش کا معنی سقف البيت (مکان کی چھت) ہے۔ اور عرش القدم کا معنی ہے قدم کی پشت کا بلند حصہ اور اس میں انگلیاں بھی ہیں۔ عرش السماك: چار چھوٹے ستاروں جو عواء (چاند کی منازل میں سے ایک منزل ہے) کے نیچے ہیں، کہا جاتا ہے: إنها عجز الأسد (بے شک وہ اسد کی دم ہے) اور عرش البئر کا معنی ہے کنویں کو لکڑی کے ساتھ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 229

بنانا، اس کے بعد کہ اسے نیچے قد آدم کی مقدار پتھر سے بنالیا جائے تو وہ لکڑی جس سے اوپر کا حصہ بنایا جاتا ہے وہ عرش کہلاتی ہے، اس کی جمع عروش آتی ہے اور عرش مکہ مکرمہ کا نام بھی ہے اور عرش کا معنی ملک اور سلطنت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: ثُلّ عرش فلان جب اس کا ملک، سلطنت اور اس کی عزت جاتی رہے (چھن جائے)۔

زہیر نے کہا:

تدارکتما عبسًا وقد ثُلَّ عَرشُها　　وذُبیانُ إذ ذَلَّتْ بأقدامها النَّعلُ

اور کبھی آیت میں عرش کی تاویل ملک کے معنی سے کی جاتی ہے، یعنی کوئی بادشاہی اور ملک مستحکم اور مضبوط نہیں مگر وہ جو اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعز اسمہ کی ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے اور اس میں بھی نظر ہے۔ ہم نے اس کے بارے جملہ اقوال اپنی کتاب میں بیان کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ

قولہ تعالیٰ: یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یعنی وہ اسے (رات کو) پردے کی طرح بنا دیتا ہے، یعنی دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے (چلی جاتی ہے) تا کہ رات کے آنے سے دنیا میں زندگی کو قائم رکھنا مکمل ہو جائے، پس رات آرام اور سکون کے لیے ہے اور دن کاروبار حیات کے لیے۔ اور اسے یُغَشِّی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس کی مثل سورۂ رعد میں ہے۔ اور یہ ابو بکر کی عاصم، حمزہ اور کسائی سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے تخفیف کی ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں أغشی اور غشی اور تمام نے فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰی کے تشدد ہونے پر اجماع کیا ہے۔ اور فَاَغْشَیْنٰهُمْ (یسین:9) پر بھی تمام کا اجماع ہے پس یہ دونوں قراءتیں مساوی ہیں اور تشدید میں تکریر اور تکثیر کا معنی پایا جاتا ہے اور تغشیۃ اور إغشاء کا معنی ہے: ایک شے کا دوسری شے کو ڈھانپ دینا، چھپا دینا اور اس آیت میں رات پر دن کے داخل ہونے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دو میں سے ایک پر اکتفا کیا گیا ہے، جیسے سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ (النحل:81) (ایسے لباس جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے) اور بِیَدِكَ الْخَیْرُ (آل عمران:26) (تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی) میں ہے۔

اور حمید بن قیس نے یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے بے شک دن رات کو ڈھانپ لیتا ہے۔ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا یعنی وہ اسے ہمیشہ طلب کرتا ہے بغیر کسی فتور اور سکون کے۔ اور یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے: استوی علی العرش مغشیا اللیل النهار (وہ عرش پر اپنی شان کے مطابق متمکن ہوا درآنحالیکہ وہ رات سے دن کو ڈھانکتا ہے) اور اسی طرح یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا بھی اللیل سے حال ہے، یعنی یغشی اللیل النهار طالبالہ (رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے اسے تیزی سے طلب کرتے ہوئے)

اور یہ احتمال بھی ہے کہ جملہ مستانفہ ہو حال نہ ہو اور حَثِیْثًا طالب المقدر سے بدل ہو یا اس کی صفت ہو یا مصدر محذوف کی صفت ہو، یعنی یطلبه طلباً سریعاً اور الحث کا معنی ہوتا ہے: بہت جلدی کرنا اور تیزی کرنا۔ اور ولی حثیثا ای برعا (یعنی وہ تیزی سے واپس بھاگا)۔

وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِهٖ ؕ اخفش نے کہا ہے: اس کا عطف السموات پر ہے، یعنی وخلق الشمس (اور اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو تخلیق فرمایا وہ سب اس کے حکم کے پابند ہیں) اور حضرت عبداللہ بن عامر (1) سے ان تمام میں رفع مروی ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ اپنی خبر میں سچا ہے، پس اسی کے لیے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا، اس نے انہیں تخلیق فرمایا ہے اور انہیں اس کے بارے حکم دیا جو پسند فرمایا۔ اور یہ امر نہی کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عیینہ (2) نے کہا ہے: اس نے خلق اور امر کے درمیان فرق کیا ہے، پس جس نے ان دونوں کو جمع کیا تو اس نے کفر کیا، پس خلق مخلوق ہے اور امر اس کا وہ کلام ہے جو غیر مخلوق ہے اور وہ اس کا یہ قول ہے: کن (ہو جا)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝ (یٰسین) (اس کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے) اور خلق اور امر کے الگ الگ اور متفرق ہونے میں اس کے قول کے فاسد ہونے پر بین دلیل موجود ہے جس نے کہا ہے کہ قرآن مخلوق ہے، کیونکہ اگر اس کا وہ کلام جو امر ہے مخلوق ہو تو تحقیق اس نے پھر یہ کہا: الا لہ الخلق والخلق اور یہ کلام سے عاجز آنا، ناپسندیدہ اور ایسا کلام ہے جس میں مدد کی حاجت اور ضرورت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسی کلام کرنے سے بلند و برتر ہے جس میں کوئی فائدہ اور نفع نہیں۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ ؕ (الروم: 25) (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے)

وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِهٖ ؕ پس اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ خبر دی ہے کہ مخلوقات اسی کے حکم کے ساتھ قائم ہیں، پس اگر امر بھی مخلوق ہو تو وہ یقیناً ایک دوسرے امر کا محتاج ہوگا جس کے ساتھ وہ قائم ہوگا اور پھر وہ امر کا ایک مزید امر محتاج ہوگا یہاں تک کہ اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور یہ محال ہے، تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا وہ امر جو اس کا کلام ہے وہ قدیم ازلی اور غیر مخلوق ہے، تاکہ اس کے ساتھ مخلوقات کا قیام صحیح ہو سکے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ (الحجر: 85) (اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان دونوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی قول کے ساتھ اور وہ اس کا وہ قول ہے جو اس نے چیزوں کے موجود ہونے کے لیے فرمایا ہے یعنی کن (تو ہو جا) پس اگر حق بھی مخلوق ہو تو پھر یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کے ساتھ مخلوقات کو پیدا کرے، کیونکہ خلق مخلوق کے ساتھ تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اور اس پر یہ ارشادات دلالت کرتے ہیں: وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ (الصافات) (اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے)

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 482 2۔ ایضاً

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ (السجدہ:13) (لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے، یہ سب قدیم میں قول کے مقدم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وجود میں ازل کو ثابت کرتا ہے اور ان کے رد کے لیے یہی ایک نکتہ کافی ہے۔

اور ان کے لیے یہ آیات ہیں جن سے انہوں نے اپنے مذہب پر استدلال کیا ہے مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ الآیہ (الانبیاء:2) (نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے)

اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝ (الاحزاب) اور مفعولاً اور دو آیت جو ان کی مثل ہیں (اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے)

قاضی ابوبکر نے کہا ہے: مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ (الانبیاء:2) کا معنی ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو وعظ و نصیحت اور جو وعدہ و تخفیف انہیں ہوتا ہے۔ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ یَلْعَبُوْنَ ۝ (الانبیاء) (مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں (مگن) ہوتے ہیں، کیونکہ رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی نصیحت اور ان کا ڈرانا بھی ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَذَكِّرْ ٙ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ (الغاشیہ) (پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے) اور کہا جاتا ہے: فلان فی مجلس الذکر (فلاں وعظ و نصیحت کی مجلس میں ہے) اور وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝ (الاحزاب) اور مفعولاً کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کافروں کے لیے اپنی سزا اور انتظام کا اور مومنین کے لیے اپنی مدد و نصرت کا اور جو اس کے بارے فیصلہ فرمایا ہے اور اپنے افعال میں سے جو اس کے لیے مقرر فرمائے ہیں ان کا ارادہ کیا ہے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (ہود:40) (یہاں تک کہ جب آ گیا اس کا حکم)

اور اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝ (ہود) (اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا) یعنی اس کے مطابق اس کی شان، اس کے افعال اور اس کا طریقہ کار ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها أمرها حتى إذا تبوأت   بأخفافها مرعى تبوأ مضجعا

مسئلہ نمبر 2۔ اور جب یہ ثابت اور پختہ ہو گیا تو پھر یہ جان لو کہ امر کسی شے کے ارادہ میں سے نہیں ہے۔ اور معتزلہ کہتے ہیں: امر نفس ارادہ ہی ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ کبھی ایسی شے کے بارے حکم دیتا ہے جس کا وہ ارادہ نہیں فرماتا اور اس سے منع فرما دیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا لیکن اس کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کے ساتھ مل کر پچاس نمازیں پڑھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں پانچ سے زیادہ کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور کبھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ارادہ فرمایا کہ وہ فرماتا ہے: وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران:140) اور کافروں کو آپ کو قتل کرنے سے منع فرما دیا اور انہیں اس بارے حکم نہیں دیا۔ اس باب میں یہی صحیح اور نفیس ہے، پس اس میں غور کر لو۔

قولہ تعالیٰ: تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ تَبٰرَكَ باب تفاعل ہے۔ یہ برکت سے ماخوذ ہے (1) اور اس کا معنی کثرت اور وسعت ہے۔ کہا جاتا ہے: بورك الشئ اور بورك فيه (شے میں کثرت اور وسعت رکھ دی گئی) یہ ابن عرفہ نے کہا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: تَبٰرَكَ کا معنی ہے تعالیٰ و تعاظم وار تفع (اور وہ بلند و بالا اور عظمت و شان والا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس کے نام سے یمن و برکت حاصل کی جاتی ہے۔ اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

"دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ، بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یہ دعا اور اس میں عجز و انکساری کرنے کے بارے امر ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ساتھ ایسی صفات کو ملا دیا ہے جو اس کے ساتھ حسین لگتی ہیں اور وہ خشوع اور عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ اور خُفْيَةً کا معنی ہے وہ راز اور چھپی ہوئی بات جو دل میں ہوتا کہ وہ ریا کاری سے دور اور محفوظ رہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کی تعریف کی ہے جب ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) (جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے)

اور اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خير الذكر الخفي و خير الرزق ما يكفي (2) (بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو (حاجات کے لیے) کافی ہو)۔ اور یہ پختہ شرعی حکم ہے کہ نیکی کے اعمال میں وہ سر اور راز جس میں کوئی عیب اور نقص نہ ہو اجر کے اعتبار سے جہر سے اعظم اور افضل ہے۔ اور یہ معنی پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: تحقیق ہم نے کئی اقوام کو پایا ہے کہ وہ زمین پر عمل کرنے پر قدرت رکھتے تھے لیکن ان کا وہ عمل ہمیشہ جہراً ہوتا تھا۔ اور مسلمان دعا میں انتہائی کوشش اور عجز و انکساری کرتے ہیں اور ان کی آواز تک نہیں سنی جاتی، بلا شبہ دعا ان کے درمیان اور ان کے رب کے درمیان ایک سرگوشی ہوتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً۔ اور عبد صالح کا ذکر کیا ہے، اس کے عمل کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ (مریم) اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ آمین کو آہستہ (اور مخفی) کہنا اسے جہراً کہنے سے اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ یہ بھی ایک دعا ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں اس کے بارے بحث گزر چکی ہے۔

اور مسلم نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ہم سفر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور ایک روایت ہے ایک غزوہ میں تھے۔ پس لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی جب بھی کسی گھاٹی پر بلند ہوتا تو کہتا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے لوگو! اپنے نفسوں پر نرمی کرو بے شک تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ اسے جو غائب ہے، بلا شبہ تم اس سے دعا مانگ رہے ہو جو سننے والا ہے، قریب ہے اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 164
2۔ مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 180

وہ تمہارے ساتھ ہے"(1)۔ الحدیث

مسئلہ نمبر 2۔ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان میں سے حضرت جبیر بن مطعم، سعید بن مسیب اور حضرت سعید بن جبیر ہیں۔ اور حضرت شریح نے ایک آدمی کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کون انہیں پکڑے گا؟ تیری ماں تو ہے نہیں! اور حضرت مسروق نے ایک قوم کو کہا جنہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے: اللہ انہیں توڑ دے۔ اور انہوں نے یہ پسند کیا کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کے بارے دعا مانگے تو اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ اور وہ کہتے: یہی اخلاص ہے۔ اور حضرت قتادہ اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے۔ اور حضرت عطا، طاؤس اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے ہاتھ اٹھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔ اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اور آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی (2)۔ اور اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے اور کہا: "اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو خالد نے کیا ہے" (3)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا: جب غزوہ بدر کا دن تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا، وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے صحابہ کرام تین سو سترہ افراد تھے، تو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے منہ قبلہ شریف کی طرف کیا اور اپنے رب سے گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور امام ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفع یدیہ لم یحطھما حتی یمسح بھما وجھہ (5) (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ بلند کرتے تو پھر آپ انہیں نیچے نہ کرتے یہاں تک کہ انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔) امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ أن یرفع یدیہ إلیہ فیردھما صفرا (6) (او قال) خائبتین (بے شک تمہارا رب بڑا حیادار اور سخی ہے وہ اپنے بندے سے حیا محسوس کرتا ہے جو اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ بلند کرے اور وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے (یا فرمایا) وہ انہیں ناکام واپس کر دے)

پہلے گروہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے مسلم نے عمارہ بن رویبہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو منبر پر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا برا کرے۔ تحقیق میں نے رسول اللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ، جلد 2، صفحہ 364
2۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 938
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 622
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 93
5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 174
6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 284

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ کے ساتھ اسی طرح زائد کہتے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی مسبحہ انگلی کے ساتھ اشارہ کیا(1)۔ اور جو روایت سعید بن ابی عروبہ نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوائے بارش کی دعا کے کسی شے کے بارے دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ بلند نہ کرتے تھے اور آپ بارش کی دعا کے وقت انہیں اتنا بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی (2)۔ پہلی حدیث سعید بن ابی عروبہ کی حدیث سے سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور زیادہ ثابت ہے، کیونکہ آخری عمر میں حضرت سعید کی عقل مختل ہوگئی تھی۔ تحقیق حضرت شعبہ نے جو روایت قتادہ عن انس بن مالک سے بیان کی ہے اس میں انہوں نے سعید کی مخالفت کی ہے اور اس میں کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ بلند کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی (3)۔ اور تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: جب مسلمانوں پر کوئی آفت اور مصیبت نازل ہو تو اس وقت ہاتھ اٹھانا انتہائی جمیل اور حسین ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب بارش کے وقت اور غزوہ بدر کے دن کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دعا مانگنا اچھا ہے جس حالت میں آسان اور میسر ہو، محل فقر کے اظہار کے لیے، رب کریم کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے کے لیے اور اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے اظہار کے لیے انسان سے یہی مطلوب ہے، پس اگر چاہے تو وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور اپنے ہاتھ بلند کرے تو یہ بہت اچھا ہے اور اگر چاہے تو ایسا نہ کرے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُدۡعُوۡا رَبَّكُمۡ تَضَرُّعًا وَّخُفۡيَةً اور اس سے ہاتھ اٹھانے وغیرہ کی صفت اور حالت کا ارادہ نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا: الَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوۡدًا (آل عمران: 191) (وہ عقلمند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے) پس اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف بیان فرمائی ہے اور مذکورہ حالت کے سوا کسی حالت کی شرط نہیں لگائی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن اپنے خطبہ میں دعا فرمائی درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک قبلہ سمت نہ تھا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ مراد یہ ہے کہ دعا میں حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اگرچہ لفظ عام ہیں۔ (اسی طرف یہ اشارہ ہے) اور معتدی وہ ہوتا ہے جو حد سے تجاوز کرنے والا ہو اور ممنوع کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ اور کبھی وہ اس شی کے اعتبار سے فضیلت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس میں وہ حد سے تجاوز کرتا ہے (4)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیکون قوم یعتدون فی الدعاء (5) (عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے) اسے ابن ماجہ نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، جلد 1، صفحہ 287
2۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 293
3۔ سنن نسائی، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 244
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410
5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283

عفان، حماد بن سلمہ اور سعید الجریری نے ابونعامہ سے ہمیں خبر دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سے قصر ابیض کی التجا کرتا ہوں جب میں اس میں داخل ہوں۔ تو انہوں نے فرمایا: اے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کر اور جہنم سے پناہ مانگ، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے'' (1)۔

اور دعا میں حد سے بڑھنا کئی اعتبار سے ہے: ان میں سے ایک ہے بہت زیادہ بلند آواز سے اور چیخ کر دعا مانگنا (2)، جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ انسان اس بارے میں دعا مانگے کہ اس کے لیے نبی کا مقام و مرتبہ ہو یا کسی محال شے کے بارے دعا مانگے اور اسی طرح کی مبالغہ آمیز دعائیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ معصیت وغیرہ کی خواہش رکھتے ہوئے دعا مانگے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسی شے کے بارے دعا مانگے جو کتاب و سنت میں نہیں ہے۔ پس وہ انتہائی فقر آمیز الفاظ چنتا ہے اور مسجع کلمات اختیار کرتا ہے درآنحالیکہ وہ انہیں رسالوں میں پاتا ہے ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اور نہ ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، پس وہ انہیں اپنا شعار اور عادت بنالیتا ہے اور وہ ان الفاظ کو چھوڑ دیتا ہے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی۔ یہ سب چیزیں دعا کی قبولیت کے مانع ہوتی ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

''اور نہ فساد پھیلاؤ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور دعا مانگو اس سے ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے، بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکوکاروں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس میں ایک مسئلہ ہے:

وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اصلاح کے بعد چاہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہر فساد سے منع فرمایا ہے چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر۔ صحیح اقوال کے مطابق یہ حکم عام ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم چشمے دار پانی بند نہ کرو اور نقصان پہنچانے کے لیے پھل دار درخت نہ کاٹو۔ اور یہ بھی وارد ہے: زمین میں فساد سے دنانیر ختم ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین میں فساد سے حکام کی تجارت منقطع ہو گئی۔ اور علامہ قشیری نے کہا ہے: اس سے مراد ہے اور تم شرک نہ کرو، پس یہ شرک، خون بہانے اور زمین میں ہرج اور فساد برپا کرنے سے نہی ہے اور زمین میں اصلاح کے بعد احکام شریعہ کو لازم پکڑنے کا حکم ہے، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے رسول بھیج کر اس کی اصلاح فرمادی ہے، (پس یہ) شرائع کو پختہ کرنا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وضاحت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس قول کے قائل نے عظیم اصلاح کے بعد بہت بڑے فساد کا قصد کیا ہے پس اس نے اسے خاص طور پر ذکر کیا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے تو وہ اپنے عموم پر نہیں ہے، بلاشبہ وہ تب ہے جب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، جلد 1، صفحہ 283
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 410
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 411

اس میں ضرر اور نقصان مومن کا ہو۔ اور اگر اس کا ضرر اور نقصان مشرکین کو پہنچے تو پھر وہ جائز ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے کنویں کا پانی بند کیا اور آپ نے کافروں کے درخت کاٹ دیئے۔ قطع الدنانیر کے بارے میں بحث سورۃ ہود میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا یہ اس بارے امر ہے (1) کہ انسان انتظار، خوف اور اللہ تعالیٰ سے امید کی حالت میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ امید اور خوف انسان کے لیے پرندے کے دو پروں کی مثل ہوتے ہیں جو اسے صراط مستقیم میں اٹھائے رکھتے ہیں اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک منفرد ہو جائے تو انسان ہلاک ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۙ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (الحجر) (بتادو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں اور (یہ بھی بتادو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے امید بھی دلائی اور خوف بھی دلایا۔ پس انسان دعا مانگے اس کی سزا سے ڈرتے ہوئے اور اس کے ثواب کی حرص اور طمع رکھتے ہوئے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (الانبیاء: 90) (اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے) اس بارے میں گفتگو آگے آئے گی۔

خوف کا معنی ہے: الانزعاج لما لا یؤمن من المضار (اس شے کے لیے بے قرار اور بے چین ہونا جس کے ضرر اور نقصان سے وہ محفوظ نہ ہو) اور طمع کا معنی ہے: توقع المحبوب (کسی محبوب اور پسندیدہ شی کی توقع رکھنا) یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: مناسب یہ ہے کہ طویل زندگی میں خوف امید پر غالب رہے (2) اور جب موت آجائے تو پھر امید غالب رہے۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لا یموتن أحد کم إلا وھو یحسن الظن باللہ (3) (تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اس میں قریبۃ نہیں کیا، سو اس میں سات وجوہ ہیں: ان میں سے پہلی یہ ہے کہ رحمت اور رحم ایک ہی شے ہے اور یہ عفو اور غفران کے معنی میں ہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ اور نضر بن شمیل نے کہا ہے: رحمت مصدر ہے اور مصدر کا حق یہ ہے کہ وہ مذکر ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ (البقرہ: 175) یہ قول زجاج کے قول کے قریب ہے، کیونکہ مَوْعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت سے احسان کا ارادہ کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جس کی تانیث حقیقی نہ ہو تو اسے مذکر لانا جائز ہوتا ہے، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہاں رحمت سے مراد بارش ہے۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔ اور کہا ہے: اسے مذکر لانا جائز ہے جیسے بعض مؤنث کو مذکر ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ شعر بھی کہا ہے:

فلا مُزْنَةٌ وَدَقَتْ وَدْقَهَا　ولا أرضَ أبْقَلَ إبْقَالَهَا

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: مکان کی تذکیر کی بنا پر قریب مذکر ذکر کیا گیا ہے، یعنی مکانا قریبا۔ علی بن سلیمان نے کہا ہے: یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 411　2۔ ایضاً　3۔ صحیح مسلم، الجنۃ وصفۃ نعیمھا، جلد 2، صفحہ 387

خطا ہے، اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا تو پھر قرآن کریم میں قریب منصوب ہوتا، جیسے آپ کہتے ہیں: ان زیدا قریبا منك اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے نسبت کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ فرمایا: ان رحمة الله ذات قرب (بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت قرب والی ہے) جیسے آپ کہتے ہیں: امرأة طالق وحائض۔ اور فراء نے کہا ہے: جب قریب کا لفظ مسافت کے معنی میں ہو تو اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لایا جاتا ہے اور اگر نسب کے معنی میں ہو تو پھر بلا اختلاف مونث لایا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: هذه المرأة قریبتی، ای ذات قرابتی اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ نے فراء سے ذکر کیا ہے: نسب میں کہا جائے گا قریبة فلان اور غیر نسب میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہیں۔ کہا جاتا ہے: دارك منا قریب (تیرا گھر ہمارے قریب ہے) وفلانة منا قریب (اور فلانہ ہمارے قریب ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝ (الاحزاب) (اور (اے سائل)!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو) اور جس نے اس کا استدلال کیا ہے اس نے کہا ہے: اسی طرح کلام عرب بھی ہے، جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

له الوَيْلُ إن أمْسَى ولا أمّ هاشم　　قَرِيبٌ ولا البَسْبَاسَةُ ابنةُ يَشْكُرا

زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے، کیونکہ مذکر اور مونث کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دونوں اپنے افعال پر جاری ہوں۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

"اور وہی خدا ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری سناتے ہوئے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف پھر ہم اتارتے ہیں اس سے پانی پھر پیدا کرتے ہیں اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم نصیحت قبول کرو"۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ کا عطف قول باری تعالیٰ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے ایک دوسری شے کا ذکر کیا ہے اور اپنی وحدانیت اور اپنے الٰہ ہونے کے ثبوت پر دلیل بیان کی ہے۔ اور ریح کے بارے سورۃ البقرہ میں کلام گزر چکی ہے۔ ریاح جمع کثرت ہے اور ارواح جمع قلت ہے۔

اور ریح کی اصل روح ہے اور جس نے جمع قلت میں ارياح کہا ہے اس نے خطا کی ہے۔ بُشْرًا میں سات قرائتیں ہیں: اہل حرمین اور ابو عمرو نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ نُشُرًا پڑھا ہے اور یہ نسبت کے معنی کی بنا پر ناشر کی جمع ہے۔ یعنی ذات نشر (خوشخبری سنانے والی) پس یہ شاهد اور شهد کی مثل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ نشور کی جمع ہو جیسے رسول کی جمع رسل ہے۔ کہا جاتا ہے: ریح النشور جب ہوا ادھر ادھر سے آئے اور نشور بمعنی منشور ہے، جیسے رکوب بمعنی مرکوب ہے، یعنی وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اس حال میں کہ وہ پھیلی ہوئی (اور بکھری ہوئی) ہوتی ہیں۔

حسن اور قتادہ نے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ نُشْرًا پڑھا ہے اور یہ نشرا سے مخفف کیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: کتب و رسل۔ اعمش اور حمزہ نے مصدر ہونے کی بنا پر نون کے فتحہ اور شین کے سکون کے ساتھ نَشْرًا پڑھا ہے۔ اس میں اس کے ماقبل کے معنی کا عمل کیا گیا ہے۔ گویا یہ فرمایا: وھو الذی ینشر الریاح نشرا (اور وہ وہی ہے جو ہواؤں کو اچھی طرح پھیلاتا ہے) نشرتُ الشئ فانتشر (میں نے شے کو پھیلایا پس وہ پھیل گئی)

گویا کہ وہ لپٹی ہوئی تھی تو اسے ہوا کے چلنے کے وقت پھیلا دیا گیا) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو اور الریاح سے حال کے محل میں ہو۔ گویا کہ فرمایا: یرسل الریاح منشرۃ ای محییۃ (وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے درآنحالیکہ وہ خوشخبری سنانے والی یعنی زندہ کرنے والی ہوتی ہے) اور یہ أنشر اللہ المیت فنشر (اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گیا) سے ماخوذ ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أتانا رکضا، ای راکضا (وہ ہمارے پاس دوڑتے ہوئے آیا) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نشرا (فتحہ کے ساتھ) اس نشر سے ماخوذ ہے جو طی (لپیٹنا) کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، گویا کہ ہوا اپنے ساکن ہونے کی حالت میں لپٹی ہوئی شے کی مثل ہے پھر اسے اپنی حالت سے بھیجا جاتا ہے تو وہ کھلنے والی شے کی طرح ہو جاتی ہے اور ابو عبید نے متفرقۃ فی وجوھہا کے معنی کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے، (یعنی) معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ادھر ادھر پھیلا دیتا ہے۔

حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے با کے ساتھ شین کے سکون اور تنوین کے ساتھ بُشْرًا پڑھا ہے اور یہ بشیر کی جمع ہے، یعنی وہ ہوائیں جو بارش کی بشارت دیتی ہیں۔ اور اس پر شاہد رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: **وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ** (الروم: 46) ہے (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے)

شین اصل میں مضموم ہے، لیکن اسے تخفیف کے لیے ساکن کیا گیا ہے جیسے رُسُل و رُسْل۔ اور آپ سے با کے فتحہ کے ساتھ بَشْرًا بھی مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: بُشْرًا بھی پڑھا جاتا ہے اور بَشْر، بَشَر، یبشر، بمعنی بَشَّرَ کا مصدر ہے۔ یہ پانچ قرائتیں ہیں۔ محمد الیمانی نے حبلی کے وزن پر بشری پڑھا ہے اور ساتویں قراءت با اور شین کے ضمہ کے ساتھ بُشُری ہے۔

قولہ تعالیٰ: **حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا** السحاب مذکر اور مونث دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ جمع بھی ہے جس کے واحد اور اس کے درمیان ہا ہو۔ اس کی صفت واحد کے ساتھ لگانا جائز ہے پس آپ کہیں گے: سحاب ثقیل و ثقیلۃ اور معنی یہ ہے: حملت الریحُ سحاباً ثقالاً بالماء (یعنی ہوا نے پانی والے بھاری بادل کو اٹھایا) یعنی اسے اٹھانے کے سبب وہ بوجھل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے: أقل فلان الشئ یعنی فلاں نے شے اٹھائی۔ **سُقْنٰهُ** یعنی ہم بادل کو لے جاتے ہیں۔ **لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ** ایسے شہر کی طرف جس میں نباتات اور سبزہ وغیرہ نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے: سقتہ لبلد کذا والی بلد کذا (میں اسے فلاں فلاں شہر کی طرف لے گیا) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے: لاجل بلد میت (یعنی ہم اسے ویران شہر کے لیے چلاتے ہیں) یعنی یہ لام اجلیہ ہے۔ اور البلد سے مراد زمین کی ہر جگہ ہے چاہے وہ آباد ہو یا غیر آباد، وہ سکونت سے خالی ہو یا اس میں سکونت ہو۔ البلدۃ اور البلد، البلاد اور البلدان کی واحد

ہے۔ اور البلد کا معنی الأثر ہے اور اس کی جمع أبلاد ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

مِن بعدِ ما شمل البِلیٰ أبلادَھا

اور البلد سے مراد أدْحِیّ النّعام (ریت سے شتر مرغ کے انڈے دینے کی جگہ) بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: ھو أذلّ من بیضة البلد، یعنی وہ شتر مرغ کے انڈے سے بھی زیادہ ذلیل ہے جسے وہ چھوڑ دیتا ہے) اور البلدۃ سے مراد زمین ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذہ بلدتنا (یہ ہماری زمین ہے)۔

جیسے کہا جاتا ہے: بحرتنا اور البلدۃ چاند کی منازل میں سے ایک منزل بھی ہے اور وہ قوس کے چھ ستارے ہیں سال کے سب سے چھوٹے دن میں سورج اس میں اترتا ہے۔ اور البلدۃ کا معنی سینہ بھی ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلان واسع البلدۃ یعنی فلاں وسیع سینے والا ہے، جیسے شاعر نے کہا ہے:

أُنِیخَتْ فألقَتْ بَلْدَةً فوقَ بلدۃ قلیلٍ بها الأصواتُ إلّا بُغَامُها

شاعر کہہ رہا ہے: اونٹنی بیٹھی تو اس نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا۔ اور البلدۃ (با کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ) کا معنی دو بھوؤں کے درمیان پایا جانا والا فاصلہ اور کشادگی بھی ہے۔ پس یہ دونوں الفاظ مشترکہ میں سے ہیں۔ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ پھر ہم اس شہر میں پانی اتارتے ہیں، (یعنی بہ کی ضمیر کا مرجع البلد ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پھر ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں (یعنی ضمیر کا مرجع السحاب ہے) کیونکہ سحاب (بادل) پانی برسانے کا آلہ اور ذریعہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو فأنزلنا منه الماء (یعنی با بمعنی من ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (الدھر: 6) یعنی اس میں بِهَا بمعنی منہا ہے۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔ ای مثل ذالك الإخراج نحیي السوتی یعنی ان پھلوں کو نکالنے کی مثل ہم مردوں کو زندہ کریں گے۔ امام بیہقی وغیرہ نے ابو رزین العقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ مخلوق کو دوبارہ کیسے اٹھائے گا؟ اور اس کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو اپنی قوم کی وادی سے اس حال میں نہیں گزرا کہ وہ خشک اور قحط زدہ تھی اور پھر تو اس کے پاس سے اس حال میں گزرا کہ وہ سبزے لہرا رہی ہو؟''۔ عرض کی: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتلك آیة اللہ فی خلقه پس یہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ان کا اپنی قبروں میں احیاء اس بارش کے سبب ہوگا جسے اللہ تعالیٰ ان کی قبور پر برسائے گا تو ان کی قبریں شق ہو جائیں گی، پھر ان کی طرف ارواح لوٹ آئیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے جسے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''پھر اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا''۔ یا فرمایا ''اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا وہ شبنم کی طرح ہوگی اور اس کے سبب لوگوں کے جسم ظاہر ہو جائیں گے، پھر کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ۔ وہ وہاں ٹھہر جائیں گے اور اس سے باز پرس کی جائے گی''۔ آگے حدیث ذکر کی۔ اور ہم نے اسے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں مکمل ذکر کیا ہے۔ والحمد للہ۔ پس یہ بعث ونشور پر

دلیل ہے (1) اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی امور لوٹائے جائیں گے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

''اور جو سرزمین عمدہ و زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا، اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو شکر گزار ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا اس میں الْبَلَدُ الطَّيِّبُ سے مراد عمدہ اور زرخیز سرزمین ہے۔ اور خبیث وہ زمین ہے جس کی مٹی میں پتھر یا کانٹے ہوں۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد تشبیہ دینا ہے (یعنی) اللہ تعالیٰ نے تیز فہم کو عمدہ اور زرخیز سرزمین سے تشبیہ دی ہے اور کند ذہن (اور کمزور فہم) کو خبیث سے، یہ نحاس سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی مثال ہے، پس ایک دل وہ ہے جو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے (وہ طیب اور پاکیزہ ہے) اور ایک فاسق دل ہوتا ہے جو اسے قبول نہیں کرتا (وہ خبیث ہوتا ہے) یہ قول بھی حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مومن کی مثال ہے جو اخلاص اور اطاعت شعاری کے ساتھ عمل کرتا ہے اور منافق کی مثال ہے جس میں اخلاص نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان (2) ہے! اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو خوبصورت سینگ پائے گا تو وہ یقیناً عشاء میں حاضر ہو''۔ نَكِدًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس سے مراد وہ تنگی ہے جو خیر (خوشحالی) لانے سے مانع اور رکاوٹ ہو، اور یہ ایک تمثیل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اولاد آدم میں طیب بھی ہیں اور خبیث بھی۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے إِلَّا نَكْدًا پڑھا ہے اور ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے۔ ابن القعقاع نے نَكَدًا کاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی ذا نکد مصدر ہے۔ جیسے کسی کا قول ہے:

فانما هي اقبال وادبار

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نکد اکا لفظ کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ایک ہی معنی میں ہے جیسا کہ دنِف اور دنَف اور یہ دو لغتیں ہیں۔ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ یعنی جیسا کہ ہم نے کئی طریقوں سے بیان کیا ہے اور یہی شرک کے بطلان میں حجج اور دلائل ہیں۔ اسی طرح ہم ہر اس شے میں علامات اور نشانیاں بیان کرتے ہیں جن کے لوگ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ یہاں شکر کرنے والے کی تخصیص فرمائی کیونکہ اس سے نفع وہی حاصل کرتے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، الفتن و اشراط الساعۃ، جلد 2، صفحہ 403　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 89

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

''بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اللہ کے سوا، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آ جائے''۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ جب یہ بیان کیا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) خالق بھی ہے اور کمال پر قادر بھی تو اس نے کئی امتوں کے قصص اور واقعات بیان کیے اور ان میں کفار کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے والی چیزوں کا ذکر کیا۔ لقد میں لام تاکید کے لیے ہے جو قسم پر متنبہ کرتی ہے۔ اور فا اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ دوسری (شے) اوّل کے بعد ہے۔

يٰقَوْمِ اس میں منادی مضاف ہے۔ اور اسے اپنے اصل پر رکھتے ہوئے یا قومی پڑھنا بھی جائز ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کی حرمت کا حکم لے کر زمین پر مبعوث ہوئے۔ نحاس نے کہا ہے: لفظ نوح منصرف ہے، کیونکہ اس میں حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے ناح ینوح سے مشتق مان لیا جائے۔ یہ معنی اس کے علاوہ دوسرا مفہوم سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: مورخین میں سے حسن نے یہ کہا ہے کہ حضرت ادریس علیہ اسلام آپ سے پہلے تھے۔ اسے وہم ہوا ہے اور اس کے وہم کی صحت پر دلیل صحیح حدیث ہے کہ جب شب معراج حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان الفاظ کے ساتھ استقبال کیا: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے) اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: مرحباً بالنبی الصالح والاخ الصالح (خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی) تو اگر حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ اسلام کے باپ ہوتے تو یقیناً اس طرح کہتے: مرحباً بالنبی الصالح والابن الصالح مگر جب انہوں نے الاخ الصالح کہا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام میں جمع اور اکٹھے ہیں، صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ اور اس کے بعد کسی منصف کے کلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اس مقام پر آباء جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب سے جواب ان الفاظ میں آیا ہے: مرحباً بالابن الصالح اور حضرت ادریس علیہ السلام نے کہا: بالاخ الصالح جیسا کہ حضرات موسیٰ، عیسیٰ، یوسف، ہارون اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کی جانب سے ذکر کیا گیا ہے اور بالاتفاق ان میں سے کوئی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ نہیں ہے۔ اور مازری نے بیان کیا ہے: تحقیق مورخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے جد امجد تھے، پس اگر اس پر دلیل قائم بھی ہو جائے کہ حضرت

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 785

ادریس علیہ السلام بھی مبعوث کیے گئے تو پھر بھی ان کا قول صحیح نہیں ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے ہونے کی طرف آپ کی نسبت کرتے ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کے اس قول کی خبر دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو مبعوث فرمائے گئے اور اگر دلیل قائم نہ ہو تو پھر وہ جائز ہے جو انہوں نے کہا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس معنی پر محمول کیا جائے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نبی غیر مرسل تھے۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے درمیان تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ یہ کہا جائے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تمام اہل زمین کے لیے مختص تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے، جیسا کہ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام کی نبوت فقط اپنی قوم کے لیے تھی جیسا کہ حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط وغیرہم علیہم الصلوات والتسلیمات کی تھی۔ اور بعض نے اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ (الصافات) (اور بے شک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں (یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟)

اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام ہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اور اس طرح بھی پڑھا گیا ہے: سلام علی ادراسین حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالحسن بن بطال کو دیکھا ہے کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام رسول نہیں تھے کہ وہ اس اعتراض سے محفوظ رہیں۔

اور حضرت ابوذر الطویل کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام دونوں رسول ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: انہیں اس طرح اکٹھا اور جمع کیا جاسکتا ہے (1) کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت لوگوں کی اصلاح کے لیے مشہور ہے اور آپ نے انہیں عذاب اور ہلاکت کے خوف سے ایمان پر ابھارا اور برانگیختہ کیا، پس مراد یہ ہے کہ آپ وہ پہلے نبی ہیں جو اس صفت پر مبعوث کیے گئے۔ واللہ اعلم

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام کے آٹھ سو برس بعد آپ کی بعثت ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: آپ ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو دعوت حق دیتے رہے، جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ پھر آپ طوفان کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ زیادہ ہو گئے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

وہب نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اس وقت آپ کی عمر پچاس برس تھی۔ عون بن شداد نے کہا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی اس وقت آپ کی عمر ساڑھے تین سو برس تھی۔ ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ اب تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ نقاش نے سلیمان بن ارقم سے اور انہوں نے زہری سے بیان کیا ہے کہ عرب، فارس، روم، اہل شام اور اہل یمن سام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ سندھ، ہند، زنج، حبشہ، زط، نوبہ اور سیاہ جلد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 416

والے تمام حام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ ترک، بربر، چین سے آگے کے لوگ، یاجوج ماجوج اور صقالبہ تمام کے تمام یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔ اس طرح تمام مخلوق حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے (1)۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، غَيْرُهٗ کی قراءت رفع کے ساتھ حضرت نافع، ابو عمرو، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی قراءت ہے یعنی مالکم الٰہ غیرہ یہ محلاً صفت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیر بمعنی الا ہے، یعنی مالکم من الٰہ الا اللہ۔ ابو عمرو نے کہا ہے: میں نہ خبر کو پہچانتا ہوں اور نہ نصب کو۔ کسائی نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جر کے ساتھ پڑھا ہے اور استثنا کی بنا پر نصب بھی جائز ہے اور یہ زیادہ نہیں ہے، مگر امام کسائی اور فراء نے ہر اس جگہ میں جائز قرار دی ہے جس میں الا اچھا اور حسین لگتا ہے چاہے کلام مکمل ہو یا مکمل نہ ہو، پس ان دونوں نے ماجاءنی غیرك کو جائز قرار دیا ہے۔ فراء نے کہا ہے: یہ بعض بنی اُسد اور قُضاعہ کی لغت ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

لم يَمْنَعِ الشُّرْبَ منها غيرَ أن هتفَتْ　　حمامةٌ في سَحُوق ذاتِ أو قَالِ

امام کسائی نے کہا ہے: جاءنی غیرك حالت ایجاب میں کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں الا واقع نہیں ہو سکتا۔ اور نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک غیر پر نصب جائز نہیں ہوتی جب تک کلام مکمل نہ ہو۔ اور یہ ان کے نزدیک قبیح ترین غلطی ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

”ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: (اے نوح!) ہم دیکھتے ہیں تمہیں کھلی گمراہی میں۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! نہیں ہے مجھ میں ذرا گمراہی، بلکہ میں تو رسول ہوں سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تمہیں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے“۔

الْمَلَاُ سے مراد قوم کے اشراف اور ان کے رؤساء ہیں۔ اس کا بیان پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور الضلال اور الضلالۃ کا معنی ہے راہ حق سے پھر جانا اور اس سے ہٹ جانا، یعنی بلاشبہ ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمیں ایک خدا کی طرف دعوت دینے میں راہ حق سے پھرے ہوئے ہو۔ اُبَلِّغُكُمْ یہ تشدید کے ساتھ ہو تو التبلیغ سے ماخوذ ہے۔ اور تخفیف کے ساتھ ہو تو الابلاغ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں اور دو لغتیں ہیں، جیسا کہ کرمھا اور اکرمہ ہیں۔

وانصح لکم یہ النصح سے ہے اور اس کا معنی ہے: معاملات میں نیت کا فساد کی آمیزش سے خالص اور پاک ہونا، بخلاف غش (ملاوٹ) کے۔

کہا جاتا ہے: نصحتُه و نصحتُ له نصيحةً و نصاحةً و نصحًا اور یہ لام کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْصَحُ لَكُمْ اس کا اسم النصیحۃ ہے۔ النصیح کا معنی ہے الناصح (نصیحت کرنے والا) اور قوم نصحاء (نصیحت

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الصافات، حدیث نمبر 3154، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ المحرر الوجیز

کرنے والی قوم) اور رجل ناصح الجیب اس کا معنی ہے صاف دل آدمی۔ اصمعی نے کہا ہے: الناصح کا معنی خالص چاہے شہد ہو یا کوئی اور شے ہو، جیسا کہ الناصع ہے اور ہر وہ شی جو خالص ہو وہ نصح ہے۔ اور انتصح فلان کا معنی ہے فلاں نصیحت کی طرف متوجہ ہوا (یعنی اس نے نصیحت قبول کی)۔ کہا جاتا ہے: انتصحنی انّنی لک ناصح (تو میری نصیحت کی طرف توجہ کر بلاشبہ میں تجھے نصیحت کر رہا ہوں) اور الناصح، خیاط (درزی) کو بھی کہتے ہیں۔ اور النصاح سے مراد وہ دھاگہ ہے جس کے ساتھ سیا جاتا ہے۔ اور النصاحات سے مراد جلود (جلدیں اور چمڑے) بھی ہیں۔ اعشی نے کہا ہے:

فَتَرَی الشُّرْبَ نَشَاوَی کلھم مثل ما مُدَّتْ نِصاحاتُ الرُّبَحِ

الرُّبَحُ لغوی طور پر الرُّبَع کے معنی میں ہے اور یہ اونٹ کا بچہ ہوتا ہے اور الرُّبَح پرندہ بھی ہے، اس کے مزید معنی سورۂ برأت میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

”کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعہ جو تم میں سے ہے تاکہ وہ ڈرائیں تمہیں (غضب الٰہی سے) اور تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے، پھر بھی انہوں نے جھٹلایا نوح کو تو ہم نے نجات دی ان کو اور جو آپ کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے غرق کر دیا ان (بدبختوں) کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، بے شک وہ لوگ دل کے اندھے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ عَجِبْتُمْ اس میں واؤ کو فتحہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ واؤ عاطفہ ہے(1)، اس پر الف استفہام تقریر کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ اور واؤ کا طریقہ یہ ہے کہ یہ حروف استفہام پر داخل ہوتی ہے سوائے الف کے اس کی قوت کے سبب (یعنی الف پر یہ داخل نہیں ہو سکتی) اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی۔ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ یعنی علی لسان رجل (ایک آدمی کی زبان پر) اور یہ بھی کہا گیا ہے: علی بمعنی مع ہے یعنی مع رجل (ایک آدمی کے ذریعہ) اور یہ قول بھی ہے: اس کا معنی ہے تمہارے اس رب کی طرف سے نصیحت آئی جو تم میں سے ایک آدمی پر نازل کی گئی ہے، یعنی تم اس آدمی کے نسب کو جانتے ہو، یعنی ایسے آدمی پر جو تمہاری جنس میں ہے۔ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو بسا اوقات اختلاف جنس میں مزاجوں میں باہم منافرت اور تضاد ہوتا۔ اور الفلك واحد بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی۔ سورۃ البقرہ میں اس کے بارے گزر چکا ہے۔ عَمِيْنَ یعنی وہ لوگ حق (کی پہچان) سے اندھے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کی پہچان اور معرفت سے اندھے ہیں، کہا جاتا ہے: رجلٌ عَمٍ بکذا یعنی آدمی اس سے جاہل ہے۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 169

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ۝ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا کیا تم نہیں ڈرتے؟ کہنے لگے وہ سردار جو کافر تھے آپ کی قوم سے کہ (اے ہود!) ہم تو خیال کرتے ہیں کہ تم بڑے نادان ہو اور ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ہود نے کہا: اے میری قوم! نہیں مجھ میں ذرا نادانی بلکہ میں تو رسول ہوں رب العالمین کی طرف سے، پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں تو تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جو دیانتدار ہو۔ کیا تم تعجب کرتے ہو کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ ڈرائے تمہیں؟ (عذاب الٰہی سے) اور یاد کرو جب اس نے بنا دیا تمہیں جانشین قوم نوح کے بعد اور بڑھا دیا تمہیں جسمانی لحاظ سے قد و قامت میں تو یاد کرو اللہ (تعالیٰ) کی نعمتوں کو شاید تم کامیاب ہو جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ کے بیٹے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ قبیلہ میں ان کے بھائی تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک بشر (اور انسان) تھے۔ اور مصنف ابی داؤد میں ہے کہ اَخَاهُمْ هُوْدًا کا معنی ہے ان کے ساتھ ہود علیہ السلام (کو ان کی طرف بھیجا) اور عاد سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ابن اسحاق نے نسب اس طرح بیان کیا ہے: وعاد هو ابن عوص بن ارم بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیه السلام (1) اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب اس طرح ہے: هود شر هود بن عبد الله بن رباح بن الجلود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح (2)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عاد کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ آپ نسب کے اعتبار سے ان میں سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے ان سے افضل تھے۔

اور عاد کو جس نے منصرف نہیں بنایا اس نے اسے قبیلہ کا نام قرار دیا اور جس نے اسے منصرف قرار دیا ہے اس نے اسے محلے کا نام قرار دیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں ہے: عاد الاولی یہ بغیر الف

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 489　2۔ ایضاً

کے ہے۔ اور ہود عجمی لفظ ہے اور یہ اپنے خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ عربی ہو اور ھاد یھود سے مشتق ہو۔ اور اس پر نصب (زبر) بدل ہونے کی وجہ سے ہو۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان سات آباء کا فاصلہ تھا۔ اور روایت ہے کہ عاد کے تیرہ قبیلے تھے، وہ ٹیلوں پر اترتے تھے، ان میں سے ایک عالج کا ٹیلہ تھا۔ ان کے پاس باغات، کھیتیاں اور بڑی بڑی عمارتیں تھیں اور ان کے شہر بڑے سرسبز و شاداب تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہو گیا تو اس نے اس سرزمین کو جنگل بنا دیا اور یہ حضرموت کے نواح سے یمن تک تھی اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو ہلاک کر دیا تو حضرت ہود علیہ السلام ان لوگوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے جو آپ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور پھر وہ وہیں رہے یہاں تک کہ وصال فرما گئے۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ یعنی بلاشبہ ہم آپ کو نادان اور کم عقل دیکھ رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

مَشَيْنَ كما اهتزّتْ رِماحٌ تسفّهتْ أعاليها مَرُّ الرياحِ النّواسِمِ(1)

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں رؤیت سے مراد رؤیۃ البصر (آنکھ کی بصارت ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد وہ رائے ہے جو ظن غالب ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ اس میں خُلَفَآءَ مذکر اور معنی کی بنا پر خلیفہ کی جمع ہے اور لفظ کی بنا پر خلائف کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان یہ فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد انہیں زمین کا باسی بنا دیا۔ وَّزَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً اور یہ بھی جائز ہے کہ بَصْطَةً صاد کے ساتھ ہو، کیونکہ اس کے بعد طا ہے، یعنی قد و قامت کے اعتبار سے طویل اور جسم کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور عظیم الجثہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے (قدوں کی) زیادہ طوالت سو ذراع تھی (2)۔ اور ان میں سے جو چھوٹے قد کے تھے ان کی طوالت ساٹھ ذراع تھی۔ اور یہ زیادتی ان کے آبا کی تخلیق اور قد و قامت پر تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیادتی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے قد و قامت پر تھی۔ وہب نے کہا ہے: ان میں سے کسی ایک کا سر عظیم اور بڑے قبہ کی مثل تھا۔ اور آدمی کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں درندہ بچے دے سکتا تھا اور اسی طرح ان کی ناک کے نتھنے تھے (3)۔ شہر بن حوشب نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قوم عاد کا ایک آدمی پتھر سے (دروازے کے) دو کواڑ بناتا تھا کہ اگر اس امت کے پچاس آدمی اس پر جمع ہو جائیں تو وہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی اپنے پاؤں کے ساتھ زمین کو زور سے دباتا تو وہ اس میں گھس جاتا۔

فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ الاء کی واحد إلی، إلی، إلو اور ألی ہے، جیسا کہ آناء کی واحد إنی، إنی، إنو اور أنی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 417 2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 170 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 491

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۞ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞

"وہ کہنے لگے (اے ہود!) کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس کہ ہم عبادت کریں ایک اللہ کی اور چھوڑ دیں ان (معبودوں) کو جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا۔ سو لے آؤ ہم پر وہ (عذاب) جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود (علیہ السلام) نے کہا: واجب ہو گیا تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب کیا تم جھگڑا کرتے ہو مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (حالانکہ) نہیں اتاری اللہ نے ان کے لیے کوئی سند، سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ پھر ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ان کے ہمراہ تھے اپنی خاص رحمت سے اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور نہ تھے وہ ایمان لانے والے"۔

تو آپ نے انہیں فرمایا: قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ تحقیق تم پر واجب ہو گیا، اس میں وَقَعَ بمعنی وجب ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع القول والحکم یعنی قول اور حکم واجب ہو گیا اور اسی کی مثل یہ آیت ہے: وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ (الاعراف: 134) یعنی جب ان پر عذاب نازل ہوا۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ (النمل: 82) (اس میں بھی وقع بمعنی وجب ہے) اور الرجس کا معنی عذاب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجس سے مراد وہ زنگ ہے جو کفر کی زیادتی کے سبب دل پر جم جاتا ہے۔ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ (الاعراف: 71) اس میں اسماء سے مراد وہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور ان کے نام مختلف تھے۔

مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے بارے میں تمہارے لیے کوئی حجت اور دلیل نازل نہیں کی۔ یہاں اسم بمعنی مسمی ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ (یوسف: 40) اور یہ اسماء مثلاً عزی یہ العز اور الاعز سے بنا ہے اور اللات وغیرہ ہیں۔ ان کے لیے عزت اور الوہیت میں سے کوئی شے نہیں۔ دابر اس سے مراد آخر (یعنی جڑ) ہے یہ پہلے گزر چکا ہے یعنی ان کے لیے کوئی شے باقی نہ رہی۔

وَاِلٰي ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞

"اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ آپ نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ

تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا۔ بے شک آچکی ہے تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب دردناک"۔

ثمود سے مراد ثمود بن عاد بن ارم بن سام بن نوح ہے۔ اور یہ جدیس کا بھائی تھا، معاشی طور پر یہ لوگ خوشحال تھے، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف عمل کیا اور غیر اللہ کی عبادت اور پوجا کی اور زمین میں فساد برپا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا۔ اور آپ کا نسب اس طرح تھا صالح بن عبید بن آسف بن کاشح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔ اور یہ عرب قوم تھے، آپ ان میں نسب کے اعتبار سے اعلیٰ اور حسب کے اعتبار سے افضل تھے۔ پس آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی یہاں تک کہ آپ بوڑھے ہو گئے اور ان میں سے سوائے کمزور لوگوں کی قلیل تعداد کے انہوں نے آپ کی اتباع نہ کی۔ ثمود کا لفظ غیر منصرف ہے، کیونکہ اسے قبیلے کا نام بنایا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ عجمی اسم ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ یہ الثمد سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے قلیل پانی۔

تحقیق قراء نے اس طرح پڑھا: اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ (ہود: 68) کیونکہ یہ چھوٹے قبیلہ (یا محلہ) کا نام ہے۔ اور قوم ثمود کی رہائش گاہیں حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ کی جانب مقام حجر پر تھیں اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کا نام ثمود رکھا گیا۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً جب انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا تو آپ نے سخت پتھر سے ان کے لیے اونٹنی نکالی۔ تو ایک دن اس کے لیے تھا جس میں وہ وادی کا سارا پانی پی جاتی تھی اور انہیں اسی کی مثل دودھ دیتی تھی کہ اس سے زیادہ لذیذ اور شیریں دودھ کبھی بھی کسی نے نہیں پیا۔ اور وہ ان کی کثرت کے باوجود ان کی حاجت اور ضرورت کے مطابق ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ (الشعراء: 155) اس میں ناقۃ کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس بنا پر کہ خلق (مخلوق) کی نسبت خالق کی طرف ہے۔ اور اس میں تشریف اور تخصیص کا معنی پایا جاتا ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ یعنی تم پر نہ اس کا رزق (خوراک) ہے اور نہ اس کی کوئی مشقت اور بوجھ۔

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۷۴﴾

"اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنایا تمہیں جانشین عاد کے بعد اور ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں تم بناتے ہو اس کے میدانی علاقوں میں عالی شان محل اور تراشتے ہو، پہاڑوں میں مکانات، سو یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ اس میں کلام محذوف ہے، اصل عبارت ہے وبوّأکم فی الأرض منازل (اور اس نے تمہیں زمین میں گھروں کا ٹھکانا دیا) تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا یعنی تم ہر جگہ عالیشان محل بناتے ہو۔ وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا انہوں نے پہاڑوں میں اپنی طویل اور لمبی عمروں کے لیے مکانات بنائے، کیونکہ چھت اور بنیادیں ان کی عمریں ختم ہونے سے پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حسن نے حا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے اور اس میں حروف حلقیہ میں سے ایک ہے، پس اسی لیے یہ باب فعل یفعل کے وزن پر آیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے عالی شان اور بلند و بالا محلات بنانے کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف: 32) (آپ فرمایئے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کیا اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے گھر تعمیر کیا اور اس پر مال کثیر خرچ کیا، جب اس کا ذکر حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ کوئی آدمی ایسا مکان بنائے جو اس کے لیے نفع بخش ہو۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا أنعم الله علی عبد أحب أن یری أثر النعمة علیه (1) (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر احسان و انعام فرمائے تو پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اس نعمت و احسان کا اثر دکھائی دے) اور نعمت و احسان کے آثار میں سے خوبصورت مکان اور اچھا لباس ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اگر کوئی مال کثیر کے عوض حسین و جمیل کنیز خریدے تو اس کے لیے جائز ہے، حالانکہ اس سے کمتر بھی اس کے لیے کافی ہو سکتی ہے، تو یہ مکان اور محل بھی اسی طرح ہیں۔ لیکن بعض ... مروں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ ان میں امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے استدلال کیا ہے: إذا أراد الله بعبد شرا أهلك ماله فی الطین واللبن (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے شر کا ارادہ فرمائے تو وہ اپنا مال مٹی اور اینٹوں میں ضائع کر دیتا ہے) اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بنی فوق ما یکفیه جاء به یوم القیامة یحمله علی عنقه (2) (جس نے اپنی حاجت اور ضرورت سے زیادہ عمارت بنائی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے بارے اسی طرح میں کہتا ہوں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وما أنفق المؤمن من نفقة فإن خلفها علی الله عزوجل إلا ما کان فی بنیان أو معصیة (3) (بندہ مومن جو مال بھی خرچ کرے تو اس کی جگہ اور عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہوتا ہے سوائے اس کے جو عمارت یا معصیت (برائی) میں خرچ ہو) اسے حضرت جابر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیئذان والادب، جلد 2، صفحہ 105۔ ایضاً، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مجمع الزوائد، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 121، حدیث نمبر 6281

3۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 28

بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے اسے نقل کیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لیس لابن آدم حق فی سوی هذه الخصال بیت یسکنه و ثوب یواری عورته و جلف الخبز والماء، اخرجه الترمذی (1) (آدمی کا ان چیزوں کے سوا میں کوئی حق نہیں گھر جو اسے رہائش کے کافی ہو، کپڑا جو اس کے لیے ستر عورت کا کام دے، خشک روٹی اور پانی) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار بھی منعم علیہم ہیں۔ اس کے بارے بحث سورہ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ سورۃ البقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ اس میں العثی اور العثو دو لغتیں ہیں۔ اور اعمش نے تا کے کسرہ کے ساتھ تِعثوا پڑھا ہے انہوں نے اسے عثی یعثی سے لیا ہے نہ کہ عثا یعثو سے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۷۵ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۷۶

''کہا ان سرداروں نے جو تکبر کیا کرتے تھے ان کی قوم سے ان لوگوں کو جنہیں وہ کمزور و ذلیل سمجھتے تھے جو ان میں سے ایمان لائے تھے کیا تم یقین رکھتے ہو کہ صالح رسول ہے اپنے رب کی طرف سے۔ انہوں نے کہا: بے شک ہم اس پر جسے دے کر انہیں بھیجا گیا ہے ایمان لانے والے ہیں۔ کہنے لگے وہ لوگ جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو اس چیز کے جس پر تم ایمان لائے ہو منکر ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اس میں دوسرا پہلے سے بدل ہے، کیونکہ وہ مستضعفین (جنہیں وہ کمزور سمجھتے تھے) مومنین ہی تھے اور یہ بدل بعض من الکل ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۷۷ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝۷۸ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝۷۹

''پس انہوں نے کونچیں کاٹ ڈالیں اس اونٹنی کی اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے اور کہا: اے صالح! لے آؤ ہم پر اس (عذاب) کو جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اگر تم اللہ کے رسولوں سے ہو۔ پھر آلیا انہیں زلزلہ کے جھٹکوں نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ تو (صالح) نے منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور (بصد حسرت) کہا: اے میری قوم! بے شک پہنچا دیا میں نے تم کو پیغام اپنے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57

رب کا اور میں نے خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم تو پسند ہی نہیں کرتے (اپنے) خیر خواہوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: فَعَقَرُوا النَّاقَةَ، العقر کا معنی ہے زخمی کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عضو کو کاٹ دینا جو اس کی جان میں اثر انداز ہو۔ اور عقرتُ الفرس تب کہا جاتا ہے جب تو تلوار کے ساتھ اس کے پاؤں پر ضرب لگائے۔ وہ خیل عقری ہے۔ اور عقرت ظهر الدابة جب تو جانور کی پشت کو زخمی کر دے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

تقولُ وقدْ مالَ الغَبِيطُ بنا معاً　عَقَرْتَ بعيري يا امرأ القيس فانْزِلِ

یعنی تو نے میرے اونٹ کو زخمی کر دیا۔

قشیری نے کہا ہے: عقر سے مراد اونٹ کی کونچ کو کھولنا یعنی کاٹنا ہے۔ پھر نحر کو عقر کہا گیا ہے، کیونکہ عقر اکثر نحر (جان سے مار دینا) کا سبب بن جاتا ہے۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ان میں صحیح ترین وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ کا ذکر بھی کیا اور اس کا بھی جس نے اس کی کونچیں کاٹی تھیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تب ان میں سے سب سے بدبخت انسان اٹھا ناقہ کی طرف وہ آدمی اٹھا جو اپنے گروہ میں غالب، انتہائی خبیث اور شریر اور سب سے زیادہ طاقتور تھا جیسے ابوزمعہ ہے" (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اس کے نام کے بارے کہا گیا ہے کہ قدار بن سالف ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی حکمرانی ایک عورت کے پاس تھی جسے ملکی کہا جاتا تھا، جب لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف مائل ہونے لگے تو اس کے دل میں آپ کے بارے حسد کی آگ بھڑک اٹھی، تو اس نے دو عورتوں کو بلا کر کہا۔ ان دونوں کے دو دوست تھے جو ان سے عشق کرتے تھے کہ تم دونوں ان کی بات تسلیم نہ کرو اور ان سے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بارے مطالبہ کرو، تو ان دونوں عورتوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ دونوں مرد نکلے اور انہوں نے اونٹنی کو ایک تنگ جگہ میں بند کر دیا اور ان میں سے ایک نے اسے تیر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ اور اس ناقہ کا بچہ سقب اس چٹان کی طرف آیا جس سے وہ نکلی تھی اور تین دفعہ ڈکارا (یعنی اپنی آواز نکالی) وہ چٹان پھٹ گئی اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔

کہا جاتا ہے: یہ وہی دابة (جانور) ہے جو آخری زمانہ میں لوگوں پر ظاہر ہوگا۔ اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: جن لوگوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹی تھیں ان میں سے چار افراد نے سقب کا پیچھا کیا، ان میں سے ایک مصدع اور ایک اس کا بھائی ذؤاب تھا۔ تو مصدع نے اسے تیر مارا اور وہ اس کے دل میں پیوست ہو گیا پھر اسے ٹانگ سے کھینچ لیا اور اسے اپنی ماں کے ساتھ ملا دیا (یعنی مار ڈالا) اور انہوں نے اسے اس (ناقہ) کے ساتھ کھایا (2)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا: بلاشبہ تمہاری عمر سے تین دن باقی ہیں، اسی وجہ سے وہ تین بار ڈکارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ناقہ کی کونچیں کاٹنے والے نے ہی اسے مارا اور اس کے ساتھ آٹھ آدمی تھے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ (النمل: 48) (اور اس شہر میں نو شخص تھے) اس کا بیان سورۃ النمل

1۔ صحیح مسلم، الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 383　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 501

میں آئے گا۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا معنی ہے۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ (القمر) (پس ثمودیوں نے بلایا اپنے ایک ساتھی (قدار) کو پس اس نے وار کیا اور (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں)

وہ شراب پی رہے تھے تو پانی ان کے لیے کم ہو گیا کہ وہ اسے اپنی شراب میں ملا سکیں اور وہ ناقہ کے دودھ کا دن تھا، پس ان میں سے ایک اٹھا اور لوگوں کی نگرانی کرنے لگا اور اس نے کہا: میں ضرور اس سے لوگوں کو راحت پہنچاؤں گا۔ تو اس نے اسے مار ڈالا۔

قولہ تعالیٰ: وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ یعنی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے تکبر کیا۔ عَتَا یَعْتُو عُتُوًّا کا معنی ہے تکبر کرنا، سرکشی کرنا۔ اور جب کوئی اطاعت اور پیروی نہ کرے تو کہا جاتا ہے: تَعَتّٰی فلان اور اللیل العاتی کا معنی ہے: سخت تاریک رات۔ خلیل نے یہی معنی بیان کیا ہے۔

وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اور انہوں نے کہا: اے صالح! لے آؤ وہ عذاب جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پس شدید زلزلے نے انہیں آلیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ شدید چیخ تھی جس نے ان کے دلوں کو کاٹ دیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ثمود کے قصہ میں ہے۔ قصہ ثمود میں ہے کہ پھر چیخ نے انہیں آلیا۔

کہا جاتا ہے: رَجَفَ الشیئُ یَرْجُفُ رَجْفًا رَجَفَانًا (کسی شی کا کانپنا، لرزہ براندام ہونا) اور أرجفتِ الریحُ الشجرکا معنی ہے: ہوا نے درخت کو حرکت دی، ہلا دیا۔ اور اس میں اصل وہ حرکت ہے جس کے ساتھ آواز بھی ہو۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ (النازعات)

شاعر کا قول بھی ہے:

ولما رأيت الحج قد آن وَقتُه　　وظلت مطايا القوم بالقوم تَرْجُفُ

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ پس وہ اپنے گھروں میں ہو گئے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں لفظ دار جنس کے طور پر واحد لایا گیا ہے، حالانکہ یہ فی دورھم کے معنی میں ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا ہے: فِيْ دِيَارِهِمْ (ہود: 94) یعنی اپنے گھروں میں جٰثِمِيْنَ یعنی اپنے گھٹنوں اور مونہوں کے بل زمین کے ساتھ چپکنے والے (گرنے والے) جیسا کہ پرندہ چپک جاتا ہے، یعنی وہ عذاب کی شدت سے مر گئے۔ جثوم کا اصل لفظ خرگوش اور اس کی مثل جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چپکنے کی جگہ کو مجثم کہا جاتا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

بها العِينُ والآرامُ يَمْشِين خِلْفَة　　وأطلاؤها يَنْهَضْنَ مِنْ كل مَجْثَمِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بجلی کی وہ کڑک کے ساتھ جل گئے اور ان تمام نے سوائے ایک آدمی کے صبح مردہ حالت میں کی وہ آدمی اللہ تعالیٰ کے حرم میں موجود تھا، پس جب وہ حرم پاک سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی آفت آئی جو اس کی قوم پر آئی (1)۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ پس آپ نے ان سے مایوس ہو کر ان سے چہرہ پھیر لیا۔

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ قول ان کی موت سے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفئی الخ، حدیث نمبر 2684، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہلے کہا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی موت کے بعد آپ نے یہ کہا ہو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقتولین بدر کو یہ کہا: هل وجد تم ما وعد ربکم حقا (1) (کیا تم نے اسے سچا پا لیا ہے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: کیا آپ ان مردوں سے گفتگو فرما رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أنتم بأسمع منهم ولكنهم لا يقدرون على الجواب (2) (تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن وہ جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے) اس میں پہلا احتمال زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ اور اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ یعنی تم نے میری نصیحت قبول نہیں کی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب انہوں نے کہا اپنی قوم سے کہ کیا تم کیا کرتے ہو ایسی بے حیائی (کا فعل) جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا ساری دنیا میں"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ امام فراء نے کہا ہے: لوط ان کے اس قول سے مشتق ہے: هذا أليط بقلبي، اى ألصق یعنی یہ میرے دل کے ساتھ چمٹ گیا۔ نحاس نے کہا ہے: زجاج نے کہا ہے: بعض نحویوں یعنی فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ جائز ہے کہ لوط لطت الحوض سے مشتق ہو اور یہ تب کہا جاتا ہے جب تو حوض کو مٹی کے ساتھ لیپ کرے۔ فرمایا: یہ غلط ہے کیونکہ عجمی اسماء مشتق نہیں ہوتے جیسے اسحاق وغیرہ، پس یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ سحق بمعنی بعد سے ہے۔ لوط کا لفظ خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہے، کیونکہ اس کے حروف تین ہیں اور درمیان والا حرف ساکن ہے۔

نقاش نے کہا ہے: لوط عجمی اسماء میں سے ہے عربی میں سے نہیں ہے۔ اور رہے اس سے لطت الحوض اور هذا أليط بقلبي تو یہ صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود اسم عجمی ہے جیسا کہ ابراہیم اور اسحاق وغیرہ۔ سیبویہ نے کہا ہے: نوح اور لوط عجمی اسماء ہیں، مگر خفیف ہونے کی وجہ سے منصرف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت کی طرف بھیجا جس کا نام سدوم تھا، اور آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی کے بیٹے تھے۔ اور اس کے آخر میں نصب یا تو سابقہ اَرْسَلْنَا کی وجہ سے ہے اور یہ اس پر معطوف ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اور اس سے پہلے اذکر فعل محذوف ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ اس میں فاحشہ سے مراد مذکروں کے ساتھ فعل بد کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فاحشہ کے لفظ کے ساتھ کیا ہے تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ یہ زنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (الاسراء: 32) (تم زنا کے قریب نہ جاؤ بلاشبہ یہ بے حیائی ہے)

علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے جو اس پر واجب ہوگا جس نے اس فعل بد کا ارتکاب کیا اس کے بعد کہ اس کے حرام ہونے پر تمام کا اجماع ہے۔ پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اسے رجم (سنگسار) کیا جائے گا (3) چاہے محصن ہو یا غیر محصن (غیر شادی شدہ)۔ اور اسی طرح اسے بھی رجم کیا جائے گا جس کے ساتھ یہ فعل کیا گیا بشرطیکہ وہ بالغ ہو۔ اور آپ سے

1۔ صحیح مسلم، الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 387 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786

یہ بھی مروی ہے: اسے رجم کیا جائے گا اگر وہ محصن ہو اور اگر غیر محصن ہو تو اسے قید کیا جائے گا اور تادیبی سزا دی جائے گی۔ یہی مذہب حضرات عطا، ابراہیم نخعی اور ابن مسیب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا ہے: محصن اور غیر محصن دونوں کو تعزیر لگائی جائے گی (1)۔ اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زنا پر قیاس کرتے ہوئے اسے حد زنا لگائی جائے گی (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ (الحجر) (اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر) پس یہ ان کے لیے سزا اور ان کے فعل کا بدلہ ہے۔

اور اگر کہا جائے: اس میں دو وجہوں سے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، ایک تو یہ کہ قوم لوط کو دیگر تمام امتوں کی طرح کفر اور تکذیب پر سزا دی گئی اور دوسری یہ کہ ان کے صغیر اور بڑے سب ہی اس میں داخل ہیں۔ پس یہ باب الحدود سے اس کے خارج ہونے پر دلیل ہے۔ تو کہا جائے گا: جہاں تک پہلی وجہ ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے معاصی کا ارتکاب کیا پس ان کے بدلے اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا۔ ان معاصی میں سے یہ بھی ہے۔ اور رہی دوسری وجہ تو ان میں سے کچھ یہ فعل کرنے والے تھے اور ان میں سے کچھ راضی تھے، تو جمہور کے اس پر سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے تمام کو سزا دی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اپنے بندوں کے بارے میں سنت ہے۔ اور فاعلین پر سزا کا امر مسلسل باقی رہے گا۔ واللہ اعلم

ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور دار قطنی نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جسے تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو“ (3)۔ یہ لفظ ابوداؤد اور ابن ماجہ کے ہیں۔

اور ترمذی میں ہے ”وہ دونوں محصن ہوں یا محصن نہ ہوں“ (4)۔ ابوداؤد اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے غیر شادی شدہ جوان کے بارے روایت کیا ہے جو عمل لواطت کی حالت میں پایا جائے۔ آپ نے فرمایا: اسے رجم کیا جائے گا (5)۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو جلا دیا اس کا نام فجاءہ تھا، اس نے قوم لوط کا عمل کیا تھا اور یہی رائے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تھی، کیونکہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اس کے بارے لکھا تو آپ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا اور اس بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بلا شبہ یہ ایسا گناہ ہے جو سابقہ امتوں میں سے سوائے ایک امت کے کسی نے نہیں کیا اور اس کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے (بطور سزا معاملہ) کیا اس کے بارے تم جانتے ہو، میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے اسی پر متفق ہوئی کہ اسے آگ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ نتیجۃً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف اسے آگ کے ساتھ جلا دینے کا حکم بھیجا تو انہوں نے اسے جلا دیا۔ پھر ایسے لوگوں کو ابن زبیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 786　2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3869، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 176۔ ایضاً، حدیث نمبر 2550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 257۔ ایضاً، حدیث نمبر 3870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں جلایا۔ پھر ہشام بن ولید نے انہیں جلانے کی سزا دی۔ پھر خالد قشیری نے عراق میں انہیں جلایا۔

روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں سات افراد لواطت کے جرم میں پکڑے گئے۔ تو آپ نے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو آپ نے ان میں سے چار کو شادی شدہ پایا تو آپ نے ان کے بارے حکم صادر کیا پس انہیں حرم سے باہر نکال کر رجم کر دیا گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے اور تین کو حد جاری کر دی اور آپ کے پاس حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم تھے لیکن ان دونوں نے اس حکم پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور یہی موقف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ حضرت ابن عربی نے کہا ہے: وہ موقف جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے وہ حق کے زیادہ قریب ہے اور وہ سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور اعتماد کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔ اور جہاں تک احناف کا قول ہے تو انہوں نے کہا: زنا کی سزا تو معلوم ہے، تو یہ گناہ جب اس کے سوا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس کی حد میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اور وہ اس بارے میں اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ من وضع حدًا فی غیر حدٍ فقد تعدّی و ظلم (جس نے غیر حد کی جگہ حد لگائی تو اس نے زیادتی اور ظلم کیا) اور یہ بھی کہ اس نے ایسی فرج میں وطی کی ہے جس کے ساتھ نہ حلت کا تعلق ہے اور نہ ہی احصان کا، نہ مہر واجب ہوتا ہے اور نہ ہی نسب ثابت ہوتا ہے، پس اس کے ساتھ حد کا کوئی تعلق نہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر کسی نے چوپائے کے ساتھ بدکاری کی تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ نہ اس آدمی کو قتل کیا جائے گا اور نہ ہی چوپائے کو۔ اور یہ قول بھی ہے: دونوں کو مار ڈالا جائے گا۔ اسے ابن منذر نے ابو سلمہ بن عبد الرحمن سے بیان کیا ہے۔ اور اس باب میں ایک اور حدیث ہے جسے ابوداؤد اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی جانور کے ساتھ بدکاری کی تو تم اسے قتل کر دو اور اس کے ساتھ اس چوپائے کو بھی قتل کر دو'' (2)۔ تو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اس جانور کی حالت (اور حکم) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اس کے بارے جو رائے رکھتا ہوں وہ کہہ دیا، مگر یہ مکروہ ہے کہ جس جانور کے ساتھ یہ عمل کیا گیا ہے اس کا گوشت کھایا جائے (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: اگر یہ حدیث ثابت ہے تو پھر اس کے مطابق قول کرنا واجب ہے اور اگر ثابت نہیں تو پھر چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کثرت سے استغفار کرے جس نے اس طرح کا فعل کیا اور اگر حاکم اسے تعزیر لگائے تو یہ اچھا اور حسن ہے۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چوپائے کا قتل اس لیے ہے تاکہ وہ کسی بد شکل شے کو جنم نہ دے۔ پس اس کا قتل اس معنی کے لیے مصلحت ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ سنت سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جس نے کسی چوپائے سے بدکاری کی اس پر حد نہیں ہے۔ ابوداؤد نے کہا ہے: اسی طرح حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور حکم نے کہا ہے: میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اسے کوڑے لگائے جائیں، لیکن وہ حد کی مقدار کو نہ پہنچیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ زانی کے قائم مقام ہی ہے (4)۔ اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 787　2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فیمن اتی بھیمۃ، حدیث نمبر 3871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، حدیث نمبر 3872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زہری نے کہا ہے: اسے سو کوڑے مارے جائیں گے چاہے وہ محصن ہو یا محصن نہ ہو۔ امام مالک، ثوری، احمد رحمۃ اللہ علیہم اور اصحاب رائے نے کہا ہے: اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ یہ حضرت عطا، نخعی اور حکم رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس سے مختلف ہے۔ اور یہ اس باب میں آپ کے مذہب کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جابر بن زید نے کہا ہے: اس پر حد قائم کی جائے گی، مگر چوپایہ اس کا ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اس میں مِنْ استغراق جنس کے لیے ہے، یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے پہلے کسی امت میں کوئی لواطت کرنے والا نہ تھا اور ملحد گمان کرتے ہیں کہ وہ ان سے پہلے بھی تھے۔ لیکن سچ وہی ہے جو قرآن کریم میں آیا ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ ابلیس ان کے عمل کی اصل تھا اس طرح کہ اس نے انہیں اپنی طرف بلایا اللہ اس پر لعنت کرے۔ پس وہ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے نکاح کر دیتا تھا۔ حسن نے کہا ہے: وہ یہ عمل غرباء (اجنبیوں) سے کرتے تھے(1)، آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ جس کے بارے میں اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ قوم لوط کا عمل ہے''(2)۔ اور حضرت محمد بن سیرین نے کہا ہے: جانوروں میں سے خنزیر اور گدھے کے سوا کوئی نہیں ہے جو قوم لوط کے عمل کی مثل عمل کرتا ہو۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

''بے شک تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ تو حد سے گزرنے والے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمْ حضرت نافع اور حفص نے خبر کی بنا پر اسے ایک ہمزہ مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مذکور فاحشہ کی تفسیر ہے، پس اس پر حرف استفہام داخل کرنا اچھا نہیں، کیونکہ یہ اپنے مابعد کو اپنے ماقبل سے قطع کر دیتا ہے۔ لیکن باقیوں نے استفہام کی بنا پر اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ استفہام توبیخ (جھڑک) کے معنی میں ہے اور یہ حسین ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اور مابعد مستقل کلام ہے۔ ابو عبید اور کسائی وغیرہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ (الانبیاء) اس میں افھم نہیں فرمایا۔ اور مزید فرمایا: اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران: 144) اس میں اانقلبتم نہیں فرمایا۔

اور یہ انتہائی قبیح غلطی ہے، کیونکہ ان دونوں نے دو چیزوں کو ایسی چیز کے ساتھ مشابہت دی ہے جس کے ساتھ وہ مشابہت نہیں رکھتیں، کیونکہ شرط اور جزا دونوں ایک شے کے قائم مقام ہیں جیسا کہ مبتدا اور خبر۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ ان دونوں میں استفہام ہو۔ پس یہ کہنا جائز نہیں: أفإن مت أفهم جیسے یہ کہنا جائز نہیں أزید أمنطلق۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں دو جملے ہیں، پس آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ ان میں سے ہر ایک کے بارے سوال کریں (یعنی ہر ایک کے

1۔ تفسیر بصری، جلد 3، صفحہ 103 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 187۔ ایضاً، حدیث نمبر 2552، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ حرف استفہام لگائیں) یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے اور اسے نحاس اور مکی وغیرہما نے اختیار کیا ہے۔ شھوۃ یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، ای تشتھونھم شھوتہ (یعنی تم ان سے شہوت پرستی کرتے ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں مصدر ہو۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ اسی کی مثل یہ آیت ہے بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ (الشعراء) اس برائی کے سبب تم شرک کی طرف جمع ہونے میں حد سے بڑھنے والے ہو۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۸۳﴾

''اور نہ تھا کوئی جواب ان کی قوم کے پاس سوائے اس کے کہ وہ بولے: باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ پس ہم نے نجات دے دی لوط کو اور ان کے گھر والوں کو بجز ان کی بیوی کے، وہ ہوگئی پیچھے رہ جانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ یعنی حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی اتباع کرنے والوں کو بستی سے باہر نکال دو۔ اور يَّتَطَهَّرُوۡنَ کا معنی ہے یہ لوگ تو اس قسم کا کام کرنے سے بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تطھر الرجل یعنی وہ گناہ سے پاک رہا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! انہوں نے انہیں بغیر عیب کے عیب لگا دیا ہے(1)۔ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں باقی رہنے والے ہیں۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: غَبَرَ الشیٔ تب کہا جاتا ہے جب کوئی شے گزر جائے (ختم ہو جائے) اور جب کوئی شے باقی رہے تب بھی غبر کہا جاتا ہے۔ پس یہ الفاظ اضداد میں سے ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: گزرنے والے کے لیے عابرین کے ساتھ اور باقی رہنے والے کے لیے غابرین کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسے ابن فارس نے ''المجمل'' میں بیان کیا ہے۔ اور زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ یعنی وہ نجات سے غائب ہونے والوں میں سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عمر کے طویل ہونے کے سبب پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ اس طرف جاتے ہیں کہ اس کا معنی من المعمرین ہے یعنی وہ بوڑھی ہوگئی۔ اور لغت میں اکثر یہ ہے کہ غابر باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

فما وَنَى محمدٌ مذْ أنْ غفَرْ　　له الإلٰهُ ما مضى وما غَبَرْ

اس میں غبر باقی رہنے والا کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۸۴﴾

''اور برسایا ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ تو دیکھو کیسا (عبرتناک) انجام ہوا مجرموں کا''۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کے وقت نکلے جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 425

(ہود:81) پھر حضرت جبریل امین علیہ السلام کو حکم دیا گیا تو انہوں نے اپنا پر ان بستیوں کے نیچے داخل کیا اور ان تمام کو نیچے سے اکھیڑ ڈالا اور انہیں اوپر اٹھا لیا یہاں تک کہ اہل آسمان نے مرغوں کی پکار اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، پھر ان کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا (یعنی الٹا کر کے زمین پر دے مارا) اور ان پر کنکر کی پتھریاں برسائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر جو ان میں سے غائب تھا۔ اور آپ نے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو پا لیا، آپ کے پاس ایک پتھر تھا پس اسے قتل کر دیا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار بستیاں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ پانچ تھیں۔ اور ان میں چار لاکھ افراد تھے۔ اس کا بیان سورۃ ہود میں حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآىِٕفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۸۷﴾

''اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، انہوں نے کہا: اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر، بے شک آ گئی تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے تو پورا کرو ناپ اور تول کو اور نہ گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ فساد برپا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور مت بیٹھا کرو راستوں پر کہ ڈراتے ہو تم (راہ گیروں کو) اور روک رہے ہو تم اللہ کی راہ سے جو ایمان لایا اللہ کے ساتھ اور تلاش کرتے ہو اس میں عیب اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھو! کیا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا۔ اور اگر ایک گروہ تم میں سے ایمان لا چکا ہے اس کے ساتھ جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہ لایا تو (ذرا) صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ ہمارے درمیان اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِلٰی مَدْیَنَ مدین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بلد اور قطر کا نام ہے (1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے جیسے بکر اور تمیم قبیلوں کے نام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ مدین بن ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی اولاد میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426

سے تھے۔ پس جن کی رائے ہے کہ مدین آدمی کا نام ہے ان کے نزدیک یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں معرفہ اور عجمہ پائے جاتے ہیں۔ اور جن کی رائے ہے کہ یہ قبیلہ یا زمین کا نام ہے تو یہ زیادہ مناسب ہے کہ اسے منصرف قرار نہ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ روایت ہے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا بیٹا تھا۔ اور مکی نے کہا ہے: وہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی کا خاوند تھا (1)۔ اور اس کے نسب میں اختلاف ہے۔

حضرت عطا اور ابن اسحاق وغیرہما نے کہا ہے: شعیب ھو ابن میکیل بن یشجر ابن مدین بن ابراھیم علیہ السلام سریانی زبان میں ان کا نام بیروت تھا اور ان کی ماں میکائیل بنت لوط تھی (2)۔ اور شرقی بن قطامی نے یہ گمان کیا ہے کہ شعیب بن عیفاء بن یوبب بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام نسب ہے۔ اور ابن سمعان کا خیال ہے کہ شعیب بن جزی بن یشجر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم نسب ہے۔ اور شعیبٌ شَعْبٌ یا شِعْب کی تصغیر ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ شعیب بن یوبب ہے اور یہ قول بھی ہے: شعیب بن صفوان بن عیفاء بن ثابت بن مدین بن ابراہیم نسب ہے۔ واللہ اعلم

آپ نابینا تھے، اسی لیے آپ کی قوم نے کہا: وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا (ہود: 91) (اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے) اور آپ کو اپنی قوم کی طرف حسن مراجعت کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔ اور آپ کی قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والی اور ناپ تول میں کمی کرنے والی تھی (3)۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بیان آگیا اور اس سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کا رسول بن کر تشریف لانا ہے۔ اور آپ کے کسی معجزہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس بارے میں آپ کا معجزہ امام کسائی نے قصص الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ، البخس کا معنی ہے کمی کرنا، گھٹا کر دینا اور یہ سامان تجارت میں عیب لگانے اور اس میں رغبت کم ہونے کے سبب ہوتی ہے یا قیمت میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے سبب اور ماپ میں زیادتی اور کمی کرنے کا حیلہ کرنے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ سب مال کو باطل طریقے سے کھانا ہے، سابقہ اور گزشتہ تمام امتوں میں تمام رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی زبانوں سے اس سے منع کیا گیا ہے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس کا عطف وَ لَا تَبْخَسُوا پر ہے یہ لفظ چھوٹے اور بڑے ہر فساد کو شامل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے حضرت شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث فرمانے سے پہلے اس زمین میں معاصی اور گناہوں کے اعمال کیے جارہے تھے، محارم کو حلال سمجھا جارہا تھا اور اس میں خون بہایا جارہا تھا۔ فرمایا: پس یہی اس کا فساد ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو زمین کی اصلاح ہوگئی۔ اور ہر نبی جسے اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اس نے ان کی اصلاح کی۔ (اور فساد کو جڑ سے اکھیڑنے کی سرتوڑ کوشش فرمائی)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 426　　2۔ معالم التنزیل، جلد 5، صفحہ 507　　3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ اللہ تعالیٰ نے انہیں راستوں پر بیٹھنے سے اور اس راستے کو بند کرنے سے منع فرمایا ہے جو راستہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف لے جانے والا ہے۔ وہ اس آدمی کو عذاب اور اذیت سے ڈراتے دھمکاتے تھے جو ایمان لے آتا۔ علماء نے راستوں پر بیٹھنے کے معنی میں اختلاف کیا ہے اور تین معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانے والے راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور جو بھی آپ کے پاس آنے کی کوشش اور ارادہ کرتا وہ اس کو خوفزدہ کرتے تھے اور روکتے تھے اور یہ کہتے تھے: وہ تو کذاب ہے تو اس کی طرف مت جا، جیسا کہ قریش مکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے تھے (1)۔ یہی آیت کا ظاہر معنی ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ڈاکہ ڈالنے اور مال چھیننے سے نہی ہے (2)۔ اور یہ فعل ان کے افعال میں سے تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے شب معراج راستے میں ایک لکڑی دیکھی جو کپڑا بھی اس کے پاس سے گزرتا وہ اسے پھاڑ دیتی اور اس نے ہر شی کو پھاڑ دیا، تو میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟، تو انہوں نے کہا: یہ آپ کی امت میں سے اس گروہ کی مثال ہے جو راستے پر بیٹھتے ہیں اور ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ الآیہ (3) اور چوروں اور حملہ آوروں کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے: وہ دسواں حصہ (عشر) وصول کرتے تھے (4)۔ اور آج کے دور میں ان کی مثل وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے وہ مال قہر و جبر کے ساتھ وصول کرتے ہیں جو ان پر وظائف مالیہ میں سے شرعاً لازم ہوتا ہے۔ اور اس مال کا ضامن بنا دیتے ہیں جس کی ضمانت اصلاً جائز ہوتی ہے مثلاً زکوٰۃ، مال میراث اور ملاہی وغیرہ (کھیل کود کا سامان وغیرہ) اور وہ مختلف راستوں پر ڈیرہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا وجود کثرت سے ہے اور تمام شہروں میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اور یہ عظیم کبیرہ اور فحش ترین گناہوں میں سے ہے، کیونکہ یہ ظلم، غصب اور لوگوں پر بے جا زیادتی ہے اور یہ منکر کو پھیلانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اس پر دوام اختیار کرنا اور اسے مزید پختہ کرنا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریعت اور قضاء کے حکم کو اپنے ذمے میں شامل کرنا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اسلام میں سے سوائے رسم کے کچھ باقی نہ رہا اور دین میں سے سوائے نام کے کچھ نہیں رہا۔ اس تاویل کے لیے وہ نہی باعث تقویت ہے جو اس سے قبل مال کے ناپ تول اور اس میں کمی کرنے کے بارے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَنْ اٰمَنَ بِهٖ اس میں بہ کی ضمیر یہ احتمال بھی رکھتی ہے کہ اسم جلالت کی طرف لوٹ رہی ہو اور یہ بھی کہ شعیب کی طرف لوٹ رہی ہو۔ یہ ان کے قول کے مطابق ہے جن کی رائے یہ ہے کہ مراد راستہ بند کرنے کے لیے راستے پر بیٹھنا ہے اور یہ بھی کہ وہ السبیل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عِوَجًا ابو عبید اور زجاج نے کہا ہے: یہ معانی میں عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور اجرام میں عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ یعنی اس نے تمہاری تعداد بڑھا دی یا فقر و افلاس کے بعد دولت و ثروت کے ساتھ تمہیں بڑھا دیا، یعنی تم فقراء تھے تو اس نے تمہیں دولت مند بنا دیا۔ فَاصْبِرُوْا یہ کفر پر قائم رہنے کا امر نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 427 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری، جلد 8، صفحہ 280 4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 508

ہے بلکہ یہ وعید اور جھڑک ہے۔ اور فرمایا: وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ معنی کے اعتبار سے کَانَ مذکور ہے اگر چہ لفظ کا تقاضا تو یہ ہے کہ کانت ہوتا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾

"کہنے لگے وہ سردار جو غرور و تکبر کیا کرتے تھے ان (شعیب) کی قوم سے یا تو ہم نکال کر رہیں گے تمہیں اے شعیب! اور جو ایمان لائے تمہارے ساتھ اپنی بستی سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں، شعیب نے کہا: اگر چہ ہم اس (ارتداد) کو ناپسند بھی کرتے ہوں۔ پھر تو ہم نے ضرور بہتان باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اگر ہم لوٹ آئیں تمہارے دین میں اس کے بعد کہ جب نجات دے دی ہمیں اللہ نے اس سے اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لیے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ تعالیٰ جو پروردگار ہے ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے، صرف اللہ پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، اے ہمارے رب! فیصلہ فرما دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا کا معنی ہے تم لوٹ آؤ گے ہماری ملت کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے متبعین آپ کے ساتھ ایمان لانے سے پہلے کفر پر تھے، یعنی تم ضرور ہماری طرف لوٹ آؤ گے جیسے تم پہلے تھے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ عود بمعنی ابتدا ہو۔ کہا جاتا ہے: عاد إلی من فلان مکروہ یعنی فلاں سے میری طرف آنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، اگر چہ اس سے پہلے اس کا آنا مکروہ نہیں، یعنی وہ اس سے میرے ساتھ مل گیا۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ یعنی اگر ہم ناپسند کریں تو تم ہمیں وطن سے نکلنے پر یا اپنی ملت کی طرف لوٹنے پر مجبور کرو گے۔ یعنی اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے بہت بڑا کام کر لیا۔

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا یہ ان کی ملت کی طرف لوٹنے سے مایوسی اور ناامیدی کا اظہار ہے۔ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا ہے: یعنی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اس کی طرف لوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے (1)۔ فرمایا: یہ اہل السنت کا قول ہے۔ یعنی و ما یقع

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 509

منا العود إلى الكفر إلا أن يشاء الله ذالك (ہم سے کفر کی طرف لوٹنے کا وقوع نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے چاہے) پس یہ استثنا منقطع ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں استثنا اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنے کی جہت پر ہے جیسے یہ کہا: وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ (ہود: 88) اور اس پر دلیل اس کا مابعد وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: لا أكلمك حتى يبيض الغراب، وحتى يلج الجمل في سم الخياط (میں تیرے ساتھ کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ کوا سفید ہو جائے اور یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے) اور کوا کبھی سفید نہ ہوگا اور اونٹ سوئی کے ناکے میں کبھی داخل نہ ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ہمارا رب ما کان اور ما یکون کے علم کو گھیرے ہوئے ہے۔ عِلْمًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم بستی میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ تم نے ہمارے پڑوس کو ناپسند کیا ہے، بلکہ ہم تمہارے گاؤں سے کسی اور کی طرف ہجرت کر کے نکل جائیں گے۔ إِلَّآ أَن يَشَآءَ اللّٰهُ مگر یہ کہ اللہ ہمیں اس کی طرف لوٹا دے۔ اور اس معنی میں بُعد ہے، کیونکہ عَادَ لِلْقَرْيَةِ کہا جاتا ہے، عادفی القریۃ نہیں کہا جاتا۔

قولہ تعالیٰ: عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ کئی مقام پر یہ پہلے گزر چکا ہے۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو امتوں کی طرف بھیجا ایک اہل مدین، اور دوسرے اصحاب الایکۃ (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے۔ پس جب طویل وقت گزر گیا آپ کی قوم اپنے کفر اور اپنی گمراہی میں سرکش ہو گئی اور آپ ان کی اصلاح سے مایوس ہو گئے تو ان کے لیے بددعا کی اور کہا: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور انہیں زلزلہ کے ساتھ ہلاک اور تباہ کر دیا۔

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ﴿٩٠﴾
فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ
يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ
يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٩٣﴾

''اور کہا ان رئیسوں نے جو کافر تھے ان کی قوم سے کہ اگر تم پیروی کرنے لگو شعیب کی تو یقیناً تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ پھر پکڑ لیا انہیں زلزلہ نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے۔ جن (بدبختوں) نے جھٹلایا شعیب کو (وہ یوں نابود کر دیے گئے) گویا کبھی بستے ہی نہ تھے ان مکانوں میں۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو ہو گئے وہی نقصان اٹھانے والے۔ تو منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور کہا: اے میری

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 511

قوم! بے شک میں نے پہنچا دیے تھے تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں نے نصیحت کی تھی تمہیں۔ تو (اب)
کیونکر غم کروں میں کافر قوم (کے ہولناک انجام) پر"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ یعنی انہوں نے اپنے سے کمتر اور کمزور لوگوں کو کہا: لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرنے لگے تو یقیناً تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ رجفه کا معنی چیخ (کرخت آواز) ہے اور اصحاب الایکۃ شدید بادل کے سبب ہلاک کیے گئے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا جرجانی نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ نیا کلام ہے۔ یعنی جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہ اس طرح ہو گئے گویا وہ ہمیشہ سے مردہ تھے۔ اور يَغْنَوْا بمعنی يقيموا (مقیم ہونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: غَنِيْتُ بالمكان جب تو کسی مکان میں مقیم ہو۔ اور غَنَى القوم في دارهم یعنی ان کا اپنے گھروں میں قیام طویل عرصہ سے ہے اور مغنی بمعنی منزل (گھر) ہے اور اس کی جمع مغانی ہے۔ عبید نے کہا ہے:

وَ غَنِيتُ سَبْتًا قبلَ مَجْرَى دَاحِسٍ　　لو كان للنفس اللَّجُوجِ خُلود

اور حاتم طئی نے کہا:

غَنِينا زمانا بالتَّصَعْلُكِ والغِنَى　　كما الدَّهرُ في أيامه العسرُ واليسرُ(1)
كَسبنا صُروفَ الدَّهرِ لِينًا وغِلظة　　وكلًّا سقاناه بكأسيهما الدهرُ
فما زادنا بَغْيًا على ذِي قرابة　　غِنَانا ولا أَزْرَى بأحسابنا الفقرُ

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ یہ ابتدائے خطاب ہے۔ اور یہ ذم و توبیخ میں مبالغہ ہے اور امر کی تعظیم و تفخیم کا اعادہ ہے۔ جب انہوں نے کہا: جس کسی نے حضرت شعیب علیہ السلام کی اتباع اور پیروی کی وہ خسارے میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خسارے اور نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم کے ہولناک انجام پر۔ آسيت على الشيء (میں نے فلاں پر اظہار غم کیا) آسی (أسى) (غم کرنا) وأنا آسی (اور میں غم کرنے والا ہوں)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

"اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر یہ کہ (جب نبی جھٹلایا گیا) تو ہم نے مبتلا کر دیا وہاں کے باشندوں کو سختی اور تکلیف میں تا کہ وہ گڑگڑانے لگیں پھر ہم نے بدل دی تکلیف کی جگہ راحت حتیٰ کہ وہ پھلے پھولے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 430

کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت، تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اور اس کا انہیں خواب وخیال بھی نہ تھا"۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اس میں اضمار ہے اور وہ ہے فکذب أهلها إلا أخذناهم (اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی اس کے رہنے والوں نے تکذیب کی) مگر ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا)۔ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ یعنی پھر ہم نے ان کی تکلیف اور خشک سالی کو خوشحالی اور راحت کے ساتھ بدل دیا۔ حَتّٰی عَفَوْا یہاں تک کہ وہ کثیر اور وافر ہو گئے (1)۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: ان کے مال ومنال اور اولاد بڑھ گئی (2)۔ اور عفا کا لفظ اَضداد میں سے ہے۔ عفا کا معنی بڑھنا اور کثیر ہونا ہے۔ اور عفا کا معنی مٹ جانا اور ختم ہو جانا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ اس نے انہیں شدت وتکلیف اور راحت وخوشحالی میں مبتلا کیا پس نہ انہوں نے روکا اور منع کیا اور نہ ہی شکر ادا کیا۔ وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ (اور کہنے لگے: بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت) اور ہم بھی انہیں کی مثل ہیں۔ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا تاکہ یہ ان کے لیے بہت زیادہ باعث حسرت ہو جائے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی لیکن انہوں نے جھٹلایا (ہمارے رسولوں کو) تو پکڑ لیا ہم نے انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو وہ کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى مدینہ (شہر) کو قریہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں یہ قریت الماء سے ماخوذ ہے، یہ تب کہا جاتا ہے جب تو پانی جمع کرے۔ یہ مکمل طور پر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اٰمَنُوْا یعنی اگر بستیوں والے تصدیق کرتے۔ وَاتَّقَوْا اور وہ شرک سے بچتے۔ لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یعنی بارش اور نباتات (اناج وغیرہ) انہیں عطا فرماتے۔ اور یہ ان اقوام میں خاص طور پر ہے جن کا ذکر جاری ہے۔ جب کبھی مومنین کو زندگی کی تنگی اور تلخیوں کے ساتھ آزمایا جاتا ہے تو وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے خبر دی ہے جب کہ آپ نے اپنی قوم کو فرمایا: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۙ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ (نوح) (معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ برسائے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش)

اور حضرت ہود علیہ السلام کے بارے ہے: ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا (ہود: 52) (پھر (دل و

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 242
2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 513

جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلادھار بارش) پس اللہ تعالیٰ نے ان سے خاص طور پر بارش اور شادابی کا وعدہ فرمایا۔ اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور مومنین نے ان کی تصدیق کی اور تکذیب نہ کی۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾

"تو کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آجائے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اس حال میں کہ وہ سو رہے ہوں یا کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آجائے ان پر ہمارا عذاب چاشت کے وقت جب کہ وہ کھیل کود رہے ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى یہ استفہام برائے انکار ہے۔ اور فا عاطفہ ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ (المائدہ: 50) (تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں؟)

قریٰ سے مراد مکہ مکرمہ اور اس کے گردونواح کی بستیاں ہیں، کیونکہ انہوں نے ہی حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کو جھٹلایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ عام ہے اور تمام بستیوں کو شامل ہے۔ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا یعنی ان پر ہمارا عذاب آجائے۔ بَيَاتًا رات کے وقت۔

وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ (درآنحالیکہ وہ سو رہے ہوں) اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا حرمیان اور ابن عامر نے واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ أو عاطفہ ہے اور اباحت کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ (دہر) (اور نہ کہنا مانیے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا)۔ جالس الحسن او ابن سیرین (تو حسن یا ابن سیرین کی مجالست اختیار کر (یعنی ان دو میں سے ہر ایک کے ساتھ بیٹھنا مباح ہے) اور آیت میں معنی یہ ہے: یا وہ سزاؤں کی ان قسموں سے بے خوف اور امن میں ہو گئے ہیں، یعنی اگر تم ایک قسم سے بے خوف ہو چکے ہو تو دوسری سے بے خوف اور پرامن نہ ہو۔ اور او کا دو چیزوں میں سے ایک کے لیے ہونا جائز ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: ضربتُ زیدًا أو عمرًا (میں نے زید کو مارا یا عمر کو) اور باقیوں نے واؤ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے بعد ہے۔ اسے واؤ عطف قرار دیا ہے جس پر الف استفہام داخل ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا (البقرہ: 100) (کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا)

اور ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ کا معنی ہے: اور وہ اس حالت میں ہوں جو انہیں کوئی نفع نہ دے سکے۔ ہر وہ آدمی جو ایسے کام میں لگا ہو جو اس کے لیے نقصان دہ تو ہو لیکن نفع بخش نہ ہو اسے لاعب کہا جاتا ہے اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور "الصحاح" میں ہے اللّعب معروف ہے اور اللّعب اس کی مثل ہے اور لعب یلعب اور تلعّب (لعِب) کے بعد دیگرے کھیل کود میں مصروف رہنا اور رجل تِلعَابة بہت زیادہ کھیل کود میں مصروف رہنے والا آدمی۔ اور التلعاب فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ مصدر ہے اور

جاریۃ لَعُوبٌ (بہت زیادہ کھیلنے والی لڑکی)

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹۹

''تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ہیں اللہ کی خفیہ تدبیر سے پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ یعنی کیا وہ اپنے مکر و فریب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے مکر سے مراد اس کی خفیہ تدبیر ہے جو اس نے نعمت و صحت عطا کرنے کی صورت میں اپنا رکھی ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۱۰۰

''کیا یہ (حقیقت) واضح نہ ہوئی ان لوگوں پر جو وارث بنے زمین کے اس کے اصلی مالکوں (کی تباہی) کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو سزا دیں انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اور مہر لگا دیں ان کے دلوں پر تاکہ وہ کچھ سن ہی نہ سکیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَلَمْ يَهْدِ کیا یہ واضح اور ظاہر نہیں ہوا؟ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مراد کفار مکہ اور ان کے اردگرد رہنے والے لوگ ہیں۔ اَصَبْنٰهُمْ یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں پکڑ لیں۔ بِذُنُوْبِهِمْ ان کے کفر اور ان کے جھٹلانے کے سبب۔ وَنَطْبَعُ، ای ونحن نطبع امور هم مہر لگا دیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصبنا پر معطوف ہے، یعنی نُصیبهم ونطبع (ہم انہیں سزا دیں اور مہر لگا دیں) تو اس میں ماضی مستقبل کے محل میں واقع ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۱

''یہ بستیاں ہیں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی کچھ خبریں اور بے شک آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ اور نہ ہوا یہ کہ ایمان لاتے اس پر جس کو جھٹلا چکے تھے اس سے پہلے اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر''۔

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الْقُرٰى یعنی یہ وہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک اور تباہ و برباد کیا۔ اور وہ حضرت نوح، عاد، حضرت لوط، حضرت ہود اور حضرت شعیب علیہم السلام کی بستیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ نَقُصُّ ہم بیان کرتے ہیں۔ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا آپ سے ان کی کچھ خبریں۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے باعث تسلی واطمینان ہے۔

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا یعنی ایسا نہیں کہ وہ کفار اپنے ہلاک ہونے کے بعد ایمان لائیں اگر ہم انہیں زندہ کر دیں (1)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا (انعام: 28) (اور اگر انہیں واپس بھیجا جائے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 515

(جیسے ان کی خواہش ہے) تو پھر وہ بھی وہی کریں) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ربیع نے کہا ہے: اس دن سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جس دن اس نے میثاق لیا کہ وہ رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے (1)۔ بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ مراد یوم میثاق ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تو وہ مجبوراً ایمان لائے نہ کہ رضامندی کے ساتھ۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس دن وہ مجبوراً ایمان لائے جس دن اللہ تعالیٰ نے ان سے میثاق لیا پس یہ نہیں ہو سکتا کہ اب وہ حقیقتاً ایمان لائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے معجزات کا سوال کیا، پس جب انہوں نے معجزات دیکھ لیے تو پھر ایسا نہ ہوا کہ وہ اس پر ایمان لاتے جسے وہ معجزہ دیکھنے سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام: 110) (جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ کافروں کے دلوں پر مہر لگائی اسی طرح وہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا جو حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝

"اور نہ پایا ہم نے ان کی اکثریت کو وعدہ کا پابند اور ضرور پایا ان میں سے بہتوں کو حکم عدولی کرنے والا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ اس میں مِن زائدہ ہے اور یہ معنی جنس پر دلالت کرتا ہے اور اگر مِن نہ ہوتا تو پھر یہ وہم جائز ہوتا کہ یہ معنوی اعتبار سے واحد ہے۔ (یعنی صرف ایک وعدہ مراد ہوتا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ان سے اس وقت لیا گیا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا گیا تھا اور جس نے عہد توڑ دیا اس کے لیے کہا گیا ہے اس کا کوئی عہد نہیں یعنی گویا اس نے وعدہ کیا ہی نہیں۔ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا (2) ہے: اس وعدہ سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان سے لیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ کفار منقسم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں نہ امانت ہے اور نہ ایفائے عہد ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے کفر کے باوجود امانتدار بھی ہیں اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

"پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے انکار کر دیا ان کا، سو دیکھو کیسا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا"۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے بھیجا حضرت نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے بعد۔ مُوْسٰى حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو۔ بِاٰيٰتِنَاۤ اپنے معجزات اور نشانیوں کے ساتھ۔ فَظَلَمُوْا بِهَا تو انہوں نے انکار کر دیا اور

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 181
2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 106

انہوں نے ان نشانیوں کی تصدیق نہ کی۔ اور آیت میں ظلم کا معنی ہے: وضعُ الشئ فی غیر موضعہ (کسی شی کو وہاں رکھنا جو اس کا محل نہ ہو ظلم کہلاتا ہے)

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ سو دیکھو فساد برپا کرنے والوں کے معاملے کا انجام کیسا ہوا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٠٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿١٠٧﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٩﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُمْ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿١١٠﴾ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ﴿١١١﴾ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿١١٢﴾

''اور کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے: اے فرعون! بلاشبہ میں رسول ہوں پروردگار عالم کا۔ واجب ہے مجھ پر کہ میں نہ کہوں اللہ پر سوائے سچی بات کے، میں آیا ہوں تمہارے پاس روشن دلیل لے کر تمہارے رب کی طرف سے پس بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ فرعون نے کہا: اگر تم لائے ہو کوئی نشانی تو پیش کرو اسے اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔ تو ڈال دیا موسیٰ نے اپنا عصا تو فوراً وہ صاف اژدہا بن گیا۔ اور نکالا اپنا ہاتھ (گریبان سے) تو فوراً وہ سفید (روشن) ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے۔ کہنے لگے قوم فرعون کے رئیس: واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے ملک سے، تو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ بولے: مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو اور بھیجو شہروں میں ہرکارے، تا کہ وہ لے آئیں تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو''۔

حَقِيقٌ علی یعنی مجھ پر واجب ہے۔ اور جنہوں نے علی ان لا پڑھا ہے تو معنی یہ ہوگا حریص علی الا اقول (وہ اس پر حریص ہے کہ میں نہ کہوں) اور حضرت عبداللہ کی قراءت میں حقیق الا اقول ہے یعنی اس میں علی موجود نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ علی بمعنی با ہے(1)، یعنی حقیق بالا اقول اور اسی طرح حضرت ابی اور اعمش کی قراءت میں بالا اقول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: رمیتُ بالقوس وعلی القوس۔ پس اس بنا پر حقیق بمعنی محقوق (ثابت شدہ) ہو گا۔ اور فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ کا معنی ہے تو انہیں چھوڑ دے۔ (کیونکہ) وہ انہیں انتہائی مشقت آمیز کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ۔ اسے اجسام اور معانی دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور الثعبان سے مراد اژدہا (بہت بڑا سانپ) ہے اور یہی تمام سانپوں سے بڑا اور شدید ہوتا ہے۔

مُّبِينٌ یعنی ایسا سانپ جس میں کوئی التباس اور ابہام نہ تھا۔ وَنَزَعَ يَدَهُ اور آپ نے اپنا دست مبارک نکالا اور اسے ظاہر

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 182

کیا۔ کہا گیا ہے کہ اپنے گریبان سے یا اپنے پہلو سے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (النمل: 12) یعنی بغیر برص (کی بیماری) کے وہ سفید اور روشن نکلے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت زیادہ گندمی رنگ کے تھے، پھر آپ نے اپنا ہاتھ دوبارہ اپنے گریبان میں داخل کیا تو وہ اپنی پہلی رنگت کی طرف واپس لوٹ آیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: آپ کے ہاتھ میں اتنا نور اور چمک تھی کہ اس کے ساتھ زمین و آسمان کے مابین ہر شی روشن ہوگئی اور چمکنے لگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کا ہاتھ اتنا سفید نکلتا تھا جیسے برف ظاہر ہوتی ہے اور جب آپ اسے واپس لوٹاتے تو وہ سارے بدن کی رنگت پر واپس لوٹ آتا۔ اور عَلِیْمٌ کا معنی ہے سحر اور جادو جاننے والا۔ مِّنْ اَرْضِكُمْ یعنی تمہارے ملک سے اے قبطیوں کے گروہ، کیونکہ اسے تم پر بنی اسرائیل مقدم ہیں۔

فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ یعنی فرعون نے کہا: اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان رئیسوں کا قول ہے (1)۔ یعنی انہوں نے اکیلے فرعون کو کہا: فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ جیسے جابر حکمرانوں اور رؤساء کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ما ترون فی کذا (تم اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہو)۔ اور یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ انہوں نے یہ قول فرعون اور اس کے ساتھیوں کو کہا ہو۔ اس میں ما محل رفع میں ہے۔ اس بنا پر کہ ذا بمعنی الذی ہو اور اگر ذا اور ما ایک ہی شی ہوں تو پھر ما محل نصب میں ہوگا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ اہل مدینہ، عاصم اور کسائی نے بغیر ہمزہ کے قراءت کی ہے۔ مگر ورش اور کسائی نے ہا کے کسرہ میں اشباع کیا ہے۔ اور ابو عمرو نے ہمزہ کو ساکن اور ہا کو مضموم پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: أرجأته و أرجيته یعنی میں نے اسے مہلت دی۔ اسی طرح ابن کثیر، ابن محیصن اور ہشام نے بھی پڑھا ہے، مگر انہوں نے ہا کے ضمہ میں اشباع کیا ہے۔ اور تمام اہل کوفہ نے ارجہ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فراء نے کہا ہے: یہ عرب کی لغت ہے وہ وصل کلام میں ہا کنایہ پر وقف کرتے ہیں جب کہ اس کا ماقبل متحرک ہو، اسی طرح هذه طلحة قد اقبلت ہے۔ لیکن بصریوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اَرْجِهْ کا معنی ہے تم اسے روک دو (2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اسے مہلت دو (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَرْجِهْ یہ رجا یرجو سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسے لالچ دو اور اسے امید دلا کر چھوڑ دو۔ اسے نحاس نے محمد بن یزید سے بیان کیا ہے اور ہا کا کسرہ ماقبل کی اتباع میں ہے اور اصل کی بنا پر اسے ضمہ دینا جائز ہے اور اسے سکون دینا غلطی ہے یہ جائز نہیں مگر شعر میں بطور شاذ ہو سکتا ہے۔ وَ اَخَاهُ اس کا عطف ہا پر ہے۔ حٰشِرِیْنَ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یَاْتُوْكَ یہ حالت جزم میں ہے، کیونکہ یہ جواب امر ہے اسی لیے اس کے آخر سے نون اعرابی محذوف ہے۔ سوائے حضرت عاصم کے تمام اہل کوفہ نے بِكُلِّ سَحَّارٍ قراءت کی ہے۔ اور باقی تمام لوگوں نے ساحر پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں باہم متقارب ہیں مگر فعال (سحار) میں مبالغہ زیادہ ہے۔

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 518 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 245 3۔ ایضاً

اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اور آ گئے جادوگر فرعون کے پاس، جادوگروں نے کہا: یقیناً (آج تو) ہمیں بڑا انعام ملنا چاہیے اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آ جائیں۔ فرعون نے کہا: بے شک اور (اس کے علاوہ) تم خاصان بارگاہ سے ہو جاؤ گے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ اس میں بھیجنے کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ سامع کو اس کا علم ہے۔ ابن عبدالحکم نے کہا ہے: وہ بارہ نقیب تھے، ہر نقیب کے ساتھ بیس عریف تھے اور ہر عریف کے ماتحت ایک ہزار جادوگر تھے۔ اور مقاتل بن سلیمان کے قول کے مطابق ان کا سردار شمعون تھا۔ ابن جریج نے بیان کیا ہے: وہ نو سو افراد تھے (1) جو عریش، فیوم اور اسکندریہ سے تین تین سو تعلق رکھتے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے: وہ پندرہ ہزار جادوگر تھے (2)، اور وہب سے مروی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بارہ ہزار تھے (3)۔ ابن المنکدر نے اسی ہزار کہا ہے (4)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ چودہ ہزار تھے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے: تین سو ہزار جادوگر ریف سے تعلق رکھتے تھے، تین سو ہزار جادوگر صعید سے تھے، اور تین سو ہزار جادوگر فیوم اور اس کے گردونواح سے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ستر آدمی تھے اور تہتر کا قول بھی بیان کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اور روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ رسیاں اور عصا تھے جو تین سو اونٹوں پر لدے ہوئے تھے پس وہ اژدہا ان تمام کو نگل گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جب اس نے منہ کھولا تو اس کا جبڑا اسی ذراع ہو گیا وہ اپنے نیچے والے جبڑے کو زمین پر رکھے ہوئے تھا اور اوپر والے جبڑے کو محل کی فصیل پر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے منہ کی وسعت چالیس ذراع تھی۔ واللہ اعلم

پس اس نے فرعون کو نگلنے کا قصد کیا، تو وہ اپنے تخت سے اچھلا اور بھاگ نکلا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہنے لگا، پس جب آپ نے اسے پکڑا تو وہ پہلے کی طرح عصا تھا۔ حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس عصا کے خوف سے پندرہ ہزار افراد فوت ہوئے۔ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی انعام اور مال ہوگا۔ اس میں فقالوا کے ساتھ نہیں کہا، کیونکہ مراد یہ ہے کہ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: لما جاء وا قالوا اور خبر کی بنا پر اسے ان لنا بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ حضرت نافع اور ابن کثیر کی قراءت ہے (یعنی) انہوں نے فرعون پر لازم قرار دیا کہ وہ ان کے لیے مال مقرر کرے اگر وہ غالب آ جائیں، تو فرعون نے انہیں کہا: قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی بے شک (اس کے علاوہ) تم ہمارے نزدیک بلند رتبہ لوگوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پس اس نے ان کے لیے اس سے زیادہ کا اقرار کیا جس کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک انہوں نے اس سے اپنے لیے اپنے فیصلے کے بارے یقین حاصل کیا اگر وہ غالب آ گئے، یعنی انہوں نے کہا: ہمارے لیے اجر واجب اور ضروری ہوگا اگر ہم غالب آ گئے۔ باقیوں نے استخبار کی جہت پر استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے فرعون سے اطلاع حاصل کی کیا وہ انہیں کوئی اجر دے گا اگر وہ غالب آ گئے یا نہیں تو پس انہیں اس بارے فرعون پر یقین نہ تھا تو انہوں نے اس سے پوچھ لیا کیا وہ ایسا کرے گا؟ تو اس نے انہیں کہا ''جی ہاں'' تمہارے لیے اجر بھی ہو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 438　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

گا اور قرب بھی بشرطیکہ تم غالب آ جاؤ۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ۚ

''جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم (پہلے) ڈالو ورنہ ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم ہی ڈالو پس جب انہوں نے ڈالا تو جادو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور خوفزدہ کر دیا انہیں اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا۔ اور ہم نے وحی کی موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا تو فوراً وہ نگلنے لگا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا''۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ادب سے پیش آئے تو یہی ان کے ایمان کا سبب بن گیا اور اَن کسائی اور فراء کے نزدیک محل نصب میں ہے، معنی یہ ہے اما أن تفعل الالقاء (یا آپ ڈالیں) اور اسی کی مثل شاعر کا یہ قول بھی ہے:

قالوا الرکوب فقلنا تلک عادتنا

قَالَ اَلْقُوْا فراء نے کہا ہے: کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا بلاشبہ تم ہرگز اپنے رب پر غالب نہیں آسکو گے اور تم ہرگز اس کی آیات اور نشانیوں کو باطل نہیں کر سکو گے۔ اور یہ قرآن کریم کے اس معجزہ میں سے ہے کہ اس کی مثل لوگوں کا کلام نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اس پر قادر ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے تھوڑے الفاظ بہت زیادہ معانی کو متضمن ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تہدید اور ڈراوا ہے، یعنی تم پہلے ڈالو، پس تم اس ذلت اور رسوائی کو دیکھو گے جو تم پر طاری ہوگی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ انہیں جادو کا حکم دیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے انہیں یہ حکم اس لیے دیا تا کہ ان کا جھوٹ اور ان کی ملمع سازی ظاہر ہو جائے گی۔ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا پس جب انہوں نے رسیاں اور عصا ڈالے۔ سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ یعنی انہوں نے انہیں وہم میں ڈال دیا اور آنکھوں کو صحیح ادراک کرنے سے بدل دیا، ایسی شے کے ساتھ جس سے ایسی ملمع سازی کا وہم دلایا جاتا ہے جو شعوذۃ اور خفۃ الید کے قائم مقام ہوتی ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور عظیم کا معنی ہے وہ ان کے نزدیک بڑا تھا، کیونکہ وہ کثیر تھا لیکن وہ فی الحقیقت بڑا نہ تھا۔ ابن زید نے کہا(1) ہے: اجتماع اسکندریہ میں تھا اور سانپ کی دم بحیرہ کے پر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اژدہا نے منہ کھولا اور وہ انہیں نگلنے لگا جو رسیاں اور عصا انہوں نے ڈالے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جو رسیاں انہوں نے ڈالی تھیں وہ چمڑے کی تھیں اور ان میں پارہ بھرا ہوا تھا پس انہوں نے حرکت کی اور وہ کہنے لگے یہ سانپ ہیں۔ حفص نے تَلْقَفُ لام کے سکون اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے لَقِفَ يَلْقَفُ کا مضارع بنایا ہے۔ نحاس

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 521

نے کہا ہے: اس قراءت پر تِلَقَّف بھی جائز ہے، کیونکہ یہ لَقِفَ سے ہے۔ اور باقیوں نے تشدید اور لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اسے تَلَقَّفَ کا مضارع بنایا ہے اور یہ (اصل میں) تَتَلَقَّفُ ہے۔ کہا جاتا ہے: لقِفت الشیٔ وتلقفته جب تو کسی شے کو پکڑ لے یا اسے نگل لے۔ تَلَقَّف اور تَلَقَّم اور تَلَهَّم تمام کا ایک معنی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: مجھے بعض قراءتوں میں تَلَقَّمُ میم اور تشدید کے ساتھ کی خبر پہنچی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أنت عصا موسیٰ التی لم تزلْ تَلَقَّمُ ما یأفِکُه الساحرُ(1)

اور تَلْقَفُ بھی روایت کیا جاتا ہے۔ مَا یَاْفِكُوْنَ یعنی اسے جوان کا جھوٹ تھا، کیونکہ وہ رسیاں لے کر آئے اور انہوں نے ان میں پارہ بھر دیا یہاں تک کہ وہ حرکت کرنے لگیں۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"تو ثابت ہو گیا حق اور باطل ہو گیا جو (جادو) وہ کیا کرتے تھے وہ یوں فرعونی مغلوب ہو گئے وہاں (بھرے مجمع میں) اور پلٹے ذلیل و خوار ہو کر۔ اور گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے (اور) کہنے لگے: ہم تو ایمان لے آئے سارے جہانوں کے پروردگار پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا"۔

قولہ تعالیٰ: فَوَقَعَ الْحَقُّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تو حق غالب آ گیا(2)۔ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور اس سے فعل صَغِرَ یَصْغَرُ صَغَرًا و صِغَرًا و صَغَارًا ہے۔ یعنی فرعون کی قوم اور ان کے ساتھ فرعون بھی ذلیل و خوار اور مغلوب ہو کر واپس پلٹے اور رہے جادوگر تو وہ ایمان لے آئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"فرعون نے کہا: تم تو ایمان لائے ہوئے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں (اس کے مقابلہ کی) تمہیں اجازت دیتا، بے شک یہ ایک فریب ہے جو تم نے (مل کر) کیا ہے شہر میں تاکہ تم نکال دو یہاں سے اس کے اصلی باشندوں کو ابھی (اس کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں (پہلے) کٹوا دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مختلف طرفوں سے پھر تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا سب کے سب کو۔ وہ بولے: (پرواہ نہیں) ہم تو اپنے رب

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 246 2۔ ایضاً

کی طرف جانے والے ہیں۔ اور تو کیا ناپسند کرتا ہے ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے رب کی آیتوں پر جب وہ آئیں ہمارے پاس، اے ہمارے رب! انڈیل دے ہم پر صبر اور وفات دے ہمیں اس حال میں کہ ہم مسلمان ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ یہ فرعون کی طرف سے ان کا انکار ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا یعنی تمہارے اور ان کے درمیان اس بارے میں اتفاق ہو چکا ہے کہ تم شہر کے والی اور حاکم بن جاؤ، یعنی تمہارے اس صحراء میں ظاہر ہونے سے پہلے یہ مصر کے شہر میں تم میں سے تھا۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یہ ان کے لیے دھمکی اور جھڑک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: سب سے پہلے فرعون نے سولی دی اور ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹے (1) (یعنی) دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ (یا) دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یہ حسن سے مروی ہے۔

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا حسن نے قاف کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی تَنْقَمُ) اخفش نے کہا ہے: یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: نَقِمت الامر و نَقَمته یعنی میں نے اس کا انکار کر دیا۔ (آیت میں مراد یہ ہے) کہ تو ہماری کسی شے کو ناپسند نہیں کرتا سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئے اور وہ حق ہے۔ لَمَّا جَآءَتْنَا جب اس کی آیات اور اس کے دلائل ہمارے پاس آ گئے۔ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا اس میں الافراغ کا معنی ہوتا ہے انڈیلنا، یعنی اے ہمارے رب! سولی پر چڑھائے جانے اور ہاتھ پاؤں کاٹے جانے کے وقت ہم پر صبر انڈیل دے۔ وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ (اور ہمیں اس حال میں وفات دے کہ ہم مسلمان ہوں) پس کہا گیا ہے کہ فرعون نے جادوگروں کو پکڑا اور دریا کے کنارے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے۔ اور جادوگروں کے ایمان لانے کے وقت چھ لاکھ افراد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۸﴾

"اور کہا قوم فرعون کے سرداروں نے: (اے فرعون!) کیا تو (یونہی) چھوڑے رکھے گا موسیٰ اور اس کی قوم کو تاکہ فساد برپا کرتے رہیں اس ملک میں اور چھوڑے رہے موسیٰ تجھے اور تیرے خداؤں کو۔ اس نے (برافروختہ ہو کر) کہا: (ہرگز نہیں بلکہ) ہم تہ تیغ کر دیں گے ان کے لڑکوں کو اور زندہ چھوڑ دیں گے ان کی عورتوں کو۔ اور ہم بے شک ان پر غالب ہیں۔ فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 440

استقامت سے کام لو۔ بلاشبہ زمین اللہ ہی کی ہے وارث بناتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے (مخصوص) ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ یعنی تاکہ وہ افتراق پیدا کر کے اور معاملات کو بکھیر کر (زمین میں فساد برپا کرتے رہیں)۔ وَيَذَرَكَ اس میں را منصوب ہے اور یہ جواب استفہام ہے اور واؤ فا کے قائم مقام ہے۔ وَاٰلِهَتَكَ حسن نے کہا ہے: فرعون بتوں کی عبادت کرتا تھا، پس وہ خود عبادت کرتا تھا اور اس کی عبادت کی جاتی تھی۔

سلیمان تیمی نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ فرعون گائے کی پوجا کرتا تھا۔ تیمی نے کہا ہے: میں نے حسن سے پوچھا کیا فرعون کسی شے کی عبادت کرتا تھا؟ تو انہوں نے کہا: ہاں، بلاشبہ وہ ایک شے کی عبادت کرتا تھا اور وہ اسے اپنی گردن میں ڈال لیتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَاٰلِهَتَكَ کا معنی ہے وطاعتک (اور وہ چھوڑ دے تجھے اور تیری اطاعت و پیروی کو) جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: 31) (انہوں نے بنا لیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر)

بلاشبہ انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی بلکہ انہوں نے ان کی اطاعت کی۔ تو یہ تمثیل ہوگئی۔ اور نعیم بن میسرہ نے رفع کے ساتھ ویذرُک پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے وھو یَذَرُک۔ اور اشہب عقیلی نے وَيَذَرْك مجزوم پڑھا ہے اور یذرک میں ضمہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے تخفیف کی گئی ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رفع اور نون کے ساتھ وَنَذَرُك پڑھا ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ اس کی عبادت چھوڑ دیں گے اگر اس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ چھوڑا۔

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے والاهتك پڑھا ہے اور اس کا معنی عبادتك (تیری عبادت) ہے۔ اس قراءت کے مطابق اس کی عبادت کی جاتی تھی اور وہ کسی کی عبادت نہ کرتا تھا(1)، یعنی اور وہ تیرے لیے اپنی عبادت چھوڑ دے۔ ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس قراءت والوں کا مذہب یہ ہے کہ فرعون نے جب کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات) اور مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص: 38) تو اس میں اس کے لیے کسی اور رب اور الٰہ ہونے کی نفی ہے۔ تو اسے کہا گیا: ویذرك والاهتك اس کا معنی ہے وہ تجھے اور تیرے لیے لوگوں کی عبادت کو چھوڑ دے گا۔ اور عام قراءت وَاٰلِهَتَكَ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ اس معنی پر مبنی ہے کہ فرعون نے اپنے ظاہری حکم میں ربوبیت کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ خود جانتا تھا کہ وہ مربوب ہے اور اس کی دلیل حمام (موت) کی حاضری کے وقت اس کا یہ قول ہے اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ (یونس: 90) (میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل)

لیکن اس کا یہ قول قبول نہ کیا گیا، کیونکہ اس نے یہ اقرار توبہ کا دروازہ بند ہونے کے بعد کیا۔ اور اس حال سے پہلے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 441

الٰہ تھا جس کی وہ خفیہ عبادت کرتا تھا اور رب الاعلیٰ جل وعزا کے سوا تھا۔ یہ حسن وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابی کی قراءت میں الفاظ یہ ہیں۔ اتذر موسیٰ وقومه لیفسدوا فی الارض وقد ترکوك ان یعبدوك اور یہ بھی کہا ہے کہ الفاظ والاھتك ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے: وہ گائے کی پرستش کرتا تھا، جب اس نے گائے کو حسین اور خوبصورت دیکھا تو اس نے اس کی عبادت کا حکم دے دیا اور کہا: انا ربکم و رب ھذہ (میں تمہارا اور اس کا رب ہوں) اور اسی لیے کہا: فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا (طٰہٰ: 88) (پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: اس کے چھوٹے چھوٹے بت تھے اس کی قوم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کی پرستش کرتی تھی تو اسی کی نسبت اس کی طرف دی گئی۔ اور اسی لیے اس نے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات) اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: فرعون کا قول: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور شی کی عبادت کرتے تھے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت کے مطابق بالالاھۃ سے مراد وہ گائے ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس سے مراد سورج لیا ہے اور وہ اس کی عبادت کرتے تھے (1)۔ شاعر نے کہا ہے:

واعجلنا الالاھۃ ان تؤبا

پھر اس نے اپنی قوم کے ساتھ اظہار انس کیا اور کہا: سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ نافع اور ابن کثیر نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لیے تشدید کے ساتھ سنقتل پڑھا ہے۔

وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ (اور ہم ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیں گے) لہٰذا تم ان کی جانب سے خوفزدہ نہ ہو۔ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (اور بے شک ہم ان پر غالب ہیں) اس کلام کے ساتھ اس نے انہیں حوصلہ اور تسلی دی۔ اور اس نے یہ نہیں کہا سنقتل موسیٰ (کہ ہم موسیٰ کو قتل کر دیں گے) کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ اس پر قادر نہیں ہوسکتا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سخت مرعوب تھا، پس جب بھی وہ آپ کو دیکھتا تو وہ اس طرح پیشاب کرنے لگتا جیسے گدھا پیشاب کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تک فرعون کی یہ بات پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ یعنی آپ نے انہیں یہ حرص اور امید دلائی کہ اللہ تعالیٰ انہیں سرزمین مصر کا وارث بنائے گا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ یعنی جنت اس کے لیے ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور عاقبة کل شی سے مراد ہر شے کا انجام اور آخر ہوتا ہے، لیکن جب یہ لفظ مطلق بولا جائے اور کہا جائے: العاقبة لفلان تو اس سے عرف میں خیر اور اچھائی سمجھی جاتی ہے۔ (یعنی خیر اور اچھائی فلاں کے لیے ہے)

قَالُوْۤا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 524

''قوم موسیٰ نے کہا: ہم تو ستائے گئے اس سے پہلے بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس اور اس کے بعد بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس، آپ نے کہا: عنقریب تمہارا رب ہلاک کر دے گا تمہارے دشمن کو اور (ان کا) جانشین بنا دے گا تمہیں زمین میں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْۤا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: ہم تو آپ کی ولادت کی ابتدا میں بیٹوں کو قتل اور عورتوں کو غلامی میں رکھنے کے ساتھ ستائے گئے۔ وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اور اب اسے ہم پر لوٹایا جا رہا ہے، ان کی مراد وہ دھمکی اور وعید ہے جو فرعون کی جانب سے تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے کی اذیت سے مراد یہ ہے(1) کہ وہ نصف دن تک بنی اسرائیل کو اپنے کاموں میں لگائے رکھتے تھے اور پھر بقیہ دن انہیں اپنی کمائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اور بعد کی اذیت یہ تھی کہ وہ سارا دن بغیر کچھ کھلائے پلائے انہیں اپنے کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ یہ جویبر نے کہا ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے: پہلے اور بعد کی اذیت ایک ہی تھی اور وہ ان سے جزیہ لیتا تھا۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ، عَسٰى اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بمعنی واجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نیا وعدہ کیا اور اسے ثابت کر دیا۔ تحقیق وہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں مصر میں خلیفہ بنائے گئے۔ اور انہوں نے یوشع بن نون کے ساتھ بیت المقدس کو فتح کیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے یہ اس وقت کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں نکالا اور فرعون نے ان کا تعاقب کیا پس وہ ان کے پیچھے تھا اور ان کے سامنے سمندر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس وعید کو پورا کر دیا کہ فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا اور انہیں نجات عطا فرمادی۔ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔ یعنی پھر وہ اس عمل کو دیکھے گا جس کے بدلے جزا واجب ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزا نہیں دے گا جو وہ ان کے بارے جانتا ہے، بلکہ اس پر جزا دے گا جو ان سے وقوع پذیر ہوگا۔

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی سے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ سنین سے مراد قحط سالی ہے اور لغت میں یہ معنی معروف ہے۔ کہا جاتا ہے: أصابتهم سنة، أی جدب (انہیں قحط سالی آ پہنچی) اور تقدیر ہے جَدْبُ سنة اور حدیث مبارکہ میں ہے: اللّٰهُمَّ اجعلها علیهم سنین كسنی یوسف (2) (اے اللہ! ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے قحط کی طرح قحط مسلط کر دے) عربوں میں سے کچھ ہیں جو سنین کے نون کو اعراب دیتے ہیں۔ فراء نے شعر بیان کیا ہے:

أرَی مَرَّ السنینِ أخذنَ مِنّی كما أخذَ السِّرار من الهلال

نحاس نے کہا ہے: سیبویہ نے یہ شعر نون کے فتحہ کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن اس بارے میں وہ کہا ہے جو کسی اور کے نزدیک جائز نہیں ہے اور وہ یہ قول ہے:

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 188 2۔ صحیح بخاری، الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136

وقد جاوزتُ رأس الأربعينِ (یعنی اس اربعین کی نون کو کسرہ دیا ہے)

فراء نے بنی عامر سے بیان کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: أقمتُ عنده سِنِيناً يا هذا، اس میں سنین منصرف ہے۔ اور بنو تمیم اسے غیر منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: مضت له سنينُ يا هذا اور سنين سنة کی جمع ہے اور یہاں سنة بمعنی قحط سالی ہے بمعنی حول (سال) نہیں۔ اور اسی سے أسْنَتَ القوم ہے یعنی وہ قحط میں مبتلا ہو گئے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيد لقومه ورجالُ مكةَ مُسْنِتُون عِجَافُ

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور ان کے دل نرم ہو جائیں۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۱

"تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور تو) کہتے ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے، سن لو! ان کی بدفالی تو (مکافات عمل کے قانون کے مطابق) اللہ کے پاس سے ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ یعنی جب ان پر خوشحالی اور وسعت آئی۔ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ یعنی ہم اس کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیں عطا کی گئی ہے۔ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ اور اگر انہیں قحط اور کوئی بیماری آ پہنچتی۔ اور یہی دوسرا مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدفالی پکڑتے (1)، اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ (النساء: 78)

يَّطَّيَّرُوْا اصل میں يتطيروا ہے پھر تا کو طا میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اور طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے فعل ماضی کی بنا پر تطیروا پڑھا ہے۔ اس میں اصل تو التطيرة اور زجر الطير (پرندے کو جھڑکنا) سے ہے۔ پھر ان کا استعمال زیادہ ہو یا یہاں تک کہ ہر بدفالی کو تطیر کہا گیا۔ عرب سانح سے برکت حاصل کرتے تھے اور سانح سے مراد وہ ہے جو دائیں طرف سے آتا ہے اور وہ بارح سے بدفالی پکڑتے تھے اور اس سے مراد وہ ہے جو بائیں طرف سے آتا ہے (2)۔ وہ کوے کی آواز سے بھی بدفالی پکڑتے تھے۔ اور وہ اس سے جدائی اور افتراق کی تاویل کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور وہ پرندوں کے باہم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے سے کئی امور پر استدلال کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے اپنے اوقات مقررہ کے علاوہ آوازیں نکالنے سے بھی۔ اور اسی طرح ہرن سے جب کہ وہ دائیں یا بائیں گزرتا اور جب وہ بائیں گزرتا تو کہتے: میرے لیے بائیں طرف سے آنے والے کے بعد دائیں طرف سے آنے والا کون ہے؟ مگر جو چیز ان کے نزدیک زیادہ قوی تھی وہ تمام پرندوں میں واقع تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ان تمام کا نام تطیر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 190

رکھا۔ اور عجمی لوگ فال پکڑتے تھے جب وہ کسی بچے کو دیکھتے کہ اسے صبح کے وقت معلم کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ اور اس بچے کو دیکھ کر برکت حاصل کرتے تھے جو معلم کے پاس سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہا ہوتا۔ اور وہ اس پانی بھرنے والے (ماشکی) کو دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے جس کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا منہ بند مشکیزہ ہوتا اور اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے جس کا مشکیزہ فارغ اور اس کا منہ کھلا ہوتا۔ اور وہ اس کلی کو دیکھ کر جو بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا اور وہ جانور جس پر بوجھ لدا ہوتا اسے دیکھ کر بری فال پکڑتے تھے اور جس کلی نے اپنا بوجھ اتار دیا ہوتا اور وہ جانور جس سے بوجھ اتار لیا جاتا اسے دیکھ کر نیک فال پکڑتے تھے۔ پس دین اسلام آیا تو اس نے فال پکڑنے اور بدفالی سے منع کر دیا جو پرندے کی آواز سن کر پکڑی جاتی تھی چاہے وہ آواز جو بھی ہو اور جس حال میں ہو۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: أَقِرُّوا الطیرعلی مِکنَاتِها(1) (پرندے کو اپنے انڈوں پر بٹھائے رکھو) اور یہ اس لیے فرمایا کیونکہ بہت سے زمانہ جاہلیت کے لوگ تھے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتے تو وہ پرندے کے پاس اس کے گھونسلے میں آتے اور اسے وہاں اڑاتے۔ پس جب وہ اپنی اڑان میں دائیں سمت اختیار کرتا تو وہ اپنے کام کو چلے جاتے اور یہی ان کے نزدیک سانح (دائیں جانب سے آنے والا) ہے اور اگر وہ بائیں سمت اڑتا تو وہ واپس لوٹ جاتے اور یہی ان کے نزدیک بارح (بائیں جانب سے آنے والا) ہے چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرما دیا: أَقِرُّوا الطیرعلی مِکناتها(2) حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور اہل عرب کہتے ہیں: وُکُناتها امرؤالقیس نے کہا ہے:

وقد أغتَدِی والطّیرُفی وُکناتها

اور الوکنۃ ہر گھونسلے کا نام ہے اور الوکن سے مراد پرندے کی وہ جگہ ہے جہاں وہ انڈے دیتا ہے اور بچے جنتا ہے۔ اور وہ کسی دیوار اور درخت میں کوئی سوراخ یا بل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وَکَنَ الطائرُ یَکِنُ وُکونا جب پرندہ اپنے انڈوں کو سی رہا ہو۔ اور عربوں میں سے ایسے بھی تھے جو فال کو کچھ نہ جانتے تھے۔ اور اسے جھٹلانے والوں کی تعریف کرتے تھے۔ مرقش نے کہا ہے:

ولقد غَدَوْتُ وکنتُ لا أغدُوا علی وَاقٍ د حاتم

فإذا الأشائِمُ کالأیا مِنِ والأیامِنُ کالأشائم

اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو ایک پرندہ چیختے چلاتے گزرا، تو قوم کے ایک آدمی نے کہا: خیر، خیر (بہت اچھا، بہت اچھا) تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ما عند هذا لا خیرٌ ولا شرٌّ (اس کے پاس نہ خیر ہے اور نہ شر)

ہمارے علماء نے کہا ہے: جہاں تک پرندوں کی گفتگو ہے تو اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا جس پر بطور دلالت اسے محمول کیا جاتا ہے اور ان کے پاس کسی شے کے ہونے کا علم ہے چہ جائیکہ وہ مستقبل میں ہونے والی کسی شے کی خبر دیں اور نہ ہی لوگوں میں کوئی ہے جو پرندوں کی بولی جانتا ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کے لیے خاص کیا،

1۔ مسند امام احمد، جلد 6، صفحہ 381 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب العقیقۃ، حدیث نمبر 2452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس فال پکڑنا مکمل طور پر باطل ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لیس منا من تحلم او تکھن أو ردّہ عن سفرہ تطیر (وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے خواب کے بارے جھوٹا دعویٰ کیا یا کہانت اختیار کی (غیب کی بات بتانا) یا بدفالی نے اسے اپنے سفر سے واپس لوٹا دیا)

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فال پکڑنا شرک ہے، تین، اور وہ ہمیں پیش نہیں آتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے توکل کے سبب ختم کر دیتا ہے'' (1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: ''جسے بدفالی نے اپنے کام سے واپس لوٹا دیا تحقیق اس نے شرک کیا''۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ اس کا کفارہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: أن یقول أحدھم اللّٰھمّ لا طیر إلا طیرك ولا خیر إلا خیرك ولا إلٰہ غیرك ثم یمضی لحاجتہ (2) (کہ ان میں سے کوئی یہ کہے: اے اللہ! کوئی فال نہیں سوائے تیری فال کے اور کوئی خیر نہیں سوائے تیری خیر اور بھلائی کے اور تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں یہ کہہ کر پھر وہ اپنے کام کو چلا جائے)

اور ایک دوسری روایت میں ہے: جب تم میں سے کوئی ایسا وہم پائے تو اسے یہ کہنا چاہیے: اللّٰھمّ لا یأتی بالحسنات إلا أنت ولا یذھب بالسیئات إلا أنت لا حول ولا قوۃ إلا بك (3) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی نیکیاں لانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی برائیوں کو مٹانے والا نہیں اور تیرے سوا کوئی طاقت اور قوت نہیں) پھر وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اپنے کام کو چلا جائے تو جو بھی وہ اپنے دل میں اس بارے پائے گا اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا اور جو شے اسے وہم ڈالے گی اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو گا۔ اور فال اور طیرہ میں فرق سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے۔

اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ حسن نے طَیْرُھم پڑھا ہے اور یہ طائر کی جمع ہے یعنی جو ان کے لیے اور ان کے خلاف مقدر کیا گیا ہے (اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے) وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی انہیں جو قحط سالی اور مصائب لاحق ہوئے ہیں وہ بلاشبہ ان کے گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی طرف سے نہیں۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۲

''اور انہوں نے کہا: کیسی ہی تو لے آئے ہمارے پاس نشانی (معجزہ) تاکہ تو جادو کرے ہم پر اس سے ہرگز نہیں ہم تم پر ایمان لانے والے''۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ یعنی فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: مهما۔ خلیل نے کہا ہے: یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکھانۃ والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ ایضاً، حدیث نمبر 3411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ابن ماجہ، حدیث نمبر 3527، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مجمع الزوائد، کتاب الطب، جلد 5، صفحہ 180، حدیث نمبر 8412

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الکھانۃ والتطیر، جلد 2، صفحہ 190۔ حدیث نمبر 3418، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصل میں ما، ماہے (1)۔ پہلا ما شرطیہ ہے اور دوسرا زائدہ ہے جو جزا کے لیے بطور تاکید ہے، جیسا کہ تمام حروف میں زیادتی کی جاتی ہے، مثلاً أما، حیثما، أینما اور کیفما پس علمائے نحو نے ایسے دو حرفوں کو ناپسند کیا جن کا لفظ ایک ہے، تو انہوں نے پہلے کے الف کو ہا سے بدل دیا اور کہا: مھما۔

کسائی نے کہا ہے: اس کی اصل مہ معنی اکفف ہے، رک جا جو بھی تو ہمارے پاس نشانی لے آئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کلمہ مفردہ ہے۔ اس کے ساتھ جزا لائی جاتی ہے تاکہ یہ اپنے مابعد کو بر تقدیر ان جزم دے۔ آیت میں جواب شرط فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ہے۔ لِّتَسْحَرَنَا تاکہ تو ہمیں اس نظریہ سے پھیر دے جس پر ہم ہیں۔ اس لفظ کی وضاحت سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے سجدہ میں گرنے کے بعد بیس برس تک قبط میں رہے اور انہیں معجزات (نشانیاں) دکھاتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا، پس یہ ان کا قول تھا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''پھر بھیجا ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون (یہ سب) واضح نشانیاں تھیں پھر بھی وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ (پیشہ ور) مجرم تھے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اسرائیل نے سماک کے واسطہ سے نوف شامی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آنے کے بعد آل فرعون میں چالیس برس تک ٹھہرے رہے۔ اور محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے منجاب سے بیس سال کا عرصہ روایت کیا ہے، آپ انہیں نشانیاں یعنی ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون کے معجزات دکھاتے رہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: الطُّوْفَانَ اس سے مراد شدید بارش ہے (2) یہاں تک کہ وہ اس میں تیرنے لگے۔ حضرت مجاہد اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ طوفان سے مراد موت ہے (3)۔ اخفش نے کہا ہے: اس کا واحد طوفانۃ ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا کہ رجحان اور نقصان مصدر ہیں، پس اس کے لیے واحد کا کوئی مطالبہ نہیں۔

نحاس نے کہا ہے: لغت میں طوفان وہ ہے جو ہلاک کرنے والا ہو چاہے وہ موت ہو یا سیلاب، یعنی وہ ان پر چکر لگاتا رہا اور انہیں ہلاک کرتا رہا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بنی اسرائیل کو اس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پہنچا، بلکہ وہ قبطیوں کے گھروں میں داخل ہوا یہاں تک کہ وہ اپنی ہنسلیوں تک پانی میں کھڑے رہے۔ اور وہ پانی مسلسل سات دن تک ان پر رہا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ چالیس دن تک رہا۔ تب انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرما دے تو ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس آپ نے رب کریم سے دعا کی تو اس نے ان سے طوفان کو اٹھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 444
3۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 40
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 443

لیا لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سال ان کے لیے گھاس اور فصلوں میں وہ کچھ اگا یا جو اس سے پہلے نہ اگا یا تھا، تو وہ کہنے لگے: وہ پانی تو نعمت تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈی کو بھیج دیا اور یہ ایک معروف حیوان ہے، جراد مذکر و مونث دونوں صورتوں میں جرادۃ کی جمع ہے پس اگر تو ان کے درمیان فرق کرنا چاہے تو پھر صفت لگانا پڑے گی اور تو یہ کہے گا رأیت جرادۃ ذکرا (میں نے نر ٹڈی کو دیکھا) پس وہ ان کے پھلوں اور کھیتیوں سبھی کو کھا گئی یہاں تک کہ وہ چھتوں اور دروازوں کو کھانے لگی اور ان کے گھر گرنے لگے، لیکن بنی اسرائیل کے گھروں میں اس میں سے کوئی شے داخل نہ ہوئی۔

مسئلہ نمبر 3۔ ٹڈی کو مارنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جب وہ کسی زمین میں آئے اور اسے خراب کرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے: اسے نہیں مارا جائے گا۔ اور تمام علمائے فقہ نے کہا ہے: اسے مار دیا جائے گا۔ فریق اول کا استدلال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بہت بڑی مخلوق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتی ہے اور اس پر قلم نہیں چلتا۔

اور اس وجہ سے بھی کہ یہ روایت ہے ''تم ٹڈی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ الاعظم کا لشکر ہے'' (1)۔

اور جمہور نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اسے چھوڑنے میں اموال کا فساد ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مسلمانوں کو قتل کرنے کی رخصت دی ہے جب وہ کسی کا مال لینا چاہے، پس ٹڈی جب اموال کو برباد کرنے کا ارادہ کرے تو بدرجہ اولیٰ اسے قتل کرنا جائز ہوگا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ سانپ اور بچھو کو مارنا جائز ہے؟ کیونکہ وہ دونوں لوگوں کو اذیت دیتے ہیں پس اسی طرح ٹڈی بھی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب ٹڈی کے خلاف دعا کرتے تو اس طرح کہتے: اَللّٰھُمَّ أھلك کبارہ واقتل صغارہ وأفسد بیضہ أقطع دابرہ وخُذْ بأفواھہ عن معایشنا وأرزاقنا إنك سمیع الدعاء (اے اللہ! اس کے بڑوں کو ہلاک کر دے اور اس کے چھوٹوں کو قتل کر دے اور اس کے انڈوں کو فاسد کر دے اور اس کے پیچھے آنے والوں کو قطع کر دے اور اس کے مونہوں سے ہماری معیشت اور ہمارے رزق لے لے بے شک تو دعا کو سننے والا ہے)

ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کے خلاف اس کی دم کٹ جانے کی دعا کیسے کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''بے شک ٹڈی سمندر میں ایک مچھلی کی چھینک (سے پیدا شدہ) ہے'' (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ہم سات غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے اور ہم آپ کے ساتھ ٹڈی کھاتے رہے (3)۔ المختصر اس کے کھانے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ جب اسے کوئی زندہ پکڑ لے اور اس کا سر کاٹ دیا جائے تو یہ بالاتفاق حلال ہے۔ اور یہ اس کو ذبح کرنے کے قائم مقام ہو جاتا ہے، البتہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کیا آدمی اس کے سبب موت کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے جب اسے شکار کیا جائے یا نہیں؟۔

1۔ شعب الایمان فی محنۃ الجراد والصبر علیہا، جلد 7، صفحہ 232، حدیث نمبر 10127

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3211، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 152

تو عام رائے یہی ہے کہ سبب موت جاننے کی ضرورت نہیں، اسے کھایا جائے گا جیسے بھی یہ مرے۔ ان کے نزدیک اس کا حکم مچھلی کے حکم کی مثل ہے۔ یہ نظریہ ابن نافع اور مطرف کا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ سبب موت جاننا لازم اور ضروری ہے، مثلاً اس کے سر کا کٹنا یا پاؤں کا یا اس کے پروں کا کٹ جانا، جب کہ اس کی موت اس سبب سے ہو یا اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ آپ کے نزدیک وہ خشکی کا جانور ہے اور اس کا مردار حرام ہے۔ حضرت لیث مردہ ٹڈی کھانا مکروہ جانتے تھے، مگر جب کوئی اسے زندہ پکڑے پھر وہ مرجائے تو بے شک اسے پکڑنا ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ یہی نظریہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما (1) سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں مچھلی اور ٹڈی اور دو خون (حلال کیے گئے ہیں) جگر اور تلی''۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے: احمد بن منیع، سفیان بن عیینہ نے ابو سعید سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ٹڈی بڑی طشتری میں رکھ کر ایک دوسرے کو بطور ہدیہ دیتی تھیں (2)۔ اسے ابن منذر نے بھی ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ محمد بن منکدر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہزار امتیں پیدا فرمائی ہیں ان میں سے چھ سو سمندر میں ہیں اور چار سو خشکی میں ہیں۔ اور بلاشبہ ان امتوں میں سے سب سے پہلے ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے پس جب ٹڈی ہلاک ہو جائے گی تو باقی امتیں موتیوں کی لڑی کی مثل اس کے پیچھے آئیں گی جب وہ کٹ جائے''۔ اسے حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا: بلاشبہ ان امتوں میں سب سے اول ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے، کیونکہ اسے اس مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے فالتو بچی تھی۔ پھر آدمیوں کے ہلاک ہونے کی وجہ سے وہ امتیں ہلاک ہو جائیں گی کیونکہ یہ ان کے لیے مسخر ہے۔

ہم قبط کے قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں پس انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معاہدہ کیا کہ اگر ان سے ٹڈی کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس آپ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اسے دور کر دیا گیا۔ اور ان کی کھیتوں میں سے ابھی کچھ چیزیں باقی تھیں، تو وہ کہنے لگے: جو باقی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہوگا۔ اور وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جوئیں بھیج دیں۔ اور یہ چھوٹا سا کیڑا ہے۔ یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور الدبی سے مراد اڑنے سے پہلے کی ٹڈی ہے۔ اس کی واحد دباۃ ہے۔ جب کوئی کیڑا زمین کی نباتات کھا جائے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: أرض مدبیۃ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قمل سے مراد وہ سوس (گھن) ہے جو گندم میں ہوتا ہے (3)۔ ابن زید نے کہا (4) ہے: اس سے مراد براغیث (مچھر)

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الصید والذبائح، جلد 4، صفحہ 272

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 444

4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 191

ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے کیڑے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد حمنان ہے اور یہ چچڑی کی ایک قسم ہے، اس کا واحد حمنانۃ ہے۔ پس یہ ان کے جانوروں اور ان کی کھیتیوں کو کھا گئی۔ اور ان کی جلد کے ساتھ چمٹ گئی، گویا کہ یہ ان پر چیچک ہے اور اس نے انہیں سونے اور قرار حاصل کرنے سے روک دیا۔ اور حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: قمل سے مراد جعلان ہے (یعنی سیاہ رنگ کا کیڑا) اور اہل لغت کے نزدیک قمل چچڑیوں کی ایک قسم ہے۔

ابو الحسن اعرابی عدوی نے کہا ہے: قمل چچڑی کی جنس سے ایک چھوٹا سا کیڑا ہے، لیکن یہ اس سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کی واحد قملۃ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس کے خلاف نہیں ہے جو اہل تفسیر نے کہا ہے، کیونکہ یہ مراد لینا جائز ہے کہ یہ تمام اشیاء ان پر بھیجی گئی ہوں اور یہ تمام انہیں اذیت پہنچانے کے اعتبار سے جمع ہو سکتی ہیں۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ عین شمس (اس وقت مصر کا دار الخلافہ) میں ریت کا ایک ٹیلہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا عصا مارا تو وہ قمل (جوئیں) بن گیا۔ قمل کی واحد قملۃ ہے۔ عطا خراسانی نے کہا ہے: اسے قُمَّلٌ اور قُمْلٌ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

اور حسن کی قرات میں ہے والقَمْل یعنی قاف مفتوح اور میم ساکن ہے۔ پس وہ عجز و زاری کرنے لگے لیکن جب ان سے اسے دور کر دیا گیا تو وہ پھر ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈک مسلط کر دیئے۔ ضفادع، ضفدع کی جمع ہے۔ اور یہ وہ معروف جانور ہے جو پانی میں ہوتا ہے (اور اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے)

کہ انہیں مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے امام احمد بن حنبل سے، انہوں نے عبد الرزاق سے اور ابن ماجہ نے محمد بن یحییٰ نیشاپوری ذہلی سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرد (موٹے سر، سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندہ کو شکار کرتا ہے۔ لٹورا) مینڈک، چیونٹی اور ہدہد کو مارنے سے منع فرمایا ہے (1)۔

نسائی نے حضرت عبد الرحمن بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ ایک حکیم نے حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوا میں مینڈک کا ذکر کیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کے مارنے سے منع فرمایا (2)۔ اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صرد پہلا پرندہ ہے جس نے روزہ رکھا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف بنانے کے لیے شام سے حرم پاک کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھ سکینہ (تیز رو ہوا) اور صرد تھے، پس صرد نے مخصوص جگہ کی طرف آپ کی رہنمائی کی اور سکینہ نے اس کی مقدار کی طرف، پس جب آپ اس خاص جگہ تک پہنچے تو سکینہ بیت اللہ شریف کی جگہ پر چلی اور پکار کر کہا: اے ابراہیم! میرے سائے کی مقدار پر (گھر) تعمیر کر دے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرد کو مارنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیت اللہ شریف پر راہنمائی کی اور مینڈک کو مارنے سے منع کیا، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی جانے والی آگ پر پانی ٹپکاتا تھا۔ اور جب یہ فرعون پر مسلط ہوئے تو یہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد 1، صفحہ 239۔ ایضاً، حدیث نمبر 3213-3214، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابی داؤد، کتاب ابواب السلام، باب فی قتل الذر، حدیث نمبر 4583، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد 2، صفحہ 201۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب النوم، باب قتل الضفدع، حدیث 4585، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے اور تمام جگہوں پر چھا گئے۔ جب یہ تنور کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وہاں بھی ڈیرہ ڈال لیا حالانکہ ان میں آگ بھڑک رہی تھی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو تسبیح بنا دیا۔ کہا جاتا ہے: تمام جانوروں سے زیادہ یہ تسبیح کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تم مینڈک کو نہ مارو، کیونکہ اس کی وہ آواز جو تم سنتے ہو وہ تسبیح ہے۔

پس روایت ہے کہ اس (مینڈک) نے ان کے بستروں، برتنوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو بھر دیا تھا ایک آدمی اپنی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا اور جب وہ بات کرتا تو مینڈک اچھل کر اس کے منہ میں داخل ہو جاتا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا اور کہنے لگے: ہم توبہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انہیں دور کر دیا لیکن وہ دوبارہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر خون بھیجا تو ان پر نیل خون بن کر بہنے لگا۔ اسرائیل اس سے پانی کے چلو بھرتے تھے اور قبطی خون کے۔ اسرائیلی قبطی کے منہ میں پانی انڈیلتا تھا تو وہ خون ہو جاتا تھا۔ اور قبطی اسرائیلی کے منہ میں خون انڈیلتا تھا تو وہ میٹھا اور لذیذ پانی ہو جاتا تھا۔

ایٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ یعنی ظاہر اور بین علامات، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ایٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ، حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے ایک نشانی ظاہر کی تھی اور وہ ایک نشانی آٹھ دن تک رہی۔ بعض نے کہا ہے: چالیس دنوں تک رہی۔ اور بعض نے کہا ہے: ایک مہینہ تک رہی پس اسی لیے فرمایا: مُّفَصَّلٰتٍ، فَاسْتَكْبَرُوْا پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے سے تکبر کرتے رہے۔

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اور جب آجاتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے: اے موسیٰ! دعا کر ہمارے لیے اپنے رب سے اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم ہٹا دو گے ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کر دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ پھر جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب ایک مقررہ میعاد تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے تو فوراً انہوں نے (توبہ کا عہد) توڑ دیا۔ پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے اور غرق کر دیا انہیں سمندر میں کیونکہ انہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور وہ اس (آنے والے) عذاب سے بالکل غافل تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ اس میں رجز کا معنی عذاب ہے۔ اسے راکے ضمہ کے ساتھ رُجز بھی پڑھا گیا ہے، اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ عذاب طاعون تھا اس کے ساتھ ستر ہزار قبطی ایک دن میں

1۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 2، صفحہ 253

مرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجز سے مراد وہی آیات اور نشانیاں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اس میں ما معنی الذی ہے، یعنی اس کے سبب جس کا علم اس نے آپ کو ودیعت فرمایا یا اس کے سبب، جس کے ساتھ اس نے آپ کو مخلص فرمایا ہے اور آپ کو آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ قسم ہے، یعنی اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے مگر تم نے ہمارے لیے دعا نہیں کی، پس ما صلہ ہے۔ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ یعنی اگر آپ اپنے اللہ سے دعا کریں یہاں تک کہ وہ ہم سے (عذاب کو) دور فرمادے۔

لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ تو ہم یقیناً اس دین کے بارے آپ کی تصدیق کریں گے جو لے کر آپ تشریف لائے۔ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (اور ہم ضرور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ روانہ کر دیں گے) وہ ان سے خدمت لیتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

إِلَىٰٓ أَجَلٍ هُم بَٰلِغُوهُ یعنی ان کی وہ مدت جو ان کے لیے غرق کرنے کے بارے مقرر کی گئی تھی۔ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ تو فوراً انہوں نے وہ عہد توڑ دیا جو انہوں نے اپنے بارے میں کیا تھا۔ فَٱنتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَٰهُمْ فِى ٱلْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا وَكَانُوا۟ عَنْهَا غَٰفِلِينَ اس میں یم کا معنی سمندر ہے۔ وَكَانُوا۟ عَنْهَا اور اس عذاب سے غافل تھے (یعنی ہا ضمیر سے مراد النقمۃ عذاب ہے) اور اس پر فَٱنتَقَمْنَا دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہا ضمیر سے مراد آیات ہیں یعنی انہوں نے ان کا اعتبار نہ کیا یہاں تک کہ وہ ان سے غافلوں کی طرح ہو گئے۔

وَأَوْرَثْنَا ٱلْقَوْمَ ٱلَّذِينَ كَانُوا۟ يُسْتَضْعَفُونَ مَشَٰرِقَ ٱلْأَرْضِ وَمَغَٰرِبَهَا ٱلَّتِى بَٰرَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ٱلْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ بِمَا صَبَرُوا۟ ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُۥ وَمَا كَانُوا۟ يَعْرِشُونَ ﴿١٣٧﴾

"اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنایا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور پورا ہو گیا آپ کے پروردگار کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے متعلق بوجہ اس کے کہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے برباد کر دیا جو کیا کرتا تھا فرعون اور اس کی قوم اور (برباد کر دیئے) جو بلند مکان وہ تعمیر کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَأَوْرَثْنَا ٱلْقَوْمَ اس میں قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ ٱلَّذِينَ كَانُوا۟ يُسْتَضْعَفُونَ جنہیں خدمت لینے کے سبب ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ مَشَٰرِقَ ٱلْأَرْضِ وَمَغَٰرِبَهَا کسائی اور فراء نے گمان کیا ہے کہ یہ اصل میں فی مشارق الارض و مغاربھا تھا پھر اس سے فی کو حذف کر دیا گیا اور انہیں نصب دے دی گئی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ سرزمین قبط کے وارث بنے اور یہ دونوں مفعول صریح کے طور پر منصوب ہیں۔ کہا جاتا ہے: ورثت المال (میں مال کا وارث بنا) واورثتہ المال (میں نے اسے مال کا وارث بنایا) پس یہ فعل ہمزہ کے ساتھ متعدی ہو گیا اور اس نے دو مفعولوں کو نصب دی۔ اور الارض سے مراد شام و مصر کی زمین ہے۔ اور مشارقھا و مغاربھا سے مراد اس کی شرق و غرب کی جہتیں ہیں۔ پس

اس میں الارض مخصوص ہے۔ یہ حسن اور قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ساری زمین ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہ دونوں پوری زمین کے بادشاہ تھے۔ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا یعنی اس میں ہم نے کھیتیاں، پھل اور نہریں نکال کر برکت رکھ دی۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وہ یہ ارشاد ہے: وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ (القصص) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنادیں انہیں پیشوا اور بنادیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث)

بِمَا صَبَرُوْا یعنی ان کے اس صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے فرعون کی اذیت اور ستانے پر کیا اور الله تعالیٰ کے حکم پر صبر کرنے کے عوض جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کیا۔ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ کہا جاتا ہے: عَرَشَ یَعْرِشُ (1) جب وہ تعمیر کرے، بنائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یعنی جو وہ محلات اور بلند مکان وغیرہ تعمیر کرتے تھے ہم نے انہیں برباد کر دیا(2)۔

اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد بیلوں کو بلندی پر چڑھانا ہے۔ ابن عامر اور ابوبکر نے عاصم سے را کے ضمہ کے ساتھ یَعْرُشُون پڑھا ہے(3)۔ کسائی نے کہا ہے: یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابراہیم بن ابی عبلہ نے یُعَرِّشون یعنی را کو مشدد اور یا کو مضموم پڑھا ہے۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝۱۳۸

''اور ہم نے پار اتارا بنی اسرائیل کو سمندر سے تو گزرے وہ ایک ایسی قوم پر جو مگن بیٹھے تھے اپنے بتوں کی عبادت میں، بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! بناؤ ہمارے لیے بھی ایک (ایسا) خدا جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا: یقیناً تم جاہل (اور بے سمجھ) لوگ ہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ حمزہ اور کسائی نے کاف کو کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: عَكَفَ یَعْكِفُ و یَعْكُفُ اس کا معنی ہے کسی شے پر قائم رہنا اور اسے لازم پکڑنا۔ دونوں بابوں سے اس کا مصدر مفعول کے وزن پر آتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قوم لخم تھی اور وہ رقہ میں اترے ہوئے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے بت گائے کے مجسمے تھے(4)، اسی لیے سامری نے ان کے لیے بچھڑا نکالا تھا۔ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اسی کی مثل عرب جہلاء کا قول ہے درآنحالیکہ انہوں نے کفار کا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 194
2۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 55
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 532
4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 194

ایک سبز درخت دیکھا تھا اس کا نام ذات انواط تھا وہ ہر سال میں ایک دن اس کی تعظیم کرتے تھے: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے لیے ایک ذات انواط بنادیں جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اکبر۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم نے اسی طرح کہا جیسے قوم موسیٰ نے کہا تھا: اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (1) یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقہ پر پورے پورے چلو گے حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم بھی اس میں داخل ہو گے"۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حنین کی طرف نکلنے کے دوران واقعہ پیش آیا۔ اس کا بیان سورۂ براۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

"بے شک یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں تباہ ہو کر رہیں گے اور باطل ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: کیا بغیر اللہ کے میں تلاش کروں تمہارے لیے کوئی اور خدا حالانکہ اسی نے فضیلت دی ہے تمہیں سارے جہانوں پر"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ، متبر بمعنی مهلك (ہلاک کیا گیا) ہے اور تبار بمعنی ہلاک) ہے (2)۔ ہر ٹوٹا ہوا برتن متبر کہلاتا ہے۔ اور أمر متبر (تباہ حال معاملہ) یعنی بلاشبہ عابد اور معبود ہلاک ہو کر رہیں گے۔ اور قولہ وَ بٰطِلٌ یعنی ختم ہو جانے والا اور اڑ جانے والا ہے۔ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس میں کانوا صلہ زائدہ ہے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا یعنی آپ نے فرمایا: کیا میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا تلاش کروں؟ کہا جاتا ہے: بغیتہ و بغیت لہ (میں نے اسے چاہا اور اس کے لیے طلب کیا) وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ یعنی حالانکہ اسی نے تمہیں تمہارے زمانے کے عالمین پر فضیلت دی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ اور ان آیات اور نشانیوں کے ساتھ جن کے ساتھ انہیں خاص فرمایا انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

"اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے جو چکھاتے تھے تمہیں سخت عذاب، مار ڈالتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی"۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے احسانات یاد دلائے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو خطاب ہے، یعنی تم وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف کو نجات دی، جیسا کہ اس کی وضاحت سورۃ البقرہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 57
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 448

میں گزر چکی ہے۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس رات کا اور مکمل کیا اسے دس راتوں سے، سو پوری ہوگئی اس کے رب کی میعاد چالیس راتیں۔ اور (طور پر جاتے وقت) کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا نائب رہنا میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کے راستہ پر''۔

قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عزت و تکریم عطا فرمائی۔ پس اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا وعدہ فرمانا ان کے لیے باعث عزت و تکریم تھا۔ وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ حضرت ابن عباس (1)، حضرت مجاہد اور حضرت مسروق رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: یہ ذوالقعدہ اور ذوالحج کے دس دن تھے۔ آپ کو حکم ہوا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھیں اور آپ اس میں اس عبادت کے ساتھ منفرد ہوں گے، پس جب آپ نے روزے رکھے تو آپ نے اپنے منہ کی بو کو ناپسند کیا اور مسواک کی۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے خرنوب کی لکڑی سے مسواک کی، تو ملائکہ نے کہا: بلاشبہ ہم آپ کے منہ سے کستوری کی خوشبو سونگھتے تھے تو آپ نے مسواک کے ساتھ اسے فاسد کر دیا ہے۔ پس آپ پر ذوالحجہ کی دس راتیں اور بڑھا دی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب آپ نے مسواک کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی: ''اے موسیٰ! میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا یہاں تک کہ تیرا منہ اس حالت پر واپس لوٹ آئے جس پر پہلے تھا۔ کیا تو جانتا نہیں ہے کہ روزے دار کے منہ کی بو میرے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے'' (2)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مزید دس دن آپ کو روزے رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا شرف یوم نحر (دسویں ذوالحج) کی صبح کو حاصل ہوا جس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام قربانی کے عوض ذبح ہونے سے محفوظ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حج مکمل کیا۔ عشر کے لفظ کے آخر سے ہا کو اس لیے حذف کر دیا گیا، کیونکہ معدود مونث ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ثلاثین اور عشرۃ سے مراد چالیس ہے، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے تیس دن انہی میں سے دس دنوں کے ساتھ مکمل کیے۔ پس یہ واضح کر دیا کہ وہ دس تیس کے سوا ہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ سورۂ بقرہ میں اربعین (چالیس) کہا ہے اور یہاں ثلاثین (تیس) فرمایا ہے، پس یہ نیا کلام ہو جائے گا۔ تو کہا گیا ہے: اس طرح نہیں ہے۔ تحقیق فرمایا: وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ تو اربعون، اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 59
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 195

ثلاثون وعشرۃ یہ ایک ہی قول ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں (کیونکہ دونوں کا معنی چالیس ہے) پس اللہ تعالیٰ نے تفصیل و تالیف کے طریقہ پر دو قول ارشاد فرمائے۔ پس قول مرکب میں اربعین فرمایا، اور پھر فرمایا ثلاثین، یعنی مسلسل ایک مہینہ اور دس دن۔ سب کا معنی چالیس ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

عشر و اربع......

یعنی چودہ، چاند کی رات۔ اور یہ کلام عرب میں جائز ہے۔

مسئلہ نمبر2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کسی معاہدہ کی مدت مقرر کرنا سنت ماضیہ ہے اور قدیمی معنی ہے اسے اللہ تعالیٰ نے قضایا (فیصلوں) میں بنیاد بنایا ہے اور اس کے ساتھ امتوں کے فیصلے فرمائے ہیں اور اس کے ساتھ انہیں اعمال میں تاخیر کرنے کی مقدار پر آگاہ کیا ہے، پس پہلی مدت جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ چھ دن ہے جن میں اس نے تمام مخلوقات کو تخلیق فرمایا ہے۔ **وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ** (ق) (اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں) ہم اس کا معنی اس سے قبل اسی سورۃ میں **اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ** (الاعراف:54) کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے بیان فرمایا ہے: جب کسی معنی (مقصد) کے لیے مدت مقرر کر دی جائے تو اس میں مؤجل کو حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے اور جب وہ مدت آجائے اور وہ شے میسر نہ ہو تو اس میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے اور بطور عذر اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بیان فرمایا اور ان کے لیے تیس دن مقرر فرما دیے پر ان میں دس دن مزید بڑھا دیئے تاکہ چالیس مکمل ہو جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دس دن اپنی قوم پر تاخیر کر دی اور وہ اس تاخیر اور تاخر کے جواز کو نہ سمجھ سکے، یہاں تک کہ وہ کہنے لگے: بلاشبہ موسیٰ بہک گیا یا بھول گیا (نعوذ باللہ من ذالک) اور انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا۔ اور آپ کے بعد انہوں نے اپنا نظریہ بدل دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور الٰہ کی عبادت کرنے لگے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: بلاشبہ میرے رب نے میرے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ فرمایا کہ میں اس سے شرف ملاقات حاصل کروں اور میں تم میں حضرت ہارون علیہ السلام کو نائب اور خلیفہ بنا رہا ہوں۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا۔ پس ان کا وہ فتنہ جس میں انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی انہی دس دنوں میں وقوع پذیر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر زائد کیے تھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ زیادتی جو مقررہ مدت پر ہوتی ہے وہ اسی طرح مقدر ہوتی ہے جیسے وہ مقررہ مدت مقدر ہوتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتی مگر حاکم کے ایسے اجتہاد کے ساتھ جو اس معاملہ سے متعلقہ معانی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 790

مثلاً وقت، حال اور عمل میں غور وفکر کرنے کے بعد ہو، پس یہ گزشتہ مدت کے ثلث (تہائی) کے مثل ہو سکتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مقرر فرمائی۔ اگر حاکم مناسب خیال کرے کہ وہ اپنے لیے اصل کو اجل اور زیادتی کو ایک ہی مدت میں جمع کرلے تو یہ جائز ہے، لیکن اس کے بعد انتظار ضروری ہے تاکہ انسان پر عذر طاری ہو جائے، یہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے بندے کو معذور قرار دیا ہے اور اس کی مدت کو مؤخر کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے"۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بھی حکام کے محکوم علیہ کو یکے بعد دیگرے معذور قرار دینے کی اصل ہے اور یہ مخلوق کے ساتھ لطف وعنایت ہے اور چاہیے کہ طاقتور حکام ان پر حق نافذ کریں۔

کہا جاتا ہے: أعذر فی الأمر أی بالغ فیہ یعنی اس نے معاملہ میں حد درجہ کوشش کی اتنی کہ اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہو سکتی (یعنی اس کے بعد کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا) اور بنی آدم کے لیے سب سے بڑی کوشش ان کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمانا ہے تاکہ ان پر حجت مکمل ہو جائے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (الاسراء) (اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو)

اور فرمایا: وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (فاطر: 37) (اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا) کہا گیا ہے کہ یہ رسل علیہم السلام ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد بڑھاپا ہے، کیونکہ وہ کہولت کی عمر میں آجاتا ہے اور یہ بچپن کی عمر سے مفارقت اور جدائی کی علامت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ساٹھ برس کو عذر دور کرنے کی غایت اور انتہا قرار دیا ہے، کیونکہ ساٹھ برس بندوں کے انتہائی تجربہ کار ہونے کے قریب ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے، خشوع وخضوع پیش کرنے اور اطاعت وفرمانبرداری کی عمر ہے۔ اور اس میں موت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات تاک میں ہوتی ہے۔ پس اس میں کوشش کے بعد کوشش ہے (اور ڈراوے کے بعد ڈراوا ہے) پہلا (ڈراوا) نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور دوسرا بڑھاپے کے ساتھ اور یہ چالیس برس مکمل ہونے کے وقت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (الاحقاف: 15) پس اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ جو آدمی چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے تو اب اس کے لیے وقت ہے کہ وہ اپنی ذات پر اور اپنے والدین پر اللہ تعالیٰ کے احکامات واحسانات کی مقدار کو جانے اور ان کا شکر ادا کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اپنے شہر کے اہل علم کو جانتا ہوں، وہ دنیا تلاش کرتے رہتے ہیں اور لوگوں میں مل جل کر رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے چالیس برس پورے ہو جاتے ہیں، پس جب ان پر یہ وقت آجائے تو وہ لوگوں سے علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ تاریخ راتوں سے (شمار) ہوتی ہے نہ کہ دنوں سے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (تیس راتیں) کیونکہ راتیں ہی مہینوں کی ابتدا ہیں۔ اور انہی کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایام کے

بارے خبر دیتے تھے، یہاں تک کہ مروی ہے کہ وہ کہتے تھے: صُمنا خمسًا مع رسول الله ﷺ (ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پانچ روزے رکھے)۔ اور عجمی اس میں مخالفت کرتے ہیں اور وہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے ہیں، کیونکہ ان کا اعتماد سورج پر ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورج کا حساب منافع (بیع، شرا اور اجارہ وغیرہ) کے لیے ہے اور چاند کا حساب مناسک (احکام) کے لیے ہے، اسی لیے فرمایا: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً کہا جاتا ہے: أرختُ تاریخا اور ورختُ توریخا (میں نے تاریخ بیان کی) اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ اس کا معنی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی مناجات کے لیے جانے اور اسی میں اپنے آپ کو مشغول رکھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو فرمایا: تم میرے نائب اور خلیفہ ہو۔ پس یہی ارشاد اپنا نائب اور خلیفہ بنانے پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت علی کو فرماتے ہوئے سنا ہے جب آپ ﷺ نے انہیں ایک غزوہ کے وقت اپنا نائب بنایا: أما ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبئ بعدى (1) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے) اس روایت سے روافض، امامیہ اور شیعہ کے تمام فرقوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر خلیفہ اور نائب بنایا، یہاں تک کہ امامیہ نے صحابہ کرام کو کافر قرار دیا۔ قبحہم اللہ (اللہ تعالیٰ ان کا برا کرے)

نوٹ: اب ان کے معتدل علماء اس قسم کے اقوال سے اجتناب کرتے ہیں اور خلفاء راشدین، امہات المومنین اور صحابہ کرام کے بارے میں تکریم کے الفاظ ذکر کرتے ہیں۔

کیونکہ ان کے نزدیک انہوں نے اس عمل کو ترک کر دیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے۔ اور انہوں نے آپ کے سوا کسی اور کو اجتہاد کے ساتھ خلیفہ بنا لیا۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دیا جب آپ اپنے حق کے مطالبہ کے لیے نہ اٹھے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے اپنے کفر میں اور ان کے کفر میں جو ان کے قول کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں کوئی شک نہیں ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی میں کسی کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا اس وکالت کی طرح ہے جو موکل کے معزول کرنے یا اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور یہ اس کی وفات کے بعد تک باقی رہنے کا تقاضا نہیں کرتی، پس اس سے وہ مسئلہ حل ہو جائے گا جس کے ساتھ امامیہ وغیرہ کا تعلق ہے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ پر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور کئی دوسروں کو نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور اس سے بالاتفاق ان کی خلافت کا دائمی ہونا لازم نہیں۔ اور اس بنا پر بھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اصل رسالت میں شریک کیا گیا تھا، پس ان کے لیے اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو قصد انہوں نے کیا ہے۔ واللہ الموفق للہدایۃ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 278

قولہ تعالیٰ: وَ اَصْلِحْ یہ اصلاح سے امر ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اصلاح میں سے یہ تھا کہ آپ سامری کو زجرو توبیخ کرتے اور اسے بدل دیتے (1)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور ان کے امور کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کی اصلاح کریں، یعنی مصلح ہو جائیں۔

وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ یعنی آپ گنہگاروں اور نافرمانوں کی راہ نہ چلیں۔ اور نہ ہی ظالموں کے معاون و مددگار بنیں۔

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۴۳

"اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے (تو اس وقت) عرض کی: اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے مجھے، البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے پھر جب تجلی ڈالی ان کے رب نے پہاڑ پر تو کر دیا اسے پاش پاش اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب آپ کو ہوش آیا تو عرض کی: پاک ہے تو (ہر نقص سے) میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا یعنی جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے۔ وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ اور ان کے رب نے انہیں بلا واسطہ اپنا کلام سنایا۔ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ تو آپ نے رب کریم کا دیدار کرنے کی التجا کی، اور جب اس نے آپ کو اپنا کلام سنایا تو آپ دیدار الٰہی کے مشتاق ہوئے۔ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ تو رب کریم نے فرمایا: تم دنیا میں مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے کہ آپ نے یہ ارادہ کیا۔ مجھے ایک عظیم نشانی دکھا تاکہ میں تیری قدرت کا نظارہ کر سکوں۔ کیونکہ آپ نے عرض کی اِلَيْكَ (تیری طرف) اور رب کریم نے فرمایا: قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ اگر آپ کسی آیت اور نشانی کا سوال کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو وہ عطا فرما دیتا جو آپ مانگتے، جیسا کہ اس نے آپ کو دیگر تمام آیات اور نشانیاں عطا فرمائی تھیں، حالانکہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کسی دوسری آیت اور نشانی کی طلب سے اظہار عجز ہے، پس یہ تاویل باطل ہے۔ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ آپ کے لیے اس شے سے مثال بیان کی گئی جو اپنی بناء کے اعتبار سے زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہے، یعنی اگر پہاڑ اپنی جگہ پر ثابت رہا اور ساکن رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے اور اگر وہ ساکن نہ رہا تو پھر بلاشبہ تم میری رؤیت کی طاقت نہیں رکھ سکتے، جیسا کہ پہاڑ مجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 450

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے قاضی ابوبکر بن طیب سے جو ذکر کیا ہے اس کا مفہوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اسی لیے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور یہ کہ پہاڑ نے اپنے رب کو دیکھا تو وہ یہ جان کر پاش پاش ہو گیا کہ اللہ کریم نے اسے اس کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ اور انہوں نے اس کا استنباط اس ارشاد گرامی سے کیا ہے: وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ پھر فرمایا: فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا، تجلی کا معنی ہے ظہر (ظاہر ہونا) یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: جلوتُ العروس ای أبرزتُها (میں نے دلہن کو ظاہر کیا) اور جلوتُ السیف (میں نے تلوار کو زنگ سے صاف کیا) ان دونوں میں جلا کا معنی موجود ہے اور تجلی الشی کا معنی ہوتا ہے انکشف (ظاہر ہونا، منکشف ہونا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تجلی أمرہ و قدرتہ (یعنی اس نے اپنا امر اور اپنی قدرت کا اظہار کیا) یہ قطرب وغیرہ نے کہا ہے۔

اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت دکًّا ہے۔ اور اس کی صحت پر دکت الأرض دکًّا دلالت کرتا ہے۔ اور بلاشبہ پہاڑ (جبل) مذکر ہے اور اہل کوفہ نے دکاء پڑھا ہے یعنی اسے ارض دکاء کی مثل قرار دیا ہے۔ اور اس سے مراد ہموار زمین ہے جہاں پہاڑ نہ ہوں۔ اور اس کا مذکر ادک ہے۔ اور دکاء کی جمع دکاوات اور دُک ہے جیسا کہ حمراوات اور حمر ہیں۔ کسائی نے کہا ہے: الدك من الجبال کا معنی ہے پہاڑ کا چوڑا ہو جانا، اس کی واحد ادك ہے۔ ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: دکاء کی جمع دکاوات ہے۔ اس سے مراد مٹی کی وہ راب (اور کیچڑ) ہے جس میں شدت اور سختی نہ ہو۔ اور اسی طرح الدکدات من الرمل کا معنی ہے: وہ ریت جو زمین کی کوہان نہ ہو۔

اور ایک تفسیر میں ہے: پہاڑ زمین میں دھنس گیا اور وہ اب بھی اس میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے اسے مٹی بنا دیا۔ عطیہ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد اڑنے والی ریت ہے۔ وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آپ مردہ ہو کر گر پڑے۔ کہا جاتا ہے: صَعِق الرجل فهو صَعِق و صُعِق فهو مصعوق حضرت قتادہ اور حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نویں ذی الحجہ جمعرات کے دن بیہوش ہو کر گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے دسویں ذوالحجہ جمعہ کے دن آپ کو تورات عطا فرمائی (1)۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ کی التجا کرنے سے توبہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: آپ نے یہ عرض بغیر اجازت لیے کی، پس اسی لیے آپ نے توبہ کی۔ اور بعض نے کہا ہے: آیات و علامات کے ظہور کے وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور خشوع و خضوع کے اظہار کے لیے یہ کلمات کہے۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ توبہ کسی معصیت سے نہ تھی، کیونکہ انبیاء معصوم ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک بھی رؤیت باری تعالیٰ جائز ہے۔ مبتدعہ کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے یہ التجا ایک قوم کے لیے کی تا کہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ جائز نہیں ہے اور یہ توبہ کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 539

کہا گیا ہے: میں تیری بارگاہ میں قبطی کے قتل سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ الانعام میں یہ بیان گزر چکا ہے کہ رؤیت جائز ہے۔

علی بن مہدی طبری نے بیان کیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال محال ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کا اقدام نہ کرتے، جیسا کہ رب کریم کو یہ کہنا جائز نہیں ہے: اے رب! کیا تیری کوئی بیوی اور بیٹا ہے۔ عنقریب سورۃ القیامہ میں معتزلہ کا مذہب اور ان کا رد آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں اپنی قوم میں سے پہلا مومن ہوں۔ بعض نے کہا ہے: اس زمانے میں بنی اسرائیل میں سے میں پہلا مومن ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: یقیناً اس بارے میں تیرا پہلے وعدہ ہے کہ دنیا میں تجھے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حدیث صحیح میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کے درمیان (ترجیح کا) چناؤ نہ کرو، کیونکہ لوگ قیامت کے دن صعقہ کے سبب گرے پڑے ہوں گے تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا پس میں اچانک موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ عرش کے پائیوں میں سے ایک کو پکڑے ہوئے ہیں، سو میں نہیں جانتا کہ کیا ان پر بھی صعقہ طاری ہوا ان لوگوں میں جن پر صعقہ طاری ہوا اور پھر انہوں نے مجھ سے افاقہ پالیا یا پہلے صاعقہ کے ساتھ ہی ان کا حساب لیا گیا'' (1) یا فرمایا ''یا ان کے لیے پہلا صعقہ ہی کافی ہوا''۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام اور رؤیت کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو مرتبہ شرف ہمکلامی عطا فرمایا۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار شرف دیدار حاصل کیا۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغمبری سے اور اپنے کلام سے اور لے لو جو میں نے دیا ہے تمہیں اور ہو جاؤ شکرزار بندوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ، الاصطفاء بمعنی الاجتباء ہے۔ یعنی میں نے تجھے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور پھر آیت میں علی الخلق (مخلوق پر) نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس اصطفاء اور سرفرازی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور تحقیق اس نے ملائکہ سے بھی کلام فرمایا ہے اور اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جب کہ آپ کے علاوہ بھی اس نے رسول مبعوث فرمائے ہیں، پس عَلَی النَّاسِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت نافع اور ابن کثیر نے صیغہ مفرد کے ساتھ برسالتی پڑھا ہے (2)۔ اور باقیوں نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور الرسالۃ مصدر ہے، پس اسے مفرد لانا جائز ہے۔ اور جو جمع لائے ہیں وہ اس بنا پر ہے کہ آپ

1۔ صحیح بخاری، سورۃ اعراف، جلد 2، صفحہ 668 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

کو رسالت کی انواع واقسام کے ساتھ بھیجا یا اس کی انواع مختلف ہیں، نتیجۃ مصدر کی جمع اس کی انواع کے اختلاف کی وجہ سے ہے، جیسے فرمایا: اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (لقمان) أصوات (آوازیں) کی اجناس کے اختلاف اور آواز نکالنے والوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے اسے جمع لایا گیا ہے۔ اور لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ میں اسے واحد ذکر کیا، کیونکہ اس میں آوازوں میں سے ایک جنس کا ارادہ کیا ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کی قوم وصف تکلم میں آپ کے ساتھ شریک نہیں اور نہ ہی ستر افراد میں سے کوئی ایک آپ کے ساتھ شریک ہے، جیسے ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ یہ قناعت کرنے کی طرف اشارہ ہے، یعنی آپ اس پر قناعت کریں جو میں نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ یعنی میں نے جو احسانات تم پر کیے ہیں اور جو میرا فضل تم پر ہے اس کا اظہار کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے: دابۃ شکور یہ کہا جاتا ہے جب جانور کا موٹاپا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ اور شاکر (شکر گزار) کو مزید کی پیشکش کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) (کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا)۔ اور روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے بعد چالیس راتیں ٹھہرے رہے جس نے بھی آپ کو دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کے نور کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

”اور ہم نے لکھ دی موسیٰ کے لیے تختیوں میں ہر چیز نصیحت پذیری کے لیے اور (لکھ دی) تفصیل ہر چیز کی پھر (فرمایا) پکڑ لو اسے مضبوطی سے اور حکم دو اپنی قوم کو کہ پکڑ لیں اس کی اچھی باتیں، عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں نافرمانوں کا (برباد شدہ) گھر“۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ اس میں الواح سے مراد تورات ہے۔ اور خبر میں روایت ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے آپ کو اپنے پر کے ساتھ اٹھایا اور بلندی میں لے گئے حتی کہ آپ کو اتنا قریب کیا کہ آپ نے قلم چلنے کی آواز سنی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے تختیاں لکھیں۔ اسے حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ تختیاں سبز رنگ کے زمرد کی تھیں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: وہ سرخ یاقوت کی تھیں۔ ابو العالیہ نے کہا ہے: وہ زبرجد کی تھیں۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں (1)۔ اور وہ آسمان سے نازل ہوئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ٹھوس پتھر سے بنی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نرم وملائم کر دیا تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ کاٹ دیا پھر اسے اپنی انگلیوں کے ساتھ شق کیا، تو اس پتھر نے آپ کی اسی طرح اطاعت کی جیسے لوہے نے حضرت داؤد علیہ السلام کی کی۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے تختیوں میں اس طرح لکھ دیا ہے جیسے انگوٹھی کا نقش

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 452

ہوتا ہے۔ (یعنی سب ان میں کندا کر دیا ہے)

حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے: تورات نازل ہوئی تو وہ ستر اونٹوں کا بوجھ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت اپنی ذات کی طرف تشریف کے لیے کی ہے، حالانکہ یہ تختیاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھی گئیں اور انہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے اس قلم کے ساتھ لکھا جس کے ساتھ ذکر (قرآن کریم) لکھا۔ اور نہر نور سے سیاہی لی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تحریر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا اور اسے تختیوں میں تخلیق کر دیا۔ اور اللوح کی اصل لوح لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿﴾ (البروج) تو گویا تختی وہ ہے جس میں معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور روایت ہے کہ وہ دو تختیاں تھیں اور جمع (الواح) اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ دو بھی جمع ہے۔

اور کہا جاتا ہے: رجل عظیم الألواح یہ تب کہا جاتا ہے جب کسی آدمی کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کی ہڈی بڑی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: تختیاں اس وقت ٹوٹ گئیں جب آپ نے انہیں پھینکا پس سوائے چھٹی تختی کے وہ سب اٹھالی گئیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساتویں تختی باقی رہی اور بقیہ چھ اٹھالی گئیں پس وہ جو اٹھالی گئی اس میں ہر شے کی تفصیل درج تھی اور جو باقی رہی اس میں ہدایت اور رحمت کا ذکر تھا۔

حافظ ابونعیم نے عمرو بن دینار سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے انہوں نے چالیس راتیں روزہ رکھا اور جب تختیوں کو پھینکا اور وہ ٹوٹ گئیں تو آپ نے پھر اسی طرح روزے رکھے تو وہ پھر آپ کی طرف واپس لوٹا دی گئیں۔ اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد حلال و حرام کی وضاحت اور آپ کے دین کے احکام میں سے ہر وہ شے ہے جس کی آپ کو احتیاج اور ضرورت تھی۔ یہ معنی ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ایسا لفظ ہے جو تفخیم کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اس سے تعمیم مراد نہیں ہوتی، مثلاً آپ کہتے ہیں: دخلتُ السوق فاشتریتُ کلَّ شیء (میں بازار میں داخل ہوا اور میں نے ہر شے خرید لی) عند فلان کل شیء (فلاں کے پاس ہر شے ہے) اور تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ (الاحقاف:25) (تہس نہس کر کے رکھ دے گی ہر چیز کو) وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (النمل:23) (اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی احکام میں سے ہر اس شے کی تفصیل جس کا انہیں حکم دیا گیا، کیونکہ ان میں اجتہاد نہیں تھا، بلکہ یہ صرف امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص ہے۔ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ اس کلام میں حذف ہے، یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا (ای فقلنا له): اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، یعنی پوری کوشش اور نشاط کے ساتھ۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (البقرہ:63) (پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے) اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا یعنی اپنی قوم کو حکم دو وہ اوامر پر عمل کریں اور نواہی کو چھوڑ دیں اور ضرب الامثال اور نصائح و مواعظ میں تدبر اور غور و فکر کریں۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے: وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر:55) (اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے) اور فرمایا: فَيَتَّبِعُوْنَ

اَحْسَنَهٗ (زمر:18) (کہ وہ اتباع اور پیروی کریں اس کی اچھی باتوں کی) پس معاف کر دینا قصاص لینے سے اچھا ہے۔ اور صبر کرنا انتقام لینے سے احسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اچھی چیزیں فرائض اور نوافل ہیں اور گھٹیا مباح ہے۔

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دَارَ الْفٰسِقِيْنَ سے مراد وہ ہے جس پر سے وہ گزرے جب انہوں نے سفر کیا یعنی قوم عاد و ثمود کے گھر اور وہ بستیاں جو برباد کر دی گئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد جہنم ہے۔ یہ حسن اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، یعنی چاہیے کہ تم انہیں یاد رکھو اور اس سے بچو کہ تم ان میں سے ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے مصر کا ارادہ کیا ہے، یعنی میں عنقریب تمہیں قبطیوں کے گھر اور فرعون کے وہ مسکن دکھاؤں گا جو اب ان سے خالی پڑے ہیں۔ یہ حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں عنقریب تمہیں کفار کے وہ گھر دکھاؤں گا جن میں تم سے پہلے جبابرہ اور عمالقہ سکونت پذیر رہے تاکہ ان سے عبرت حاصل کرو، مراد شام ہے۔ یہ دونوں قول ان دونوں پر دلالت کرتے ہیں وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ، الآیہ (الاعراف:137) (اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنا دیا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی) وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ الآیہ (القصص:5) (اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباس اور قسامہ بن زہیر رضی اللہ عنہم نے سأورثکم پڑھا ہے یہ ورث سے ہے۔ اور یہ ظاہر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الدار سے مراد الھلاك (ہلاک کرنا) ہے اور اس کی جمع ادوار ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کو غرق کیا تو سمندر کو حکم ارشاد فرمایا کہ ان کے جسموں کو ساحل پر پھینک دے، فرمایا: پس اس نے ایسے ہی کیا، تو بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک ہونے والے فاسق دکھا دیئے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

''میں پھیر دوں گا اپنی نشانیوں سے ان لوگوں (کی توجہ) کو جو غرور کرتے پھرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیوں کو (تو بھی) نہ ایمان لے آئیں ان پر اور دیکھ بھی لیں راہ رشد و ہدایت تب بھی نہ بنائیں اسے (اپنا) راستہ اور اگر دیکھیں گمراہی کے راستہ کو (توجھٹ) بنا لیں اسے (اپنی راہ) غفلت برتنے والے۔ اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو، ضائع ہو گئے ان کے سارے اعمال۔ کیا انہیں جزا

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 543

دی جائے گی سوائے اس کے جو وہ کیا کرتے تھے؟ (ہرگز نہیں)''۔

قولہ تعالیٰ: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں اپنی کتاب کی فہم اور سمجھ سے روک دوں گا۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے بھی یہی کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: میں اس کے سبب انہیں ایمان سے پھیر دوں گا۔ بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہی آیات کے نفع سے پھیر دوں گا۔ اور یہ ان کے تکبر اور غرور کی جزا (اور بدلہ) ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف:5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اس معنی کی بناء پر آیات سے مراد معجزات ہیں یا نازل کردہ کتب ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد زمین و آسمان کی تخلیق ہے یعنی میں انہیں ان کا اعتبار کرنے (مراد عبرت حاصل کرنے) سے پھیر دوں گا۔ یَتَكَبَّرُوْنَ یعنی وہ اپنے آپ کو افضل الخلق گمان کرتے ہیں۔ اور یہ گمان باطل ہے، پس اسی لیے فرمایا: بِغَیْرِ الْحَقِّ یعنی نہ وہ اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع و پیروی کرتے تھے اور نہ ہی اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے ان کی طرف توجہ کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا یعنی یہ ان تکبر کرنے والوں کا انداز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ وہ چھوڑ دیں راہ رشد و ہدایت کو اور وہ راہ ضلالت و گمراہی کی پیروی کریں، یعنی کفر کو دین بنالیں۔ پھر اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یعنی یہ وہ فعل ہے جو میں نے ان کے ساتھ ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے کیا ہے۔

وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ یعنی وہ حق میں تدبر اور غور و فکر کرنے کے اعتبار سے غافلوں کی مثل ہیں۔ اور معنی میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے غافل ہوں جو اس کے سبب انہیں بدلہ اور سزا دی جائے گی، جیسے کہا جاتا ہے: ما أغفل فلان عما یراد بہ؟ (فلاں اس سے کتنا غافل ہے جس کا اس کے بارے ارادہ کیا جارہا ہے؟) حضرت مالک بن دینار نے دونوں حرفوں میں یا کے ضمہ کے ساتھ وان یُرَوا پڑھا ہے یعنی یہ ان کے ساتھ کیا جائے گا۔ اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے سبیل الرُّشْد راء کو ضمہ اور شین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت عاصم کے سوا اہل کوفہ نے راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ الرشد پڑھا ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو نے رُشْد اور رَشَد کے درمیان فرق کیا ہے۔ فرمایا: رُشْد اصلاح میں ہوتا ہے اور رَشَد دین میں ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: سیبویہ اس طرف گئے ہیں کہ رُشْد اور رَشَد سُخْط اور سَخَط کی مثل ہیں اور اسی طرح کسائی نے بھی کہا ہے۔ اور ابو عمرو سے صحیح اس کے سوا ہے جو ابو عبید نے کہا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: نصر بن علی نے اپنے باپ کے واسطہ سے ابو عمرو بن علاء سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب رشد آیت کے درمیان میں ہو تو اس میں شین ساکن ہوگی اور جب آیت کے سرے پر ہو تو وہ متحرک ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: رأس الآیہ سے مراد یہ ہے جیسے یہ آیت: وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (الکہف) پس آپ کے نزدیک یہ دونوں لغتیں ایک معنی میں ہیں، مگر آپ نے یہ فتحہ اس لیے

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 544

دیا ہے تا کہ آیات متفق ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے: رَشَدَ یَرْشُدُ، رَشُدَ یَرْشُدُ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے رَشِدَ یَرْشَدُ، رُشْد اور رَشَد کا لغت میں حقیقی معنی ہے کہ انسان اس میں کامیاب ہو جس کا وہ ارادہ کرے اور یہ نقصان اور خسارے کی ضد ہے۔ (یعنی رشد کی ضد الخیبة ہے)

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۱۴۸

''اور بنا لیا قوم موسیٰ نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا جو محض ڈھانچہ تھا اس سے گائے کی آواز آتی تھی، کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ وہ نہ بات کر سکتا ہے ان سے اور نہ انہیں ہدایت کی راہ بتا سکتا ہے، انہوں نے (خدا) بنا لیا اسے اور وہ (بڑے) ظالم تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے طور پر جانے کے بعد بنا لیا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ (اپنے زیورات سے)۔ یہ اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی قراءت ہے۔ حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے سوا اہل کوفہ نے اسے مِنْ حِلِيِّهِمْ حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے مِنْ حَلْيِهِمْ حا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ قراءت کی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ حَلْي، حُلِيّ اور حِلِيّ کی جمع ہے، جیسے ثَدْي، ثُدِيّ اور ثِدِيّ ہیں۔

اس کی اصل حلُوي ہے، پھر واؤ کو یا میں مدغم کیا گیا اور لام یا کی مجاورت کے سبب مکسور ہو گئی اور لام کے کسرہ کی وجہ سے حا کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور حا کا ضمہ اصل کی بنا پر ہے۔ عِجْلًا یہ مفعول ہے (بچھڑا) جَسَدًا یہ نعت یا بدل ہے۔ لَّهٗ خُوَارٌ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ کہا جاتا ہے: خار یَخُور خُوارًا جب گائے آواز نکالے (یعنی وہ محض ڈھانچہ تھا اور اس سے گائے کی آواز آتی تھی) اس طرح جأر یَجأر جُؤارًا بھی ہے۔ جب کوئی بزدل اور کمزور ہو جائے تو کہا جاتا ہے خَوِرَ یَخْوَرُ خَوَرًا۔

بچھڑے کے قصص میں مروی ہے کہ سامری جس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا، اس کی نسبت سامرہ نامی گاؤں کی طرف کی جاتی ہے(1)۔ وہ قتل الابناء کے سال پیدا ہوا (یعنی اس سال جس میں فرعون نے بچوں کو قتل کروا دیا تھا)، اس کی ماں نے اسے پہاڑ کی ایک غار میں چھپا دیا۔ تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اسے غذا پہنچائی (اور اس کی پرورش کی) پس اس وجہ سے اس نے آپ کو پہچان لیا۔ اور جب انہوں نے نر کی خواہشمند گھوڑی پر فرعون کو سمندر میں دھکیلنے کے لیے سمندر کو عبور کیا تو اس (سامر) نے گھوڑی کے کھر کے نشان سے ایک مشت مٹی اٹھا لی۔ اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (طٰہٰ: 96) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے تیس دن کا وعدہ کیا تھا اور پھر جب مزید دس دن کی آپ نے تاخیر کر دی اور تیس راتیں گزر گئیں، تو آپ نے بنی اسرائیل کو کہا اور ان میں اس کی اطاعت و پیروی کی جاتی تھی۔ بلاشبہ تمہارے پاس آل فرعون کے زیورات میں سے زیورات ہیں۔ ان کی عید تھی جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور قبطیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 455

سے زیورات عاریۃً لیتے تھے پس آج بھی اسی لیے انہوں نے عاریۃً لیے ہوئے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر سے نکالا اور قبطیوں کو غرق کر دیا تو وہ زیورات انہیں کے قبضے میں رہ گئے، تو سامری نے انہیں کہا: بلاشبہ یہ تم پر حرام ہیں، پس جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ لے آؤ ہم انہیں جلا دیں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زیورات وہ ہیں جو بنی اسرائیل نے قوم فرعون کے غرق ہونے کے بعد لیے تھے۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں کہا: بے شک یہ زیورات مال غنیمت ہے اور یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے، پس آپ نے ایک گڑھا کھدوا کر انہیں اس میں جمع کر دیا تو سامری نے انہیں اٹھا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس رات زیورات ادھار لیے جس رات انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے قبطیوں کو یہ وہم دلایا کہ ان کی شادی یا کوئی اجتماع ہے۔ اور سامری نے ان کا یہ قول سنا ہوا تھا اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:138) اور وہ الٰہ گائے کی شکل پر تھے تو اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا بنایا جو محض ڈھانچہ تھا، مگر وہ اس سے گائے کی آواز سنتے تھے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت اور خون میں بدل دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جب اس نے وہ مٹی کی مشت آگ میں ان زیورات پر ڈالی تو وہ بچھڑا بن گیا جس سے گائے کی آواز آتی تھی۔ پس اس نے ایک بار گائے کی آواز نکالی اور دوسری بار نہیں پھر اس نے قوم کو کہا: هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝ (طٰہٰ:88) (یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے) وہ کہہ رہا ہے: وہ اسے بھول گیا اور اس کی تلاش میں چلے گئے اور اس سے بھٹک گئے، تو تم آؤ ہم اس بچھڑے کی عبادت کریں۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس حال میں بتایا کہ وہ مناجات میں مشغول تھے: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ (طٰہٰ) (کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! اس سامری نے ان کے زیور سے ان کے لیے بچھڑا بنایا ہے، پس اس کا جسم کس نے بنایا ہے؟۔ آپ کی مراد گوشت اور خون ہے۔ اور اس کے لیے گائے کی آواز کس نے بنائی ہے؟ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: میں نے۔ تو آپ نے عرض کی: تیری عزت و جلال کی قسم تیرے سوا انہیں کسی نے گمراہ نہیں کیا۔ رب کریم نے فرمایا: صدقت یاحکیم الحکماء (اے حکیم الحکماء تو نے سچ کہا ہے) اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (الاعراف:155) (نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش) اور قفال نے کہا ہے: سامری نے بچھڑے کا پیٹ خالی رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں ہوا بھر دی تھی، یہاں تک کہ اس سے گائے کی آواز آنے لگی اور اس نے انہیں وہم دلایا کہ بلاشبہ وہ اس طرح ہو گیا ہے جب اس نے اس ڈھانچے میں وہ مٹی ڈالی جو اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑوں کے قدموں سے اٹھائی تھی۔ اس کلام میں بہت کمزوری اور ضعف ہے۔ یہ قشیری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ یہ بیان فرمایا کہ معبود کے لیے واجب اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ کلام کر سکے۔ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اور نہ وہ ان کی دلیل کی طرف کسی راستے کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اِتَّخَذُوْهُ انہوں نے اسے خدا بنا لیا ہے۔ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ یعنی وہ اس بچھڑے کو خدا بنانے میں اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ظلم

کرنے والے ہو گئے یعنی بچھڑے کو خدا بنانے کے سبب مشرک ہو گئے۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ یعنی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقررہ وقت پر واپس آنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے۔ حیرت زدہ شرمندہ آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: قد سُقِطَ فی یَدِہٖ (تحقیق وہ سخت نادم اور پشیمان ہے)۔ اخفش نے کہا ہے: اسے کہا جاتا ہے: سُقِطَ فی یدہ و أسقط اور جنہوں نے علی بناء الفاعل سَقَطَ فی ایدیھم کہا ہے: ان کے نزدیک اس کا معنی ہے: سَقَطَ الندمُ (پشیمانی اور ندامت کا آنا)۔ ازہری اور نحاس وغیر ہما نے یہی کہا ہے: ندامت دل میں ہوتی ہے، لیکن ذکر ید (ہاتھ) کا کیا ہے، کیونکہ جو کسی شے پر قابض ہو جائے اس کے لیے کہا جاتا ہے: قد حصل فی یدہ أمر کذا (تحقیق اس طرح کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ غالب اشیاء کے معاملات ہاتھ کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ (الحج: 10) (اس روز اسے بتایا جائے گا کہ یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا) اور یہ بھی کہ اگرچہ ندامت دل میں ہوتی ہے لیکن اس کا اثر بدن میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ نادم آدمی اپنا ہاتھ کاٹنے لگتا ہے اور اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا (کہف: 42) (پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا) یعنی وہ نادم ہوا۔ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (الفرقان: 27) یعنی ندامت کے سبب اس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور نادم انسان اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل استسار سے ہے اور اس سے مراد ایک آدمی کا دوسرے آدمی کو مارنا ہے یا اسے پچھاڑ دینا ہے پس وہ اسے ہاتھوں کے بل زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ اسے باندھ لے یا اس کی مشکیں کس لے، پس جسے گرایا گیا ہے وہ گرانے والے کے ہاتھ میں مسقوط بہ ہوتا ہے۔

وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف پلٹ گئے ہیں۔

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ یعنی وہ عبودیت کا اقرار اور استغفار کرنے لگے۔ حمزہ اور کسائی نے تاخطاب کے ساتھ ولئن لم ترحمنا ربنا و تغفر لنا پڑھا ہے۔ اس میں استغاثہ، تضرع، عجز و انکساری اور سوال ودعا میں خوب اصرار کرنے کا معنی ہے۔ ربنا حرف ندا کے حذف کے سبب منصوب ہے۔

اور دعا اور خشوع وخضوع میں یہی زیادہ بلیغ ہے۔ پس ان دونوں کی قراءت میں عجز و انکساری اور تضرع زیادہ ہے، لہٰذا یہی اولیٰ ہے۔

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ وَ اَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖؗ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

''اور جب واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف خشمناک (اور) غمگین ہو کر (تو) بولے (اے قوم!) بہت بری جانشینی کی ہے تم نے میری میرے بعد، کیا تم نے جلد بازی کی اپنے رب کے فرمان سے اور (غصہ سے) پھینک دیں تختیاں اور پکڑ لیا سر اپنے بھائی کا (اور) کھینچا اسے اپنی طرف، ہارون نے کہا: اے میری ماں جائے! اس قوم نے کمزور و بے بس بنا دیا مجھے اور قریب تھا کہ قتل کر دیں مجھے، سو نہ ہنساؤ مجھ پر دشمنوں کو اور نہ شمار کرو مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ۔ موسیٰ نے التجاء کی اے میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو زیادہ رحم کرنے والا ہے تمام رحم کرنے والوں سے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا اس میں غَضْبَانَ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کی مونث غضبی ہے اور اس لیے کہ اس میں الف نون اس الف تانیث کی مثل ہے جو تیرے قول حمراء میں ہے اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اَسِفًا سے مراد شدید الغضب (سخت غصہ) ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ (1) نے فرمایا: اسف کا درجہ غضب کے بعد ہے یعنی جب غصہ غضب سے زیادہ شدید ہو تو اسف کہلاتا ہے (اور وہ آدمی) أسِف و أسِيف و أسْفان اور أسُوف کہلاتا ہے۔ اور الأسيف کا معنی حزین (غمگین) بھی ہے۔

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے عمل کی وجہ سے غمگین و پشیمان واپس لوٹے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ عزوجل نے آپ کو واپسی سے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ انہیں بچھڑے کے سبب فتنہ و آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے، پس اسی لیے آپ غصے کی حالت میں واپس لوٹے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (3) نے بیان کیا: حضرت موسیٰ علیہ السلام میں غصہ لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا، لیکن وہ بہت جلد اتر جاتا تھا، پس وہ جتنا زیادہ تھا اتنا جلدی اترتا تھا۔

ابن القاسم نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب غصے میں ہوتے تو آپ کی ٹوپی سے دھواں ظاہر ہوتا تھا اور آپ کے بدن کے بال آپ کے جبے کو اٹھا دیتے تھے اور یہ اس لیے ہے کہ غصہ ایک انگارہ ہے جو دل میں جلنے لگتا ہے۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جسے غصہ آئے وہ چت لیٹ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 77 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 78 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

جائے اور اگر اس کا غصہ ختم نہ ہو تو پھر وہ غسل کرے، پس اس کا لیٹنا اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دے گا اور اس کا غسل کرنا اسے زائل کر دے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تیز غصہ ہی اس کا سبب بنا تھا کہ آپ نے حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ دے مارا اور ان کی آنکھ پھوڑ دی۔ اس بارے علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا ذکر سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس لیے اجازت طلب کی کیونکہ وہ کلیم اللہ تھے۔ گویا کہ انہوں نے یہ جانا کہ جس کسی نے آپ پر جرأت کی یا آپ کی طرف اذیت کا ہاتھ بڑھایا تو یہ انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جب انہوں نے آپ پر رجعت پیش کی تو آپ نے فرمایا: تو میری روح کہاں سے نکالے گا؟ کیا میرے منہ سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب سے کلام کی ہے یا میرے کان سے، حالانکہ میں نے اس سے اپنے رب کا کلام سنا ہے یا میرے ہاتھ سے، حالانکہ میں نے ان کے ساتھ تختیوں کو پکڑا ہے یا میرے پاؤں سے، حالانکہ میں طور پر رب کریم سے ہم کلام ہونے کے لیے ان پر کھڑا ہوا یا میری آنکھوں سے، حالانکہ اس کے نور سے میرا چہرہ چمک اٹھا، پس وہ لاجواب ہو کر اپنے رب کی طرف واپس لوٹ گیا۔

مصنف ابی داؤد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے تو اگر اس سے غصہ زائل ہو جائے (تو بہتر) ورنہ اسے چاہیے کہ وہ لیٹ جائے'' (1)۔

ابووائل القاص سے بھی مروی ہے انہوں نے بیان کیا: ہم عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے تو ایک آدمی نے ان سے گفتگو کی اور انہیں غصہ دلا دیا، تو آپ (مجلس سے) اٹھ گئے، پھر آپ اس حال میں واپس آئے کہ آپ نے وضو کیا ہوا تھا، انہوں نے فرمایا: میرے باپ نے میرے جد امجد عطیہ سے مجھے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور بلاشبہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور بلاشبہ آگ پانی کے ساتھ بجھائی جاتی ہے پس جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے وضو کرنا چاہیے'' (2)۔

قولہ تعالیٰ: بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قوم کی مذمت ہے، یعنی بہت برا عمل ہے جو تم نے میرے بعد کیا ہے۔ جو عمل مکروہ اور ناپسندیدہ ہو اس کے لیے خلفہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ خیر اور بھلائی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے: خلفہ بخیر او بشر فی أھلہ وقومہ بعد شخوصہ (یعنی اس نے اپنے گھر والوں اور اپنی قوم میں اپنی بلندی کے بعد خیر یا شر کو اپنا خلیفہ بنایا)

اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ یعنی کیا تم اپنے رب کے فرمان سے سبقت لے گئے؟ اور العجلۃ سے مراد کسی شے کے ساتھ اس کے وقت سے پہلے آگے بڑھنا ہے اور یہ مذموم ہے۔ اور السرعۃ کا معنی ہے: عمل الشی فی أول أوقاتہ (کسی شی پر اس کے اول وقت میں عمل کرنا) اور یہ قابل تعریف ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 303　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 304

ایضاً، حدیث نمبر 4151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعقوب نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: عجلتُ الشئ (یعنی) میں اس شے کی طرف سبقت لے گیا۔ اور أعجلتُ الرجلَ میں نے آدمی کو جلدی میں ڈالا، یعنی میں نے اسے عجلت پر ابھارا۔ اور اَمْرَ رَبِّكُمْ کا معنی ہے معیاد ربکم، یعنی تمہارے رب نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی تم نے اپنے رب کی ناراضگی لینے میں جلدی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم نے بچھڑے کی عبادت کرنے میں جلدی کی ہے اس سے پہلے کہ تمہارے رب کی طرف سے کوئی حکم تمہارے پاس آتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ اور آپ نے تختیاں پھینک دیں شدید غصے کی وجہ سے جو آپ پر اس وقت طاری ہوا جب آپ اپنی قوم کے پاس آئے اور وہ بچھڑے کی عبادت میں لگے ہوئے تھے، تو آپ ان کے معاملہ کو مہمل چھوڑنے اور اس پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اپنے بھائی پر غصے ہوئے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر (1) نے کہا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے: لیس الخبرُ کالمعاینۃ (سنی ہوئی خبر دیکھی ہوئی شے کی مثل نہیں ہوتی)۔ اور وہ قابل التفات نہیں جو حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اگر وہ آپ سے صحیح ہے اور وہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے تختیوں کو اس وقت پھینکا جب آپ نے ان میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت دیکھی اور آپ کی امت کے لیے نہیں تھی۔ یہ ردی قول ہے اور قطعاً مناسب نہیں کہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ تختیاں ٹوٹ گئیں اور ان سے تفصیل اٹھالی گئی اور ہدایت اور رحمت ان میں باقی رہی۔

مسئلہ نمبر 2۔ تحقیق بعض جاہل متصوفہ نے اس سے کپڑے پھینکنے کے جواز پر استدلال کیا ہے جب غنا پر ان کی خوشی انتہائی بڑھ جائے (اور وہ جھومنے لگیں) پھر ان میں سے بعض صحیح کپڑے پھینکتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو پہلے انہیں پھاڑ ڈالتے ہیں اور پھر پھینکتے ہیں۔ فرمایا: یہ لوگ ایک غیبی اور مخفی حالت میں ہوتے ہیں پس انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی قوم کے بچھڑے کی عبادت کرنے کے سبب جب غم غالب آگیا، تو آپ نے تختیاں پھینک دیں اور انہیں توڑ دیا اور آپ کو اس کا ادراک نہ ہوا جو آپ نے کیا۔

علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: کون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے صحیح قرار دے سکتا ہے کہ آپ نے تختیاں توڑنے کے لیے انہیں پھینک دیا؟ جو قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ہے کہ آپ نے انہیں پھینکا، تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹ گئیں؟ پھر اگر کہا جائے کہ وہ ٹوٹ گئیں تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آپ نے انہیں توڑنے کا قصد اور ارادہ کیا؟ پھر اگر ہم اسے آپ سے صحیح قرار دیں تو ہم کہیں گے: آپ حالت غضب میں تھے، یہاں تک کہ اگر آپ کے سامنے آگ کا سمندر ہوتا تو آپ اس میں کود جاتے۔ اور کون ہے جو ان (متصوفہ) کی حالت غیبیہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے حالانکہ وہ دوسرے سے غنا کو سمجھ رہے ہوتے ہیں اور اگر ان کے پاس کنواں ہو تو اس سے بچتے اور ڈرتے بھی ہیں۔

پھر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے احوال کو ان سفہاء کے احوال پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ابن عقیل سے ان کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 457

وجد کرنے اور اپنے کپڑے پھاڑنے کے بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ خطا ہے اور حرام ہے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ایک کہنے والے نے آپ سے کہا: بلاشبہ وہ اسے نہیں جانتے ہوتے جو وہ کر رہے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اگر وہ یہ جانتے ہوئے ایسی جگہوں پر حاضر ہوئے کہ ان پر خوشی غالب آجائے گی اور وہ ان کی عقلوں کو زائل کر دے گی تو وہ اس وجہ سے گنہگار ہوئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایسی جگہ داخل کیا جہاں انہوں نے کپڑے پھاڑنے وغیرہ جیسے فاسد کام کیے اور ان سے شریعت کا خطاب ساقط نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں حاضر ہونے سے پہلے انہیں یہ خطاب کیا جا چکا ہے کہ وہ ایسی جگہ سے اجتناب کریں جو انہیں اس حال تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ انہیں کوئی نشہ آور مشروب پینے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح یہ وہ شدید خوشی ہے جسے اہل تصوف وجد کا نام دیتے ہیں اگر وہ سچے ہیں کہ اس میں طبعی نشہ ہے اور اگر وہ جھوٹے ہیں تو انہوں نے صحو کے باوجود فاسد کام کیا، پس اس میں دونوں حالتوں (صحو اور سکر) میں سلامتی نہیں ہے۔ اور شک کے مقامات سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ یعنی آپ نے اپنے بھائی کی ریش اور زلفیں کھینچیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے اور آپ بنی اسرائیل کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ محبوب تھے، کیونکہ آپ میں غصہ بہت کم (اور مزاج نرم) تھا۔

علماء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے بھائی کا سر پکڑنے کی چار تاویلیں کی ہیں:

(۱) یہ انداز ان کے عرف اور عادت میں عام تھا، جیسا کہ عرب اپنے بھائی اور ساتھی کی تعظیم و تکریم کے لیے اس کی ڈاڑھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں، تو یہ عمل بطریق تذلیل و رسوائی نہ ہوا۔

(۲) آپ پر تختیوں کے نزول نے آپ کو بہت خوش کر رکھا تھا، کیونکہ یہ اسی مناجات میں آپ پر نازل ہوئی تھیں اور آپ نے چاہا کہ آپ انہیں تورات سے پہلے بنی اسرائیل سے مخفی رکھیں۔ تو حضرت ہارون علیہ السلام نے آپ کو کہا: میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑو، تاکہ اس تذلیل کی وجہ سے بنی اسرائیل پر آپ کی خوشی مشتبہ نہ ہو جائے۔

(۳) آپ نے یہ عمل اس لیے کیا کیونکہ آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کے ساتھ بچھڑے کی پرستش کے عمل کی طرف مائل ہیں۔ اور اس طرح کا عمل انبیاء علیہم السلام کے لیے جائز نہیں ہوتا۔

(۴) آپ نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملایا تاکہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ اسے جان لے، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے اسے ناپسند کیا تاکہ بنی اسرائیل یہ گمان نہ کریں کہ آپ نے ان کی اہانت کی ہے۔ پھر آپ کے بھائی نے آپ کو جتایا کہ بنی اسرائیل نے اسے کمزور سمجھا، یعنی بچھڑے کی عبادت کرنے والوں نے اور قریب تھا کہ وہ اسے قتل کر دیتے۔ پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھائی کا عذر سنا تو کہا: اے میرے رب! میری اور میرے بھائی کی مغفرت فرما (رب اغفرلی ولاخی) یعنی میں نے جس غصے کے سبب تختیاں پھینکیں ہیں میرا وہ عمل معاف فرما دے اور میرے بھائی کی مغفرت فرما، کیونکہ میں نے انہیں بنی اسرائیل کو روکنے میں کوتاہی کرنے والا گمان کیا ہے اگرچہ ان سے کوتاہی واقع نہیں ہوئی۔ یعنی تو میرے

بھائی کی مغفرت فرما اگر اس سے کوتاہی ہوئی ہے۔

حسن نے کہا ہے: حضرت ہارون علیہ السلام کے سوا ان تمام نے بچھڑے کی پرستش کی، کیونکہ اگر وہاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے سوا کوئی مومن ہوتا تو آپ اپنے قول میں صرف اس پر اکتفا نہ کرتے: رب اغفرلی ولاخی، آپ یقیناً اس مومن کے لیے بھی دعا کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنے لیے اس فعل سے استغفار کیا جو آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا۔ آپ نے انہیں اس پر پانے کی وجہ سے ایسا کیا۔ جب کہ وہ اس عمل کے ساتھ ملحق نہ تھے تو انہوں نے جو کچھ ہوا اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا تاکہ آپ رجوع کرلیں پھر دونوں نے بنی اسرائیل کے عمل کا تدارک کیا۔ اسی لیے کہا: یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ﴿﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ الآیہ (طٰہٰ) (موسیٰ نے (آکر غصہ سے) کہا: اے ہارون! کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا)۔

تو حضرت ہارون علیہ السلام نے وضاحت کی کہ انہیں تو اپنے قتل کا خوف پیدا ہو گیا تھا پس یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ جسے برائی سے روکتے وقت اپنی جان پر قتل کا خوف ہو اس کے لیے سکوت اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کا بیان پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ غضب احکام کو تبدیل نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ نے آپ کے افعال میں سے کسی شی کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ یہ صرف تختیوں کو پھینکنے، بھائی کو عتاب کرنے اور حضرت ملک الموت علیہ السلام کو تھپڑ مارنے کا سبب بنا۔ مہدوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: چونکہ آپ کا غصہ اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے تھا اور بنی اسرائیل سے آپ کا سکوت ان کے باہم لڑنے اور متفرق ہونے کے خوف سے تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ ابْنَ اُمَّ آپ ان کی ماں اور باپ دونوں کے بیٹے تھے (یعنی سگے بھائی تھے) البتہ یہ کلمہ انتہائی نرمی اور شفقت و مہربانی کا کلمہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے: کہا گیا ہے حضرت ہارون علیہ السلام صرف ماں کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے باپ کی طرف سے نہیں۔ لفظ ام کو میم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس جنہوں نے فتحہ دیا ہے انہوں نے ابن ام کو ایک اسم قرار دیا ہے جیسے خمسۃ عشر۔ پس یہ تیرے اس قول کی طرح ہو گیا: یا خمسۃ عشر اقبلوا اور جنہوں نے کسرہ پڑھا ہے انہوں نے اسے ضمیر متکلم کی طرف مضاف کیا ہے پھر یا اضافت کو حذف کر دیا ہے، کیونکہ نداء کا دارو مدار حذف پر ہے اور انہوں نے میم میں کسرہ کو باقی رکھا ہے تاکہ وہ اضافت پر دلیل ہو جائے، جیسا کہ یہ قول یا عباد؛ اس پر ابن السمیقع کی قراءت یا ابن امی دلالت کرتی ہے کہ اس میں یا اپنے اصل پر ثابت ہے۔

کسائی، فراء اور ابو عبید نے کہا ہے: یہ یا ابن ام فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس کی تقدیر یا ابن اماہ ہے۔ اور بصریوں نے کہا: یہ قول غلط ہے، کیونکہ الف خفیف حرف ہے حذف نہیں ہو سکتا، البتہ اس نے دو اسموں کو ایک اسم بنا دیا ہے۔ اخفش اور ابو حاتم نے کہا ہے: یا ابن ام یعنی کسرہ کے ساتھ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: یا غلام غلام اقبل، یہ لغت شاذ ہے اور اس کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 793

قراءت کرنا بعید ہے۔ بلاشبہ یہ اس میں ہوتا ہے جو تیری طرف مضاف ہو۔ اور رہا وہ مضاف جو اس کی طرف مضاف ہو جو تیری طرف مضاف ہے تو اس میں وجہ یہ ہے کہ تو کہے: یاغلام غلامی، اور یا ابن اخی۔ اور یا ابن ام اور یا ابن عم بھی کلام میں اس کی کثرت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا ہے۔

زجاج اور نحاس نے کہا ہے: لیکن اس کی تحسین اور جید وجہ یہ ہے کہ الابن کو ام اور عم کے ساتھ ملا کر ایک اسم بنا دیا جائے۔ یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہے: یا خمسة عشر أقبلوا پس یا کو حذف کر دیا گیا جیسے یا غلام سے اسے حذف کیا گیا۔ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ یعنی قوم نے مجھے ذلیل ورسوا کیا اور مجھے کمزور وبے بس بنا دیا۔ وَ كَادُوْا یعنی یہ قریب ہو گئے۔ یَقْتُلُوْنَنِیْ یہ لفظ دونوں نونوں کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے۔ اور غیر قرآن میں اس میں ادغام جائز ہوتا ہے۔ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ یعنی آپ دشمنوں کو خوش کیجئے۔ اور الشماتہ کا معنی ہے: السرور بما یصیب أخاك من المصائب فی الدین والدنیا (یعنی تیرے کسی بھائی کو دین ودنیا میں مصائب وآلام میں سے جو پہنچے اس پر اظہار مسرت کرنا، شماتت کہلاتا ہے) اور یہ حرام ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: لا تظهر الشماتة بأخيك فيعافيه الله ويبليك (تو اپنے بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کر (کہیں ایسا نہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ اسے نجات عطا فرما دے اور تجھے اس میں مبتلا کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پناہ مانگتے تھے اور یہ عرض کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إني أعوذ بك من سوء القضاء ودرك الشقاء وشماتة الأعداء (1) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بری تقدیر سے، بدبختی پانے سے اور دشمنوں کی تکلیف پر خوش ہونے سے) اسے بخاری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا ما الدهرُ جر علی أُناسٍ كَلاكِلَه أناخ بآخرينا

فقل للشامتين بِنَا أَفِيقوا سَيَلقَى الشامتون كما لَقِينا

حضرت مجاہد اور مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہما نے تا کے نصب اور میم کے فتحہ کے ساتھ تَشْمَتْ اور الأعداء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے: تو میرے ساتھ وہ سلوک نہ کر جس کے سبب دشمن خوش اور مسرور ہوں (لا تفعل بی ما تشمت من أجله الأعداء) یعنی ان کی طرف سے ایسا کوئی فعل نہیں ہوا جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ علیہ سے بھی تشمت دونوں ہی فتحہ مروی ہے اور الأعداء نصب کے ساتھ ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اے میرے رب! تو مجھ پر خوش نہ ہو۔ اور یہ جائز ہے جیسا کہ یہ قول ہے: اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:15) وغیرہ۔ پھر مقصود اور مراد کی طرف رجوع فرمایا اور وہ فعل مضمر کر دیا جس کے ساتھ الْاَعْدَآءَ کو نصب دی، گویا کہ اس طرح فرمایا: ولا تشمت بی الأعداء۔

ابوعبید نے کہا ہے: میں نے حمید سے بیان کیا ہے کہ یہ فلا تشمت میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں، کیونکہ اگر یہ شمت سے ہو تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور اگر یہ اشمت سے ہے تو پھر تشمت کہنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (ظالمین

1۔ صحیح بخاری، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 979

سے) مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

''بے شک انہوں نے بنالیا بچھڑے کو معبود جلدی ہی پہنچے گا انہیں غضب ان کے رب کی طرف سے اور رسوائی دنیا کی زندگی میں اور اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں بہتان باندھنے والوں کو۔ اور جنہوں نے کیے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے بے شک آپ کا رب اس کے بعد بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب ہونے کا معنی سزا ہے۔ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کیونکہ انہیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذلت سے مراد جزیہ ہے۔ لیکن یہ معنی بعید ہے، کیونکہ جزیہ ان سے نہیں لیا گیا تھا بلکہ ان کی اولاد سے لیا گیا تھا۔ پھر یہ کہا گیا ہے: یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام مکمل ہو رہا ہے، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے دی ہے اور کلام مکمل ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ یہ قول حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے اس سے پہلے کہ آپ کی قوم اپنے آپ کو قتل کرنے کے ساتھ توبہ کرے، کیونکہ جب انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس قتل عظیم کے بعد انہیں معاف فرما دیا، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے کہ ان میں سے جو مقتول ہوا وہ شہید ہے اور جو زندہ باقی رہا تو اس کی بخشش کر دی گئی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وہاں ایک گروہ تھا ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ڈال دی گئی، انہوں نے توبہ نہیں کی، پس ارشاد باری تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سے مراد وہی لوگ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات سے واپس لوٹنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ان کی اولاد ہے۔ اور وہ وہ ہے جو بنی قریظہ اور بنی نضیر پر وقوع پذیر ہوا، یعنی عنقریب ان کی اولاد کو (غضب الٰہی) پہنچے گا۔ واللہ اعلم

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ یعنی جس طرح کا سلوک ہم نے ان کے ساتھ کیا ہے اسی طرح ہم بہتان باندھنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کوئی بدعت کا ارتکاب کرنے والا نہیں ہے مگر وہ اپنے سر پر ذلت ورسوائی کو پاتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ یعنی مبتدعین (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور اس سے خون بہنے لگا اور آپ نے اسے مبرد کے ساتھ ٹھنڈا کیا

اور اسے خون سمیت سمندر میں پھینک دیا اور انہیں اس سے پانی پینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس جس کسی نے اس بچھڑے کی عبادت کی تھی اور اسے وہ پانی پلایا گیا تو وہ اس کے منہ کی اطراف پر ظاہر ہو گیا۔ پس اس سے بچھڑے کی عبادت کرنے والے پہچان لیے گئے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی بے شک اللہ تعالیٰ شرک وغیرہ سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ یہ بھی کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ یعنی جنہوں نے کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا۔ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا ایسا کرنے کے بعد پھر انہوں نے توبہ کر لی۔ وَاٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا یعنی بلاشبہ آپ کا رب توبہ کے بعد لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ مغفرت فرمانے والا رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

”اور جب فرو ہو گیا موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ تو اٹھا لیا ان تختیوں کو اور ان کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اس میں سَكَتَ بمعنی سکن (ساکن ہونا، فرو ہونا) ہے۔ اسی طرح معاویہ ابن قرہ نے سکن نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ سکوت میں اصل سکون اور امساک (رک جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے جری الوادی ثلاثا ثم سکن، یعنی پھر وادی چلنے سے رک گئی۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سکت موسیٰ عن الغضب تو اس میں قلب کیا گیا ہے۔ جیسے تیرا یہ قول ہے: أدخلتُ الأصبع فی الخاتم (میں نے انگلی انگوٹھی میں داخل کی) اور أدخلت الخاتم فی الأصبع (میں نے انگوٹھی انگلی میں داخل کی) أدخلت القلنسوۃ فی رأسی (میں نے ٹوپی اپنے سر میں داخل کی) اور أدخلت رأسی فی القلنسوۃ (میں نے اپنا سر ٹوپی میں داخل کیا)

اَخَذَ الْاَلْوَاحَ یعنی آپ نے ان تختیوں کو اٹھا لیا جنہیں آپ نے پھینکا تھا۔ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ یعنی ان کی تحریر میں ضلالت و گمراہی سے ہدایت اور عذاب سے رحمت تھی۔ اور نسخ کا معنی ہے: نقل ماضی کتاب إلی کتاب آخر (یعنی جو کچھ ایک کتاب میں تحریر ہے اسے دوسری کتاب میں منتقل کرنا) جس اصل سے تو نے لکھا اسے نسخہ اور فرع کو بھی نسخہ کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے: جب تختیاں ٹوٹ گئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن روزے رکھے، پھر وہ آپ پر واپس کر دی گئیں اور آپ کو وہ تختیاں دو تختیوں میں لوٹا دی گئیں (1) اور ان سے کوئی شے مفقود نہ کی تھی۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اس بنا پر وَفِيْ نُسْخَتِهَا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ ٹوٹی ہوئی تختیوں میں تحریر تھا اور وہ نئی تختیوں میں منتقل کیا گیا وہ ہدایت اور رحمت ہے۔ اور حضرت عطا نے بیان کیا ہے: اور اس میں جو ان میں سے باقی بچا اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ اور ان میں سے ساتویں تختی کے سوا کوئی باقی نہ رہی اور ان میں سے چھ ختم ہو گئیں۔ لیکن حدود اور احکام

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 549

میں سے کوئی شے ختم نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَفِیۡ نُسۡخَتِهَا کا معنی ہے: آپ کے لیے ان تختیوں میں جو کچھ لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے اس میں ہدایت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کچھ ان میں لکھا گیا ہے اس میں ہدایت اور رحمت ہے، پس وہ اس اصل کے محتاج نہیں ہیں جس سے یہ منقول ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: النسخ مایقول فلان، یعنی اپنی کتاب میں وہی کچھ لکھ دے جو فلاں کہتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِلَّذِیۡنَ هُمۡ لِرَبِّهِمۡ یَرۡهَبُوۡنَ یہ بمعنی یخافون ہے (یعنی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ لِرَبِّهِمۡ کے لام میں تین اقوال ہیں: کوفیوں نے کہا ہے یہ لام زائدہ ہے۔ کسائی نے کہا ہے: مجھے اس نے بتایا ہے جس نے فرزدق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: نقدت لها مائة درهم بمعنی نقد تھا (میں نے سو درہم گنے) اور بعض نے کہا ہے: یہ لام اجل ہے، معنی یہ ہے: وہ لوگ جو اپنے رب کی وجہ سے ڈرتے ہیں نہ ان میں ریا کاری ہے اور نہ شہرت، یہ اخفش سے منقول ہے۔ اور محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ لام مصدر کے متعلق ہے معنی یہ ہے: للذین هم رهبتهم لربهم (ان لوگوں کے لیے جن کا خوف اور ڈر اپنے رب کے لیے ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب مفعول مقدم ہو تو لام داخل کرنا اچھا اور حسین ہوتا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے: اِنۡ کُنۡتُمۡ لِلرُّءۡیَا تَعۡبُرُوۡنَ﴿۴۳﴾ (یوسف) پس جب معمول مقدم ہو اور وہ مفعول ہو تو فعل کا عمل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے پس یہ اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو متعدی نہیں ہوتا۔

وَاخۡتَارَ مُوۡسٰی قَوۡمَهٗ سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا لِّمِیۡقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الۡغٰفِرِیۡنَ﴿۱۵۵﴾

''اور چن لیے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے وعدۂ ملاقات کے لیے پھر جب پکڑ لیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے تو موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی، کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم سے، نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش۔ تو گمراہ کرتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ہی ہمارا کارفرما ہے بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاخۡتَارَ مُوۡسٰی قَوۡمَهٗ سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا لِّمِیۡقَاتِنَا اس میں قَوۡمَهٗ اور سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا دو مفعول ہیں اور ان میں سے ایک سے من کو حذف کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے یہ شعر بیان کیا ہے:

مِنَّا الذی اُخۡتِیرَ الرجالَ سَماحةً وبِرًّا اِذا هَبَّ الرِّیاحُ الزَّعازِعُ(1)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 155

اور رائی نے ایک آدمی کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے:

اختَرتُكَ النَّاسَ إذْ رَثَّت خلائقُهُم   واختلَّ من كان يُرجَى عنده السُّولُ

اس میں مراد اختَرتُكَ من النَّاس ہے۔ اختار اصل میں اختیر ہے۔ پس جب یا متحرک ماقبل مفتوح ہے تو اسے الف سے بدل دیا گیا، جیسے قال اور باع۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی جب وہ مر گئے۔ لغت میں الرجفة سے مراد شدید زلزلہ ہے۔ روایت ہے کہ ان پر زلزلہ آیا، یہاں تک کہ وہ مر گئے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتا، جیسے اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ (النساء: 176) (اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے) اور وَ اِيَّايَ معطوف ہے۔ معنی یہ ہے: اگر تو چاہتا تو ہمیں موت دے دیتا ہم بنی اسرائیل کی موجودگی میں اس سے پہلے کہ ہم وعدہ . قات کے لیے نکلتے تاکہ وہ مجھے متہم نہ کرتے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے کہا ہے: یحییٰ بن سعید القطان نے سفیان سے، انہوں نے ابواسحاق سے، انہوں نے عمارہ بن عبد سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام چلے اور ان کے ساتھ شبر اور شبیر بھی نکلے۔ یہ دونوں حضرت ہارون علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ پس وہ سب ایک پہاڑ کے پاس رکے اس میں ایک چارپائی تھی، تو حضرت ہارون علیہ السلام اس پر آرام فرما ہوئے تو ان کی روح قبض کر لی گئی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مراجعت فرما ہوئے، تو انہوں نے کہا: تم نے انہیں قتل کر دیا ہے، تم نے ہمارے ساتھ ان کی نرمی اور خوش اخلاقی پر حسد کیا ہے یا انہوں نے اسی طرح کا کلام کیا۔ یہ شک سفیان کو ہے۔

تو آپ نے فرمایا: میں انہیں کیسے قتل کر سکتا تھا حالانکہ ان کے دو بیٹے میرے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا: پس تم چن لو جسے تم چاہو۔ تو انہوں نے ہر قبیلے سے دس افراد چن لیے۔ آپ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: پس اسی کے متعلق یہ ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا وہ تمام آپ (ہارون علیہ السلام) کے پاس جا کر رکے اور کہا: اے ہارون! انہیں کس نے قتل کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: ما قتلني أحد ولكن الله توفاني (مجھے کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے موت دی ہے) وہ کہنے لگے: اے موسیٰ (علیہ السلام) فیصلہ نہیں ہو رہا۔ تو زلزلے نے انہیں پکڑ لیا، پس وہ دائیں بائیں جھولنے لگے اور آپ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کہتے ہیں: لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ فرمایا: پس آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا اور ان تمام کو انبیاء بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اس قول کی وجہ سے انہیں شدید زلزلے نے پکڑ لیا۔ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء: 153) (تم ہمیں اللہ تعالیٰ کا ظاہر دیدار کراؤ) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (البقرہ: 55) (اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم

دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں شدید زلزلے نے اس لیے پکڑلیا، کیونکہ انہوں نے انہیں منع نہیں کیا تھا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی، حالانکہ وہ اس کی عبادت پر راضی نہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ستر افراد ان کے سوا تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی زیارت ظاہراً کراؤ۔ اور وہب نے کہا(1) ہے: وہ مرے نہیں تھے، بلکہ انہیں شدید زلزلے نے پکڑا تو وہ ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس طرح ہوگئے کہ ان کے جوڑ جوڑ جدا جدا ہوجائیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی موت کا خوف لاحق ہوگیا۔ حالانکہ سورۃ البقرہ میں حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت گزر چکی ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات مردہ حالت میں رہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں زلزلہ کے پکڑنے کا سبب ان کے علاوہ ہے۔ صحیح سبب کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قول باری تعالیٰ: اَتُهْلِكُنَا میں مقصود استفہام انکاری ہے یعنی تو اس طرح نہیں کرے گا۔ اور عرب کلام میں اس کا استعمال کثیر ہے۔ اور جب کلام نفی ہو تو وہ بمعنی ایجاب ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ألستم خیرَ مَنْ رکب المطایا وأندَی العالمین بُطونَ راحِ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی دعا اور طلب ہے، یعنی تو ہمیں ہلاک نہ کر اور اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے مراد وہ قوم ہے جو زلزلہ کے سبب مری۔ اور مبرد نے کہا ہے: استفہام سے مراد استفہام برائے استعظام ہے۔ گویا وہ کہہ رہے ہیں: تو ہمیں ہلاک نہ کر، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض ہلاک نہیں کرتا۔ لیکن آپ نے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی طرح کہا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (المائدہ: 118) (اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے) بعض نے کہا: سفہاء سے مراد یہی ستر افراد ہیں۔ اور معنی یہ ہے: کیا تو بنی اسرائیل کو اس عمل کے عوض ہلاک کردے گا جو ان بے وقوفوں نے یہ قول کہہ کر کیا: اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء: 153)

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش اور تیرا امتحان۔ اس میں آپ نے فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف کی ہے اپنی طرف اس کی نسبت نہیں کی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (الشعراء) اس میں انہوں نے مرض (بیماری) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔ اور حضرت یوشع نے کہا ہے تھا: وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (الکہف: 63) (اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے) بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا استفادہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ (طٰہٰ: 85) پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آئے تو دیکھا بچھڑا عبادت کے لیے کھڑا کیا گیا ہے اور اس کی آواز گائے کی طرح ہے۔ تو آپ نے کہا: اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا یعنی یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش تو فتنہ کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (جسے تو چاہتا ہے اور تو ہدایت دیتا

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 550

ہے جسے تو چاہتا ہے) یہ قدریہ کا رد ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں خیر و برکت اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف۔ اللہ نے فرمایا: میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً یعنی تو ہمیں ایسے اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرما جن کے عوض ہمارے لیے نیکیاں لکھی جائیں۔ وَّ فِي الْاٰخِرَةِ یعنی (آخرت میں) ان پر جزا ہو۔

اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ یہ حضرت مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور الھود کا معنی توبہ ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ یعنی جو اس کے مستحق ہیں، یعنی یہ زلزلہ اور صاعقہ میری طرف سے عذاب ہے میں اسے پہنچاتا ہوں جسے چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ مَنْ اَشَآءُ کا معنی ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ میں اسے گمراہ کردوں۔

قولہ: وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ اس میں عموم ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، یعنی جو بھی اس میں داخل ہو یہ اس سے عاجز نہیں (یعنی ہر شے اس عموم میں داخل ہے) اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میری رحمت مخلوق میں سے ہر شے پر کشادہ ہے یہاں تک کہ چوپائے بھی اپنی اولاد پر رحمت کناں اور مہربان ہیں۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے: اس آیت میں ہر شے حتی کہ ابلیس بھی شامل ہے، پس اس نے کہا: میں بھی شے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (سو میں اس کو لکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں) پھر یہود و نصاریٰ نے کہا: نحن متقون (ہم متقی ہیں) تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الآیہ (الاعراف: 157) (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے) پس یہ آیت عموم سے نکل گئی، والحمد للہ۔ حماد بن سلمہ نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر (1) سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت کے لیے لکھا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462

التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾

''(یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔ وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔ پس جو لوگ ایمان لائے اس (نبی امی) پر اور تعظیم کی آپ کی اور امداد کی آپ کی اور پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا آپ کے ساتھ وہی (خوش نصیب) کامیاب وکامران ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے نوف بکالی حمیری (1) سے روایت بیان کی ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے وعدہ ملاقات کے لیے اپنی قوم کے ستر افراد چن لیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں تمہارے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنادوں تم نماز پڑھ سکو گے جہاں تمہیں نماز کا وقت آپہنچے سوائے غسل خانہ یا حمام یا قبرستان کے اور یہ کہ میں تمہارے دلوں میں سکینہ رکھ دوں اور میں تمہیں اس طرح بنادوں کہ تم تورات حفظ اور ازبر پڑھنے لگو، تم میں سے مرد وعورت، آزاد وغلام اور صغیر وکبیر بھی اسے پڑھ سکیں گے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بارے اپنی قوم کو بتایا، تو انہوں نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ہم گرجا گھروں کے بغیر نماز پڑھیں اور نہ ہم اپنے دلوں میں سکینہ اٹھانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ سکینہ اس طرح ہو جیسے پہلے تابوت میں تھی اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم تورات کو دیکھے بغیر پڑھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾ پس اسے اس امت کے لیے بنادیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار، تو مجھے ان کا نبی بنادے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان کا نبی ان میں سے ہوگا۔ پھر عرض کی: اے میرے رب! مجھے ان میں سے بنادے۔ فرمایا: تم انہیں ہرگز نہ پاسکو گے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! میں تیرے پاس بنی اسرائیل کا وفد لے کر آیا ہوں، تو نے ہمارے وفد کا تحفہ ہمارے سوا دوسروں کو عطا فرمادیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 9، صفحہ 101

بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ۝ (اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے)

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر راضی ہو گئے۔ نوف نے کہا(1) ہے: پس تم اس اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرو جس نے بنی اسرائیل کا تحفہ تمہیں عطا فرمایا ہے۔ ابو نعیم نے بھی یہ قصہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ بن ابی عمرو شیبانی نے بتایا ہے انہوں نے کہا مجھے نوف بکالی نے بیان کیا ہے جب انہوں نے وعظ و نصیحت شروع کیا فرمایا: کیا تم اپنے اس رب کی حمد و ثنا بیان نہیں کرو گے جس نے تمہاری حالت غیوبت میں تمہاری حفاظت کی اور اس نے تمہیں تمہارے نصیب کے بعد بھی مزید عطا کیا اور قوم بنی اسرائیل کو دیا جانے والا تحفہ تمہارے لیے رکھ چھوڑا۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا وفد لے کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں نے تمہارے لیے زمین کو مسجد بنا دیا ہے اس طرح کہ اس میں جہاں بھی تم نماز پڑھو گے میں تمہاری نماز قبول کرلوں گا سوائے تین جگہوں کے جس نے ان میں نماز پڑھی میں اس کی نماز قبول نہیں کروں گا اور وہ قبرستان، حمام اور غسلخانہ ہے۔ تو انہوں نے کہا: نہیں، مگر کنیسہ میں۔ رب کریم نے فرمایا: میں نے تمہارے لیے مٹی کو پاکیزہ بنا دیا ہے جب تم پانی نہ پاؤ (تو اس سے طہارت حاصل کرلو) انہوں نے کہا: نہیں مگر پانی کے ساتھ۔ فرمایا: اور میں نے تمہیں اس طرح بنا دیا ہے کہ جس نے اکیلے نماز پڑھی تو میں اس کی نماز قبول کرلوں گا۔ انہوں نے کہا: نہیں، مگر جماعت کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ان الفاظ نے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے(2) یہودی و نصاریٰ کو اس اشتراک سے خارج کر دیا ہے جو اس قول فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ وعدہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے خاص ہو گیا۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم وغیرہما نے کہا ہے۔ اور یَتَّبِعُوْنَ کا مفہوم ہے یعنی وہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، آپ کے دین اور آپ کے لائے ہوئے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔ رسول اور نبی دو اسم ہیں اور دو معنوں کے لیے ہیں، کیونکہ رسول نبی کی نسبت اخص ہوتا ہے اور لفظ رسول کو معنی رسالت کے اہتمام کے لیے مقدم کیا گیا ہے، ورنہ معنوی اعتبار سے نبوت مقدم ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کا رد کیا جب انہوں نے یہ کہا: وبرسولك الذی أرسلت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: قل آمنتُ بنبیك الذی أرسلت یعنی کہو میں تیرے اس نبی کے ساتھ ایمان لایا جسے تو نے مبعوث فرمایا) یہ صحیح میں مذکور ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کے قول: وبرسولك الذی أرسلت میں رسالت کا ذکر مکرر ہے۔ اور اس کا معنی ایک ہے پس یہ ایسی زیادتی کی مثل ہو جائے گا جس میں کوئی فائدہ نہیں، بخلاف اس قول کے وبنبیك الذی أرسلت کیونکہ نبوت و رسالت میں کوئی تکرار نہیں ہے(3)۔ اس بنا پر ہر رسول نبی ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں، کیونکہ رسول اور نبی دونوں امر عام میں مشترک ہیں اور وہ ہے النبأ (خبر دینا مراد نبوت ہے) اور امر خاص میں دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور وہ ہے رسالت۔ پس جب تو نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہیں تو یہ اس معنی کو بھی متضمن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 461
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 462
3۔ ایضاً

اور رسول ہیں۔ اور اسی طرح آپ ﷺ کے سوا دیگر انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے بارے میں بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: الْأُمِّيَّ یہ امۃ امیۃ کی طرف منسوب ہے، وہ جو اپنی ولادت کی اصل حالت پر ہو، نہ وہ لکھنا سیکھے اور نہ ہی پڑھنا۔ یہ ابن عزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تمہارے نبی ﷺ امی تھے نہ وہ لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں اور نہ وہ حساب لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت: 48) (اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے)

اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب الحدیث (1) (بے شک ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ شمار کرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم ﷺ کی مکہ ام القریٰ کی طرف نسبت ہے (اس وجہ سے آپ کو امی کہا گیا ہے) اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بیان کی ہے کہ ہمیں محمد بن سنان نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں فلیح نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں ہلال نے عطا بن یسار سے بیان کیا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما (2) سے ملاقات کی اور میں نے کہا: تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفت کے بارے میں مجھے بتایئے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہاں قسم بخدا! بے شک تورات میں آپ ﷺ کی بعض وہ صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں: يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (الاحزاب) اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا) اور امیوں کے لیے پناہ گاہ بنا کر بھیجا، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ اکھڑ مزاج اور تند خو نہیں ہیں اور نہ آپ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں، آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے ہیں بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کی روح قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ان کے سبب ٹیڑھی ملت کو سیدھا کر دے۔ اس طرح کہ وہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے لگیں اور وہ اس کے ساتھ اندھی آنکھوں کو، بہرے کانوں کو اور بند دلوں کو کھول دے۔

(بخاری کے علاوہ دوسری کتب میں ہے) حضرت عطا نے بیان کیا: پھر میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے ملا اور اسی کے بارے ان سے سوال کیا تو دونوں کے الفاظ میں کوئی اختلاف نہ ہوا (یعنی انہوں نے بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسا جواب دیا) مگر یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان میں فرمایا: قلوبا غلوفیا و اذانا صمومیا و اعینا عمومیا۔ ابن عطیہ (3) نے کہا ہے: میں یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ وہم ہے یا عجمہ ہے۔ تحقیق حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے: قلوبا غلوفا و آذانا صموما و اعینا عمومیا۔ علامہ طبری نے کہا ہے: یہ قبیلہ حمیر کی لغت ہے۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ کی صفات میں مزید یہ بیان کیں: آپ کا مولد شریف مکہ مکرمہ ہے۔ اور آپ کی ہجرت گاہ طابہ ہے اور آپ کا ملک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 347 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 462 3۔ ایضاً

شام ہے۔ آپ کی امت حمد اور تعریف بیان کرنے والی ہے وہ ہر حال اور ہر منزل میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے، وہ اپنے اعضاء کو وضو میں دھوئیں گے اور اپنی پنڈلیوں کے نصف تک چادریں باندھیں گے، دھوپ کو پسند کرنے والے ہوں گے اور وہ وہیں نماز پڑھیں گے جہاں انہیں نماز نے آلیا اگرچہ جھاڑو مارتے ہوئے۔ میدان جہاد میں ان کی صف نماز میں ان کی صف کی مثل ہوگی۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف) (بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ انہیں شرک چھوڑنے، مکارم اخلاق اپنانے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ انہیں منکر یعنی بتوں کی عبادت کرنے اور قطع تعلقی سے منع کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات سے مراد محللات (حلال چیزیں) ہیں۔ تو گویا آپ نے محللات کو طیب کی صفت سے متصف کیا ہے، کیونکہ یہ ایسا لفظ ہے جو مدح وتشریف کو متضمن ہے۔ اور اس اعتبار سے خبائث کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ ان سے مراد محرمات (حرام چیزیں) ہیں اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: خبائث سے مراد خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ہے۔ اور اس بنا پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے متقذرات (ناپسندیدہ چیزیں) مثلاً سانپ، بچھو، گبریلا وغیرہ کو حلال قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات وہ ہیں جو کھانے کے اعتبار سے طیب اور پاکیزہ ہوں مگر ان کے نزدیک یہ لفظ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ کھانے اور ذائقے کے اعتبار سے اس کا عموم شراب اور خنزیر کو حلال کرنے کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ آپ اسے ان چیزوں کے ساتھ مختص قرار دیتے ہیں جنہیں شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ اور آپ لفظ خبائث کو عام قرار دیتے ہیں اور یہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو شرعاً محرمات ہیں یا متقذرات ہیں۔ پس وہ بچھوؤں، گبریلوں اور چھپکلی اور ان جیسی دیگر چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ پس لوگوں کے یہی دونوں نظریے ہیں اور سورۃ البقرہ میں یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ، الاصر کا معنی ثقل اور بوجھ ہے (1)۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن جبیر نے یہی کہا ہے۔ اور اصر سے مراد عہد بھی ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور یہ آیت دونوں معنوں کو جامع ہے، کیونکہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ بوجھل اور بھاری اعمال کے ساتھ قائم رہیں، پس اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ان سے وہ عہد اور ان اعمال کا بوجھ اتار لیا، جیسا کہ پیشاب کو دھونا اور مال غنیمت کو حلال کر دینا، حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، اس کے ساتھ مل کر کھانا اور اس کے ہمراہ لیٹنا وغیرہ، کیونکہ ان میں سے اگر کسی کے کپڑے پر پیشاب لگ جاتا تو وہ اسے کاٹ دیتا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ اگر ان کی جلد پر پیشاب لگ جاتا اور جب وہ مال غنیمت جمع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463

کرتے تو آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی اور وہ اسے کھا جاتی (1) اور جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تو وہ اس کے قریب نہ جاتے۔ علاوہ ازیں بھی اسی طرح احکام تھے جو حدیث صحیح وغیرہ میں ثابت ہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ پس اغلال (زنجیریں) انہیں بوجھوں کے لیے مجازاً ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان بوجھوں میں سے ہفتے کے دن کاروبار چھوڑنا بھی ہے، کیونکہ یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہفتے کے دن ایک آدمی کو گھاس (کانٹے) اٹھائے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن ماردی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے (2)۔ اور ان میں دیت نہ تھی، البتہ قصاص تھا۔ اور ان کی توبہ کی علامت کے طور پر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ آپس میں قتال کریں، علاوہ ازیں بھی احکام تھے۔ پس انہیں بھی اغلال کے ساتھ تشبیہ دی گئی، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فلیس کعھد الدّار یا أم مالك ولکن أحاطت بالرقاب السلاسل (3)

وعاد الفتَی کالکَھل لیس بقائل سوی العدل شیئا فاستراح العواذل

پس حدود اسلام اور ممنوعات کی طرف قدم بڑھانے کے موانع کو ایسی زنجیروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو گردنوں کو گھیرے ہوئے ہوں۔ اور اس معنی میں ابو احمد بن جحش کا ابوسفیان کے لیے قول ہے:

إذهب بها إذهب بها طُوِّقتَها طوقَ الحمامه

یعنی اس کی عار تجھے لازم ہے۔ کہا جاتا ہے: طوق فلان کذا جب وہ اسے لازم پکڑ لے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اگر کہا جائے: أغلال جو کہ جمع ہے اس کا عطف اصر پر کیسے ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ مفرد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصر مصدر ہے اور اس کا اطلاق کثرت پر ہوتا ہے۔ اور ابن عامر نے تو آصارھم جمع کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا أعمالھم ہے۔ اور اس کی جمع گناہوں کی اقسام مختلف ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور باقیوں نے اسے واحد پڑھا ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے اور اس کا اطلاق اپنی جنس کے قلیل وکثیر افراد پر ہوتا ہے اس کے باوجود کہ یہ لفظاً مفرد ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا (البقرہ:286) میں اس کے مفرد ہونے پر اجماع ہے۔ اور اسی طرح کا معنی ہوگا جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ آئیں گے، مثلاً: عَلٰى سَمْعِهِمْ (البقرہ:7) لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ (ابراہیم:43) اور مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (الشوریٰ:45) یہ تمام الفاظ جمع کے معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ یعنی انہوں نے آپ کی عزت وتوقیر کی اور آپ کی مدد کی۔ اخفش نے کہا: جحدری اور عیسیٰ نے تخفیف کے ساتھ و عزروہ پڑھا ہے اور اسی طرح عزرتموھم میں بھی ہے کہا جاتا ہے: عَزَرَہ یَعْزِرُہ ویَعزِرُہ اور النُّوْرَ سے قرآن کریم اور الفلاح سے مراد مطلوب کو پانے میں کامیاب ہونا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

1۔ جامع ترمذی، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 463 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 464

الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''آپ فرمایئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف وہ اللہ جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اس کی تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ''۔

ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے بارے میں یہ کہیں: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (1) (بے شک میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں) اور كَلِمٰتِهٖ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ کلمات ہیں جو اس نے تورات، انجیل اور قرآن کریم میں لکھے ہیں۔

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے''۔

یعنی وہ لوگوں کو ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور یَعْدِلُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ حکم اور فیصلہ میں عدل کرتے ہیں اور تفسیر میں ہے: یہ ایک قوم ہے جو چین سے پرے اور دریائے رمل سے پرے ہے۔ وہ حق اور عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، وہ حضور نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور ہفتہ کو (کاروبار) چھوڑ دیا، وہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہم میں سے کوئی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ پس یہ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اختلاف رونما ہوا تو ان میں سے ایک گروہ تھا جو حق کے ساتھ راہ بتاتے تھے اور وہ اس پر قادر نہ تھے کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی زمین کے ایک کنارہ کی طرف مخلوق سے الگ تھلگ کر کے نکال دیا، پس ان کے لیے زمین میں ایک راستہ بن گیا، وہ اس میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے یہاں تک کہ وہ چین سے پرے نکل گئے اور وہ اب تک حق پر ہیں۔ ان کے درمیان اور لوگوں کے درمیان ایک سمندر ہے جس کی وجہ سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت جبریل امین علیہ السلام شب معراج حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ان کے پاس گئے۔ پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور آپ نے انہیں قرآن کریم کی سورتوں کی تعلیم دی اور پھر انہیں فرمایا: ''کیا تمہارا کیل اور وزن کا کوئی پیمانہ ہے''؟ انہوں نے بتایا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے''؟ انہوں نے بتایا: ہم کھلی زمین کی طرف نکلتے ہیں اور فصل کاشت کرتے ہیں، پھر جب ہم اسے کاٹ لیں تو اسے وہیں رکھ دیتے ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اس کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ قل یایھا الناس، جلد 2، صفحہ 668

حاجت اور ضرورت ہوتو وہ اپنی حاجت کے مطابق اس سے لے لیتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری عورتیں کہاں ہیں''؟ انہوں نے بتایا: وہ ہماری ایک طرف (کنارے) میں ہیں اور جب ہم میں سے کسی کو اپنی بیوی کی حاجت اور ضرورت ہوتو وہ حاجت کے وقت اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی اپنی بات میں جھوٹ بولتا ہے''؟ تو انہوں نے بتایا: اگر ہم میں سے کوئی اس طرح کرے تو بھڑکتی آگ اسے پکڑ لیتی ہے، بے شک آگ اترتی ہے اور اسے جلا دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا وجہ ہے تمہارے گھر ہموار اور برابر ہیں''؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے بعض بعض سے بلند نہ ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وجہ ہے تمہاری قبریں تمہارے دروازوں پر ہیں''؟ تو انہوں نے بتایا: تاکہ ہم موت کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج دنیا کی طرف لوٹ کر آئے تو آپ پر یہ آیت نازل کی گئی: وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ۝ (الاعراف)(1) مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما رہا ہے کہ میں نے جو موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم میں عطا فرمایا میں نے وہ آپ کو آپ کی امت میں عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو منسوخ ہونے سے پہلے مضبوطی سے تھامے رکھا، نہ انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی کی اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ۝ ع

''اور ہم نے بانٹ دیا انہیں بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف جب پانی طلب کیا آپ سے آپ کی قوم نے (ہم نے وحی کی) کہ مارو اپنے عصا سے اس پتھر کو تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے۔ جان لیا ہر ایک گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اور ہم نے سایہ کر دیا ان پر بادل کا اور ہم نے اتارا ان پر من و سلویٰ۔ (اور فرمایا) کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ اور نہیں ظلم کیا انہوں نے ہم پر بلکہ وہ اپنی

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 2، صفحہ 270

جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ اور جب کہا گیا انہیں کہ آباد ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو اور کہو (اے کریم) بخش دے ہمیں اور داخل ہو دروازہ سے جھکتے ہوئے ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں (اور) زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو۔ تو بدل ڈالی جنہوں نے ظلم کیا تھا ان سے بات خلاف اس کے جو کہی گئی تھی انہیں، تب ہم نے بھیج دیا ان پر عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ ظلم کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں شمار کیں۔ اور انہیں قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ہر قبیلے کا معاملہ ان کے اپنے سردار کی طرف سے معروف ہو، تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر معاملہ آسان ہو جائے۔ اور قرآن کریم میں ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (المائدہ:12)(1) (اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: اثْنَتَیْ عَشْرَةَ حالانکہ لفظ السبط مذکر ہے کیونکہ اس کے بعد امما ہے پس تانیث امم کی وجہ سے ہوئی۔ اور اگر السبط کے مذکر ہونے کی وجہ سے اثنی عشر کہا جاتا تو جائز ہوتا، یہ فراء سے منقول ہے۔ بعض نے کہا ہے: اسباط سے مراد قبائل اور فرقے ہیں، اسی لیے عدد مونث لایا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

وان قریشا کلها عشر أبطن وانت بریٔ من قبائلها العشر

پس وہ بطن سے قبیلہ اور فصیلہ کی طرف گیا۔ پس اسی لیے اسے مونث ذکر کیا۔ اور بطن مذکر ہے، جیسا کہ اسباط مذکر کی جمع ہے۔ زجاج نے کہا(2) ہے: اس کا معنی ہے ہم نے ان کو بارہ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ أسباطا یہ اثنتی عشرۃ سے بدل ہے۔ امما یہ اسباط کی صفت ہے۔ مفضل نے عاصم سے وَقَطَعْنٰهُمُ مخفف روایت کیا ہے۔ أسباطا حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں اسباط حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں قبائل کے قائم مقام تھے۔ اسباط، السبط سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی وہ درخت ہے جسے اونٹ چرتے ہیں اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

معمر نے ہمام بن منبہ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ کے بارے میں روایت کیا ہے انہوں نے کہا: دانے ابھی چھلکے میں ہیں۔ (یعنی یہ کام بہت مشکل ہے) اور انہیں کہا گیا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا پس وہ اپنی سرینوں پر سہارا لیتے ہوئے داخل ہوئے۔ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ یہ مرفوع ہے، کیونکہ یہ فعل مضارع ہے اور یہ محل نصب میں ہے۔ اور ما مصدر یہ ہے، یعنی بظلمهم اس آیت میں جو معانی اور احکام ہیں وہ سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں۔ والحمد للہ

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّیَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِیْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 557
2۔ ایضاً

مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۚ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾

''اور پوچھو ان سے حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر جب کہ وہ حد سے بڑھنے لگے ہفتہ (کے حکم کے بارے) میں جب آیا کرتیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتہ کے دن پانی پر تیرتی ہوئیں اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا تو وہ نہ آتیں ان کے پاس (اس طرح بے دھڑک) ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں بہ سبب اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے۔ اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ تم کیوں نصیحت کرتے ہو اس قوم کو، اللہ جنہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے سخت عذاب۔ انہوں نے کہا: تاکہ معذرت پیش کر سکیں تمہارے رب کے دربار میں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور شاید وہ ڈرنے لگیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ یعنی ان سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں (یعنی یہ اصل میں عن اهل القرية ہے) انہیں اس (قریہ) سے تعبیر کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ وہ ان کی جائے استقرار تھی یا اس لیے کہ وہ ان کے اجتماع کا سبب تھی۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا (یوسف: 82) (اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اهتز العرش لموت سعد بن معاذ یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے آنے سے ملائکہ میں سے اہل عرش فرحت و انبساط کے ساتھ جھومنے لگے۔ آیت میں مراد یہ ہے جو یہود آپ کے پڑوس میں ہیں ان سے ان کے اسلاف کے حال کے بارے پوچھو اور اس کے بارے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بندروں اور خنزیروں میں بدل دیا تھا۔ یہ سوال برائے تقریر و توبیخ ہے۔ اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی علامت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر تعلم کے ان امور پر مطلع فرما دیا تھا۔ اور وہ کہتے تھے: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتوں میں سے ہیں اور اسرائیل کے پوتوں میں سے ہیں اور وہ بکر اللہ تھے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کے بیٹے عزیر کے پوتوں میں سے ہیں اور ہم ان کی اولاد میں سے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس بستی والوں کے بارے میں پوچھو، کیا میں نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے عذاب نہیں دیا۔ اور وہ فروع شریعت میں سے ایک فرع کو تبدیل کرنے کے سبب ہوا۔ اور اس بستی کی تعیین کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس حضرت ابن عباس، عکرمہ اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ ایلہ ہے (1)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ایلہ اور طور کے درمیان مدین ہے۔

زہری نے کہا ہے: وہ طبریہ ہے۔ حضرت قتادہ اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ شام کے سواحل میں سے ایک ساحل ہے اور یہ مدین اور عینون کے درمیان ہے، اسے مقناۃ کہا جاتا ہے۔ یہودی اس قصہ کو چھپاتے تھے، کیونکہ اس میں ان کی بہت سبکی اور بے عزتی ہے۔

الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ یعنی وہ سمندر کے قریب آباد تھے۔ تو کہتا ہے: كنتُ بحضرة الدار أي بقربها یعنی میں گھر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 467

کے قریب ہوں۔ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ یعنی وہ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے، حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے: سَبَت الیہودُ انہوں نے اپنے ہفتہ کے بارے حکم پر عمل ترک کردیا۔ اور سُبِت الرجلُ مفعول کو سبات کہا جاتا ہے (یعنی آدمی کو نیند آگئی) اس نے اسے گونگے کی مثل کرچھوڑا۔ اور اسبت وہ ساکن ہوگیا اور اس نے حرکت نہ کی اور اقوم صاروا فی السبت قوم نیند اور آرام میں ہوگئی۔

اور یہودی ہفتہ کے دن میں داخل ہوئے الیہود دخلوا فی السبت اس میں السبت سے مراد معروف دن (یعنی ہفتہ کا دن ہے) اور راحۃ (آرام لینا) اور قطع (کسی شے کو کاٹنا) کے معنی میں بھی ہے۔ اس کی جمع اَسْبُت، سُبُوت اور اَسبات آتی ہے۔ اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، "جس کسی نے ہفتے کے دن پچھنے لگوائے تو اسے برص کی بیماری لگ جائے گی پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے"۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہفتہ کے دن خون جم جاتا ہے، پس جب تو اسے باہر نکالنے کے لیے کھینچے گا تو وہ جاری نہیں ہوگا اور وہ برص کی طرف لوٹ جائے گا۔

جمہور کی قراءت یَعْدُوْنَ ہے اور ابونہیک نے یُعِدُّوْنَ یاء کے ضمہ، عین کے کسرہ اور دال کی شد کے ساتھ قراءت کی ہے۔ پہلا لفظ الاعتداء سے ہے اور دوسرا الاعداد سے ہے، یعنی وہ انہیں پکڑنے کا آلہ تیار کرتے ہیں۔ ابن السمیقع نے فی الأسبات، السبت کی جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ اور اسے أسباتهم بھی پڑھا گیا ہے۔ شُرَّعًا یعنی کثیر تعداد میں پانی پر ظاہرا تیرتے ہوئے۔ حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مچھلیاں اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ سمندر کی مچھلیاں ہفتے کے دن سمندر سے تیرتے ہوئے آتیں اور ایلہ میں جمع ہوجاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کیا کہ انہیں ہفتہ کے دن شکار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کا شکار کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ان کے دروازوں پر اپنے سر اٹھائے ہوئے تیرتی تھیں، جیسا کہ سفید مینڈھے ہوتے ہیں۔ اسے بعض متاخرین نے بیان کیا ہے۔ پس وہ حد سے بڑھنے لگے اور انہوں نے انہیں ہفتے کے دن پکڑنا شروع کردیا۔ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ اتوار کے دن پکڑنے لگے، یہی زیادہ صحیح قول ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

وَّ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ یعنی وہ ہفتہ کے دن (ایسا) نہ کرتے۔ کہا جاتا ہے: سبت یسبِت جب وہ ہفتے کے دن کی تعظیم کرے۔ حسن نے یاء کے ضمہ کے ساتھ یُسْبِتون پڑھا ہے، یعنی وہ ہفتے کے دن میں داخل ہوتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: أجمعنا وأظهرنا وأشهرنا یعنی ہم جمعہ، ظہر اور مہینے میں داخل ہوئے۔ لَا تَاْتِیْهِمْ یعنی ان کی مچھلیاں نہ آتیں۔ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ یعنی ہم عبادت میں ان پر سختی کرتے ہیں اور انہیں آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس میں کاف محل نصب میں ہے۔ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ یعنی ان کے فسق کے سبب (ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا)۔ حسین بن فضل سے پوچھا گیا: کیا تم کتاب اللہ میں کوئی حلال پاتے ہو جو تمہارے پاس سوائے خوراک اور غذا کے نہ آتا ہو اور ایسا حرام جو بغیر ناپ تول کے آتا ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، داؤد اور ایلہ کے قصہ میں ہے: اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ اس

آیت کے قصص میں مروی ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا کہ ابلیس نے ان کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی اور کہا: تمہیں ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا ہے پس تم حوض بنالو، پھر وہ جمعہ کے دن مچھلیاں ان کی طرف ہانکتے تھے اور وہ ان (حوضوں) میں باقی رہتی تھیں اور پھر پانی کم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے وہاں سے نکلنا ممکن نہ ہوتا تھا، چنانچہ اتوار کے دن وہ انہیں پکڑتے تھے۔

اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ابن رومان کا گمان ہے کہ ان میں سے ایک آدمی رسی پکڑتا تھا اور اس میں ایک پندھا سار کھتا اور اسے مچھلی کی دم میں ڈال دیتا اور رسی کی دوسری طرف کیل کے ساتھ بندھی ہوتی، وہ اسے اتوار تک اسی طرح چھوڑے رکھتا، پھر جب لوگوں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کرلیا اسے کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ مچھلی کا شکار بہت زیادہ ہوگیا اور اسے بازاروں میں لایا جانے لگا اور فاسقوں نے اس کے شکار کا اعلان کردیا، پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ اٹھا اور وہ روکنے لگا اور اس نے روکنے کی اعلانیہ خوب کوشش کی اور علیحدگی اختیار کرلی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک روکنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ مل کر نہیں رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے گاؤں کو دیوار کے ساتھ تقسیم کردیا۔ پس ایک دن منع کرنے والے اپنی مجالس میں آئے لیکن ان ظالموں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی بھی نہ نکلا، تو انہوں نے کہا: بے شک ان لوگوں کو کچھ ہوگیا ہے، پھر انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بن چکے تھے۔ پس انہوں نے دروازہ کھولا اور ان پر داخل ہوئے، تو بندروں نے انسانوں سے اپنے انساب کو پہچان لیا، لیکن انسان اپنے نسب بندروں سے نہ پہچانتے تھے، پس بندر انسانوں میں سے اپنے نسب والے کے پاس آتا اور اس کے کپڑے سونگھنے لگتا اور پھر رونے لگتا۔ تو وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا؟ تو وہ اپنا سر ہلا کر کہتا: ہاں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جوان بندر ہوگئے اور بوڑھے خنزیر ہوگئے۔ پس اس سے صرف انہوں نے ہی نجات پائی جو اس سے باز رہے (اور دوسروں کو منع کرتے رہے) اور وہ تمام کے تمام ہلاک ہوگئے۔ پس اس قول کی بنا پر بنی اسرائیل صرف دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا میں معنی ہوگا یعنی شکار کرنے والوں نے نصیحت کرنے والوں کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں نصیحت کی: جب تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاک کرنے والا ہے تو پھر تم ہمیں نصیحت کیوں کرتے ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں میں بدل دیا۔ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یعنی نصیحت کرنے والوں نے کہا: ہمارا تمہیں نصیحت کرنا تمہارے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے، یعنی بلاشبہ تمہیں نصیحت کرنا ہم پر واجب ہے شاید تم ڈرنے لگو۔

علامہ طبری نے یہ قول ابن کلبی سے بیان کیا ہے اور جمہور مفسرین نے کہا ہے: بے شک بنی اسرائیل تین گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اور آیت میں ضمائر سے یہی ظاہر ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے نافرمانی کی اور شکار کیا، وہ ستر ہزار کے قریب لوگ تھے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے منع کیا اور ان سے علیحدہ ہوگیا اور وہ بارہ ہزار تھے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو علیحدہ تو ہوگیا لیکن نہ اس نے انہیں روکا اور نہ خود نافرمانی کی۔ اور اسی گروہ نے منع کرنے والوں کو کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جو

نافرمانی اور حکم عدولی کا ارادہ رکھتی ہے؟ الله تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے۔ انہوں نے یہ قول ظن غالب کی بنا پر کیا اور اس وقت نافرمان امتوں کے ساتھ الله تعالیٰ کا کوئی فعل معہود نہ تھا، تو روکنے والوں نے کہا: ہمارا نصیحت کرنا الله تعالیٰ کی بارگاہ میں معذرت پیش کرنا ہے شاید وہ ڈر جائیں، تقویٰ اختیار کرلیں۔ اور اگر دو گروہ ہوتے تو یقیناً روکنے والے نافرمانوں کو کہتے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، شاید تم ڈرنے لگو۔ پھر اس کے بعد اختلاف ہوا ہے پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ گروہ جس نے نہ منع کیا اور نہ خود نافرمانی کی وہ نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا اسے یہ سزا منع نہ کرنے پر دی گئی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: میں اسے نہیں جانتا جو ان کے ساتھ کیا گیا۔ اور یہی آیت سے ظاہر ہے۔ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس وقت کہا جب انہوں نے یہ کہا میں اسے نہیں جانتا جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا: کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انہوں نے اس عمل کو ناپسند کیا جو وہ کر رہے تھے اور انہوں نے ان کی مخالفت کی تو انہوں نے کہا: تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں الله تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے؟ پس میں اسی نظریہ پر رہا یہاں تک کہ میں نے انہیں پہچان کرادی کہ وہ نجات پا گئے، تو آپ نے مجھے حلہ پہنایا۔ اور یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ صرف حدود سے تجاوز کرنے والا گروہ ہلاک ہوا کوئی اور نہیں وہ الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (اور ہم نے ان کو پکڑ لیا جنہوں نے ظلم کیا) اور یہ ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ الآیہ (البقرہ: 65) (اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی)

عیسیٰ اور طلحہ نے معذرۃً کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسائی کے نزدیک اس کے نصب کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ نصب مصدر ہونے کی بنا پر ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ تقدیر کلام ہے فعلنا ذالك معذرۃ۔ اور یہی حضرت حفص کی حضرت عاصم سے قراءت ہے۔ اور باقیوں نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ پسندیدہ ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی نیا عذر پیش کریں جس پر انہیں ملامت کی گئی ہے، لیکن جب انہیں یہ کہا گیا: تم کیوں نصیحت کرتے ہو تو انہوں نے جواباً کہا: موعظتنا معذرۃ (ہماری نصیحت ایک معذرت ہے) اور اگر کوئی آدمی کسی آدمی کو کہے: معذرۃً إلى الله واليك من كذا (یعنی فلاں عمل سے الله تعالیٰ کی بارگاہ میں اور تیرے پاس معذرت ہے) تو اس سے مراد معذرت پیش کرنا ہوتا ہے، تو یہ یقیناً منصوب ہوگا۔

یہ قول سیبویہ کا ہے۔ یہ آیت سد ذرائع کے قول پر دلیل ہے اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور تفصیلی گفتگو اس باب میں بھی گزر چکی ہے کہ جنہیں مسخ کر دیا گیا کیا ان کی آگے نسل چلی یا نہیں؟ الحمد للہ۔ سورۃ آل عمران اور سورۃ المائدہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام گزر چکا ہے اور سورۃ النساء میں فساد برپا کرنے والوں کے علیحدہ ہونے اور ان سے ایک طرف ہونے کا ذکر گزر چکا ہے اور یہ کہ جو ان کے پاس بیٹھا وہ ان کی مثل ہو گیا، پس دوبارہ ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۵

''پھر جب انہوں نے فراموش کردی جو انہیں نصیحت کی گئی تھی (تو) ہم نے نجات دے دی انہیں جو روکتے تھے برائی سے اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جنہوں نے ظلم کیا برے عذاب سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے''۔

نسیان کا اطلاق بھولنے والے پر ہوتا ہے۔ اور عامد کا اطلاق ترک کرنے والے پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖٓ یعنی انہوں نے اسے بالارادہ ترک کر دیا۔ اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: 67) (انہوں نے بھلا دیا اللہ کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں) اور بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍ کا معنی ہے شدید عذاب۔ اور اس میں گیارہ قرائتیں ہیں: (۱) ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قراءت فعیل کے وزن پر بئیس ہے (1) (۲) اہل مکہ کی قراءت بئیس با کے کسرہ کے ساتھ ہے اور وزن ایک ہی ہے (۳) اہل مدینہ کی قراءت بیس ہے یعنی با مکسور ہے اس کے بعد یا ساکن ہے (2) اور اس کے بعد سین تنوین مکسور کے ساتھ ہے اور اس میں دو قول ہیں: کسائی نے کہا ہے: اس میں اصل بییس ہے ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے دو یا جمع ہوئی ہیں ان میں سے ایک کو حذف کر دیا گیا ہے اور پہلے حرف کو کسرہ دیا گیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: رغیف اور شھید۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد بئس فعل کے وزن پر ہے، پھر پہلے حرف کو کسرہ دے دیا گیا، ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور کسرہ کو حذف کر دیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: رَحِم و رِحْم (۴) حسن کی قراءت میں با مکسور اس کے بعد ہمزہ ساکن اور اس کے بعد سین مفتوح ہے (۵) ابو عبدالرحمن مقریٔ نے بئیس با کو مفتوح، ہمزہ کو مکسور اور سین کو تنوین مکسور کے ساتھ پڑھا ہے (۶) یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بعذاب بئیس بھی مروی ہے یعنی با مفتوح، ہمزہ مکسور اور سین مفتوح ہے (۷) اعمش کی قراءت فیعل کے وزن پر بیئس ہے اور ان سے بیائس، فیعل کے وزن پر بھی مروی ہے۔ اور آپ سے بئیس با مفتوح، ہمزہ مشدد مکسور اور سین تمام میں تنوین مکسور کے ساتھ مروی ہے۔ مراد اعمش کی قراءت ہے۔ (۱۰) نصر بن عاصم کی قراءت بعذاب بیّس ہے یعنی با مفتوح اور یا مشدد بغیر ہمزہ کے ہے۔ یعقوب القاری نے کہا ہے کہ بعض قراء سے بئیس مروی ہے یعنی با مکسور ہے اس کے بعد ہمزہ ساکن ہے اور اس کے بعد یا مفتوح ہے۔ پس یہ گیارہ قرائتیں ہیں جنہیں نحاس نے ذکر کیا ہے۔

علی بن سلیمان نے کہا ہے: عرب کہتے ہیں: جاء ببنات بیس یعنی وہ ردی شے لے کر آیا، پس بعذاب بیس کا معنی ہوا بعذاب ردئی۔

اور رہی حسن کی قراءت تو ابو حاتم کا گمان ہے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں، انہوں نے کہا: کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا مررت برجل بئس، بلکہ کہا جاتا ہے: بئس الرجل یا بئس رجلا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ ابو حاتم کے کلام سے مردود ہے، نحویوں نے بیان کیا ہے: ان فعلت کذا او کذا فبھا و نعمت (اگر تو نے اس اس طرح کیا تو بہتر ہے اور اچھا ہے) وہ مراد یہ لیتے ہیں فبھا و نعمت الخصلۃ (یعنی خصلت اچھی ہے) اور حسن کی قراءت پر تقدیر کلام یہ ہوگی: بعذاب بئس العذاب۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ ۝۱۶۶

''پھر جب انہوں نے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر راندے ہوئے''۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 213
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 469

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ یعنی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں حدود سے تجاوز کیا۔ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ کہا جاتا ہے: خسأته فخسأ یعنی میں نے اسے دور کر دیا اور میں نے اسے بھگا دیا۔ سورۃ البقرہ میں پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معاصی اور گناہ عذاب کا سبب ہیں۔ اور اس میں کوئی خفا اور ابہام نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سنائی دینے والے کلام کے ساتھ فرمایا، تو وہ اس طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے انہیں بندر بنا دیا۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۶۷

"اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب۔ بے شک آپ کا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور رحیم (بھی) ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلاف کو آگاہ کیا کہ وہ اگر تبدیل نہ ہوئے اور وہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسے شخص کو بھیج دے گا جو انہیں عذاب میں ڈال دے گا۔ اور ابو علی نے کہا ہے: آذن مد کے ساتھ ہو تو بمعنی اعلم (بتانا اور آگاہ کرنا) ہے اور أذن تشدید کے ساتھ ہو تو معنی نادی (پکارنا، ندا دینا) ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ آذن اور أذن دونوں بمعنی أعلم ہیں، جیسے أیقن اور تیقن کہا جاتا ہے۔ زہری نے کہا ہے:

فقلتُ تَعلَّمْ إن للصيد غِرّةً فإلّا تُضَيِّعها فإنك قاتِلُه

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

تعلّم إن شر الناس حيّ يُنادَى في شعارهم يَسار

یعنی یہ بمعنی علم ہے اور یَسُوْمُهُمْ کا معنی ہے وہ انہیں چکھائے گا۔ اور یہ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ کہا گیا ہے: اس سے مراد بخت نصر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرب مراد ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مراد ہے۔ اور یہی اظہر ہے، کیونکہ یہ یوم قیامت تک باقی رہنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ یہاں ان سے جزیہ لینا مراد ہے۔ اور اگر کہا جائے: ان کی شکلیں تو مسخ کر دی گئیں، تو پھر ان سے جزیہ کیسے لیا جا سکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ ان کے بیٹوں اور ان کی اولاد سے لیا جائے گا۔ اور وہ ذلیل ترین قوم ہیں اور وہ یہودی ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے (1) کہ انہوں نے کہا: سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد خراج ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی علیہ السلام نے کبھی خراج لازم نہیں کیا، سب سے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 168

پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہی خراج وضع کیا اور اسے تیرہ برس تک لاگو رکھا اور پھر روک دیا۔

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

''اور ہم نے بانٹ دیا انہیں زمین میں کئی گروہوں میں ان میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ اس طرح ہیں اور ہم نے آزمایا انہیں نعمتوں اور تکلیفوں کے ساتھ تا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کریں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا یعنی ہم نے انہیں شہروں میں تقسیم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ان کے معاملہ کو بکھیرنے اور پھیلانے کا ارادہ کیا ہے، پس کوئی کلمہ انہیں جمع نہیں کر سکا۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ یہ مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ مراد وہ لوگ ہیں جو حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور جنہوں نے ان میں سے کوئی تبدیلی نہیں کی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہونے سے پہلے فوت ہو گئے یا وہ لوگ مراد ہیں جو چین سے پرے ہیں، جیسا کہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ یہ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ نحاس نے کہا ہے: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اسے رفع دیا ہو۔ مراد ان میں سے کافر لوگ ہیں۔ وَ بَلَوْنٰهُمْ یعنی ہم نے انہیں آزمایا۔ بِالْحَسَنٰتِ یعنی خوشحالی اور عافیت کے ساتھ۔ وَ السَّیِّاٰتِ یعنی خشک سالی اور سختیوں کے ساتھ۔ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ تا کہ وہ اپنے کفر سے لوٹ آئیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی وَ یَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''پھر جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جو وارث ہوئے کتاب کے وہ لیتے ہیں مال اس دنیا کا اور (بایں ہمہ) کہتے ہیں کہ ضرور بخش دیا جائے گا ہمیں۔ اور اگر آ جائے ان کے پاس اور مال اس جیسا تو لے لیں اس کو بھی کیا نہیں لیا گیا تھا ان سے پختہ وعدہ کتاب میں کہ نہ منسوب کریں اللہ کی طرف کوئی بات سوائے حق کے اور پڑھ لیا انہوں نے جو کتاب میں تھا۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان کے لیے جو متقی ہیں، تو کیا تم (اتنا) بھی نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ یعنی ان کی اولاد جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں تقسیم کر دیا تھا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: الخلف لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ مراد اولاد ہے اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں (یعنی واحد اور جمع کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے) اور الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو وہ بدل ہے چاہے وہ بچہ ہو یا کوئی اجنبی ہو۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: الخلَف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو مراد صالح اور نیک ہے اور اگر لام کے سکون کے ساتھ ہو تو مراد شریر اور بد ہے۔ لبید نے کہا ہے:

ذھبَ الذین یُعاشُ فی أکنافِھم　　وبقیتُ فی خلف کجلد الأجرب(1)

اور اسی سے یہ بھی ہے کہ ردی کلام کو خلف کہا گیا ہے۔ اور اسی سے یہ مشہور مثال بھی ہے سکت ألفا و نطق خلفا ہزار لحظہ خاموش رہا، بولا تو غلط بولا۔

پس لام ساکن کے ساتھ خلْف ذم میں اور لام مفتوح کے ساتھ خلَف مدح میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی اس کا مشہور استعمال ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یَحمِل ھذا العلم من کل خَلَف عدولہٗ (اس علم کو ہر نیک آدمی سے اس کا عادل جانشین روایت کرے گا او کما قال) اور کبھی ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا:

لنا القَدَمُ الأولی إلیك وخَلفُنا　　لِأوّلنا فی طاعة الله تابع (2)

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

إنا وجدنا خَلَفًا بئس الخَلَفْ　　أغلق عنا بابَه ثم حلف

لا یُدخل البوابُ إلا مَنْ عرفْ　　عبدا إذا ما ناء بالحِمل وَقَفْ

شعر میں وقف کی جگہ خضف بھی منقول ہے اور اس کا معنی ہے گوز کرنا۔ آیت سے مقصود مذمت بیان کرنا ہے۔

وَّرِثُوا الْكِتٰبَ مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد یہودی ہیں، وہ کتاب اللہ کے وارث بنے انہوں نے اسے پڑھا اور اسے سمجھا لیکن اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اسے پڑھنے کے باوجود اس کے حرام کردہ امور کا ارتکاب کیا۔ پس یہ ان کے لیے زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى پھر ان کے بارے یہ خبر دی کہ وہ اپنی شدت حرص وطمع کے سبب سامان دنیا میں سے جو بھی انہیں ملے اسے وہ لے لیتے ہیں۔ وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا اور کہتے ہیں: ہم بخش دیئے جائیں گے حالانکہ وہ توبہ نہیں کرتے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ توبہ نہیں کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اس میں عرض بمعنی سامان دنیا ہے، یہ را کے فتحہ کے ساتھ ہے اور جب را کے سکون کے ساتھ ہو تو پھر اس سے مراد دراہم و دنانیر کے سوا ہر قسم کا مال ہوتا ہے۔ اس آیت میں اشارہ رشوت اور خبیث (حرام) کمائی کی طرف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی کہ وہ اپنے اس قول سَيُغْفَرُ لَنَا کے ساتھ دھوکہ کھا رہے ہیں اور یہ کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب دوسری بار ان کے لیے اس کا امکان ہو تو وہ اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ تو ان کا مغفرت کے ساتھ دھوکہ کھانا قطعی ہے، حالانکہ وہ (اپنے اعمال پر) مصر ہیں، بلاشبہ سَيُغْفَرُ لَنَا وہ کہہ سکتا ہے جو (ایسے اعمال کو) چھوڑ دے اور نادم ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وہ وصف ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی ہے اور یہ ہم میں بھی موجود ہے۔ دارمی ابو محمد نے بیان کیا ہے کہ ہمیں محمد بن مبارک نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں صدقہ بن خالد نے ابن جابر سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 472　　2۔ ایضاً

انہوں نے شیخ سے جن کی کنیت ابو عمرو تھی انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: عنقریب قرآن قوموں کے سینوں میں بوسیدہ ہو جائے گا جیسے کپڑا بوسیدہ ہو جاتا ہے اور وہ گر جاتا ہے، وہ اسے پڑھیں گے لیکن اس کا کیف اور لذت نہیں پائیں گے، وہ بھیڑوں کی کھالیں، بھیڑیوں کے دلوں (جسموں) پر پہن لیں گے، ان کے اعمال میں ایسی حرص ہوگی جس میں خوف کی آمیزش نہ ہوگی، اگر وہ کوتاہی کریں گے تو کہیں گے: ہم عنقریب پہنچ جائیں گے، اور اگر گناہ کریں گے تو کہیں گے: ہم بخش دیئے جائیں گے، بے شک ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یَّاْتِهِمْ میں ضمیر مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے لیے ہے، یعنی یثرب کے وہ یہودی جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کیا اگر ان کے پاس بھی اس طرح کا سامان دنیا آجائے تو وہ اسے لے لیں جس طرح ان کے اسلاف نے اسے لیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اس میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ شریعت اور احکام میں قول حق کو لازم پکڑنے میں شدید تاکید کا اظہار ہے اور یہ کہ حکام رشوت کے سبب باطل کی طرف مائل نہ ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ ہے جو ان پر لازم تھا اور اسی کے ساتھ قول حق کے بارے میں ان سے میثاق لیا گیا اور یہ ہمارے لیے لازم ہے اس کا ذکر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی ہوا اور ہمارے رب کی کتاب میں بھی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور تمام شریعتوں میں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ یعنی انہوں نے اسے پڑھا اور وہ ان کے قریب العہد ہیں۔ ابو عبدالرحمن نے وادارسوا ما فیہ پڑھا ہے یعنی انہوں نے تا کو دال میں ادغام کیا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حق جا صلی کرنے والا رشوت لے کر ان کے پاس آتا تھا تو وہ اس کے لیے کتاب اللہ نکال کر لے آتے اور اس کے ساتھ اس کا فیصلہ کرتے۔ اور جب کوئی مبطل (باطل کرنے والا) آتا تو وہ اس سے رشوت لے لیتے اور اس کے لیے اپنی وہ کتاب نکال لاتے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ لکھی ہوتی اور اس کا فیصلہ کرتے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: لَا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ تحقیق انہوں نے اپنے گناہوں کی بخشش کے بارے میں وہ باطل قول کیا جسے وہ ثابت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ یقین رکھتے ہیں۔

ابن زید نے کہا ہے: یعنی ان احکام میں جن کے بارے وہ فیصلہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ کا معنی ہے انہوں نے اس کے مطابق عمل ترک کر کے اور اس کی فہم اور سمجھ کو چھوڑ کر اسے مٹا دیا۔ یہ معنی تیرے اس قول سے ہے: درستِ الریحُ الاٰثار یہ تب کہا جاتا ہے جب ہوا آثار کو مٹا دے۔ خط دارس و ربع دارس، جب وہ اسے مٹا دے اور اس کا نشان ختم ہو جائے۔ اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے موافق ہے: نَبَذَ

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ الآیہ (البقرہ:101) اور اس قول کے: فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (آل عمران:187) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝۱۷۰

''اور جنہوں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کتاب کو اور قائم کیا نماز کو بے شک ہم ضائع نہیں کریں گے اجر اصلاح کرنے والوں کا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ کتاب سے مراد تورات ہے، یعنی وہ جو اس کے ساتھ مضبوطی سے عمل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے: مسك به و تمسك به یعنی وہ اس کے ساتھ چمٹ گیا، اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ ابو العالیہ اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں یمسکون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ أمسك یمسك سے ہے۔ پہلی قراءت اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے لیے تکریر و تکثیر کا معنی موجود ہے اور اسی کے سبب ان کی مدح اور تعریف کی جا رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور دین کے ساتھ تمسک اور عمل ملازمت (لازم پکڑنا) تکریر کا محتاج ہوتا ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

فما تَمَسَّكُ بالعهد الذی زعمتْ　　إلّا كما تُمسك الماءَ الغرابيل(1)

اس نے کثرت کے ساتھ عہد توڑنے کی مذمت کرتے ہوئے طبعاً یہ شعر کہا ہے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۱

''اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ ان کے اوپر اس طرح گویا وہ سائبان ہے اور خیال کرنے لگے کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر (ہم نے کہا) پکڑ لو جو ہم نے دیا ہے تمہیں (پوری) قوت سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ، نَتَقْنَا اس کا معنی ہے ہم نے اٹھایا۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ یعنی گویا کہ وہ اپنے اٹھنے اور بلند ہونے کے سبب ایک بادل ہے جس کا سایہ کیا جا رہا ہے۔ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ یعنی جو ہم نے تمہیں دیا ہے تم اسے انتہائی قوت کے ساتھ پکڑ لو۔ سورۃ البقرہ میں آیت کے آخر تک کا ذکر گزر چکا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝۱۷۲ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 473

اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۷۴﴾

”اور (اے محبوب!) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا: بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی (یہ اس لیے ہوا) کہ کہیں تم یہ نہ کہو روز حشر کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ شرک تو صرف ہمارے باپ دادا نے کیا تھا (ہم سے) پہلے اور ہم تو تھے ان کی اولاد ان کے بعد تو کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس شرک کی وجہ سے جو کیا تھا باطل پرستوں نے۔ اور اسی طرح ہم مفصل بیان کرتے ہیں نشانیاں تا کہ وہ (ان میں غور کریں) اور کفر سے باز آ جائیں“۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ یعنی تم انہیں یاد دلاؤ اس کے باوجود کہ معاہدوں کا ذکر ان کی کتابوں میں پہلے گزر چکا ہے وہ میثاق جو میں نے بندوں سے اس دن لیا جس دن حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اولاد کو نکالا۔ یہ ایک مشکل آیت ہے اور علماء نے اس کی تاویل اور اس کے احکام کے بارے کافی گفتگو کی ہے، جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم حسب توفیق اسے ذکر کریں گے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بنی آدم کی پشتوں سے بعض کو نکالا۔ انہوں نے کہا: اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کے ساتھ انہیں اپنی توحید پر دلیل بنایا، کیونکہ ہر بالغ بالضرور یہ جانتا ہے کہ اس کا رب واحد و یکتا ہے۔ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ یعنی فرمایا: (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں!) پس یہ ان پر گواہ بنانے کے لیے قائم مقام اور ان کی طرف سے اقرار ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے بارے میں فرمایا: قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ ﴿۱۱﴾ (فصلت) (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں) قفال اور اطنب نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جسموں کو پیدا کرنے سے پہلے ارواح کو نکالا۔ اور ان میں معرفت رکھ دی جس کے سبب انہوں نے اس خطاب کو جان لیا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں قولوں کے سوا اور مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے جسموں کو نکالا جن میں روحیں تھیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ۙ﴿۱۷۲﴾ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا (1) پھر اپنے دست قدرت کے ساتھ ان کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے اعمال کریں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ باب فی القدر، حدیث نمبر 4081، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے اولاد نکالی اور فرمایا میں نے انہیں جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل نار کے اعمال کریں گے''۔ تو ایک آدمی نے عرض کی: تو پھر عمل کس لیے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا فرماتا ہے تو وہ اس سے اہل جنت کے اعمال کی طرح عمل کراتا ہے یہاں تک کہ وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتے ہوئے فوت ہو جاتا ہے پس وہ اسے جنت میں داخل فرمادے گا اور جب کسی بندے کو جہنم کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کراتا ہے یہاں تک کہ وہ اہل جہنم کے اعمال میں سے کوئی عمل کرتے ہوئے مر جاتا ہے پس اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل فرمادے گا''۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ حدیث منقطع الاسناد ہے، کیونکہ مسلم بن یسار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ اور اس میں یحییٰ بن معین نے کہا ہے: مسلم بن یسار معروف نہیں، ان کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان نعیم بن ربیعہ ہیں، اسے نسائی نے ذکر کیا ہے، اور نعیم علمی اعتبار سے غیر معروف ہے، لیکن اس حدیث کا معنی کئی وجوہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ہے جو ثابت بھی ہیں اور زیادہ بھی ہیں، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہیں (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کی پشت کو مس کیا تو ان کی پشت سے ہر وہ روح گری جسے قیامت تک ان کی اولاد میں سے پیدا ہونا تھا اور ان میں سے ہر آدمی کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی اور پھر انہیں آدم علیہ السلام پر پیش فرمایا تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہیں؟ رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد ہے، پس آپ نے ان میں سے ایک آدمی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے درمیان پائی جانے والی چمک نے انہیں متعجب کر دیا۔ تو انہوں نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: یہ تمہاری اولاد میں سے آخری امتوں میں سے ایک فرد ہے، اسے داؤد کہا جائے گا، تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! تو نے اس کی عمر کتنی بنائی ہے؟ رب کریم نے فرمایا: ساٹھ برس۔ تو انہوں نے عرض کی اے میرے پروردگار! اس کی عمر میں میری عمر میں سے چالیس سال کا اضافہ کر دے پس جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر گزر چکی تو حضرت ملک الموت علیہ السلام ان کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: کیا ابھی میری عمر میں چالیس برس باقی نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: کیا آپ نے وہ اپنے بیٹے حضرت داؤد علیہ السلام کو نہیں دے دیئے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کر دیا پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولنے لگی'' (2)۔ اور ترمذی کے علاوہ میں ہے، ''پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے کتاب اور گواہوں کو حکم فرمایا''۔ ایک روایت میں ہے، ''پس آپ نے ان میں ضعیف، غنی، فقیر

1۔ جامع ترمذی کتاب القدر عن رسول اللہ، حدیث نمبر 2061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(ذلیل) بیماری اور تکلیف میں مبتلا اور صحت مند کو دیکھا، تو آدم علیہ السلام نے پوچھا: اے میرے پروردگار! یہ کیا ہے؟ تو نے ان کے درمیان مساوات قائم نہیں فرمائی؟ تو رب کریم نے فرمایا: میں نے چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''انہیں آپ کی پشت سے نکالا گیا جیسے کنگھی سر سے نکالی جاتی ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی کی طرح عقل عطا فرما دی اور ان سے وعدہ لیا اس بارے میں کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس انہوں نے اس کا اقرار کیا اور اسے لازم پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ وہ عنقریب ان کی طرف انبیاء و رسل علیہم الصلوات والتسلیم مبعوث فرمائے گا، پس ان میں سے بعض بعض پر گواہ ہو گئے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان پر سات آسمانوں کو شاہد بنایا، پس اب قیامت تک جو بھی پیدا ہو گا اس سے وہ عہد لے لیا گیا ہے۔ اس جگہ اور مقام کے بارے اختلاف ہے جس میں اس وقت یہ میثاق لیا گیا اس بارے میں چار اقوال ہیں:

پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ جگہ بطن نعمان ہے، یہ عرفات کے پہلو میں ایک وادی ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہند میں اتارا، پھر آپ کی پشت کو مس کیا اور اس سے ہر اس روح کو نکالا جسے یوم قیامت تک پیدا کرنا تھا، پھر فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ حضرت حسن نے کہا ہے: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی صلب میں لوٹا دیا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جگہ مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: وہ آسمان دنیا میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت سے اس کی طرف اتارا تو آپ کی پشت کو مس کیا تو آپ کی پشت کی دائیں جانب سے موتیوں کی مثل سفید اولاد کو نکالا اور انہیں فرمایا: تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور آپ کی پشت کی بائیں جانب سے سیاہ رنگ کی اولاد کو نکالا اور ان کے لیے فرمایا: تم جہنم میں داخل ہو جاؤ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: ہر نفس جو جنت کے لیے پیدا کیا گیا وہ سفید رنگ میں نکلا اور ہر نفس جو جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ سیاہ رنگ میں نکلا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اگر یہ کہا جائے اس کا مخلوق کو عذاب دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے(1) حالانکہ انہوں نے گناہ نہیں کیے، یا وہ انہیں اس پر سزا دے جس کا اس نے ان سے ارادہ کیا ہے اور ان پر وہ لکھ دیا اور اس کی طرف انہیں چلایا ہے؟ تو ہم کہیں گے: یہ کہاں سے ممتنع ہے، کیا عقلاً یا شرعاً؟ پس اگر کہا جائے: کیونکہ ہم میں سے رحیم و حکیم کا اس طرح کرنا جائز نہیں ہوتا، تو ہم کہیں گے: اس لیے کہ اس سے اوپر تو ایک امر (حکم دینے والا) ہوتا ہے جو اسے حکم دیتا ہے اور منع کرنے والا ہوتا ہے جو اسے منع کرتا ہے، روکتا ہے۔ اور ہمارا رب تعالیٰ وہ ہے کہ اس سے اس کے بارے نہیں پوچھا جا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 801

سکتا جو وہ کرتا ہے اور ان لوگوں سے پوچھا جا سکتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق پر قیاس کیا جائے اور بندوں کے افعال کو معبود کے افعال پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحقیقت تمام کے تمام افعال اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہیں اور مخلوق ساری کی ساری اسی کی ہے، وہ ان میں تصرف کرتا ہے جیسے چاہے اور ان کے درمیان اسی کے بارے فیصلہ کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔ اور یہی وہ شے ہے جسے آدمی پاتا ہے کہ فطری نرمی، جنسی شفقت اور ثنا و مدح کی محبت اس پر ابھارتی اور برانگیختہ کرتی ہے، ہر اس شے کے لیے جس میں اسے نفع کی توقع ہوتی ہے۔ اور رب کریم کی ذات ان تمام سے پاک ہے، لہٰذا اس میں اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں''۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کے بارے اختلاف ہے، کیا یہ خاص ہے یا عام ہے؟ بعض نے کہا ہے: یہ آیت خاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ پس اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اولاد آدم میں سے جو ہے وہ آپ کی صلب سے نکلا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ پس اس سے یہ نکلا کہ ہر وہ جو آپ کے آباء نہ تھے وہ مشرک تھے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں مخصوص ہے جن سے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں پر عہد لیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے، کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ بچہ تھا پس اسے غذا دی گئی اور اس کی تربیت کی گئی اور بلاشبہ اس کا مدبر (تدبیر کرنے والا) اور خالق ہے۔ اور یہی معنی وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ کا ہے۔ اور قَالُوۡا بَلٰی کا معنی ہے بلاشبہ یہ ان پر واجب ہے۔ پس جب مخلوق نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا اعتراف کر لیا کہ وہ رب ہے پھر وہ اس سے غافل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے سبب انہیں یاد دلایا اور اس تذکیر کو اپنے منتخب اور اصفیاء میں سے افضل ترین کے ساتھ ختم کیا تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حجت اور دلیل قائم ہو جائے پس اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فَذَکِّرۡ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ﴿ؕ۲۱﴾ لَسۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِمُصَۜیۡطِرٍ ﴿ۙ۲۲﴾ (الغاشیہ) پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں، آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو جبر کرنے کی قدرت بھی عطا فرمائی اور آپ کو سلطنت اور قوت عطا فرمائی اور آپ کے لیے آپ کے دین کو زمین میں غالب کر دیا۔ طرطوشی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: بے شک یہ عہد ہر بشر کو لازم ہے اگرچہ وہ اسے اس دنیا میں نہ یاد کرتے ہوں، جیسا کہ اس کی طلاق لازم ہو جاتی ہے جس پر اس کی شہادت دے دی جائے حالانکہ وہ اسے بھول چکا ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے جنہوں نے کہا ہے: بے شک وہ جو صغر سنی میں ہی فوت ہو گیا تو وہ اپنے میثاق اوّل کے اقرار کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گا اور جو سن بلوغت کو پہنچ گیا تو میثاق اوّل اس کے لیے نفع مند نہیں۔ یہ کہنے والا یہ بھی کہتا ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں ہوں گے اور اس بارے میں یہی صحیح ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں آثار مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ اس بارے میں گفتگو سورۃ الروم میں آئے گی ان شاء اللہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 475

ہم نے اس کا ذکر کتاب ''التذکرہ'' میں بھی کیا ہے۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ ظُهُوْرِهِمْ یہ قول باری تعالیٰ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ سے بدل اشتمال ہے۔ اور آیت کے الفاظ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ عہد اولاد آدم سے لیا گیا ہے، لفظ کے اعتبار سے آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے اس پر الفاظ کی توجیہ ہے: وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا) ظہر آدم کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ وہ سب کے سب آپ کی اولاد ہیں اور یہ کہ انہیں میثاق کے دن آپ کی پشت سے نکالا گیا۔ پس وہ اپنے ارشاد مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ کے سبب آپ کے ذکر سے مستغنی ہو گیا۔

ذُرِّیَّتَهُمْ کوفیوں اور ابن کثیر نے اسے واحد اور تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً (آل عمران: 38) یہ واحد کے لیے ہے، کیونکہ انہوں نے بچہ عطا کرنے کی التجا کی تو آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی اور قراء نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ (مریم: 58) میں اس کے واحد ہونے پر اجماع کیا ہے اور ذریت آدم سے زیادہ اور کوئی شے نہیں۔ اور فرمایا: وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یہ جمع کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے ذریاتہم صیغہ جمع کے ساتھ قراءت کی ہے، کیونکہ ذریت کا لفظ جب واحد کے لیے واقع ہوتا ہے تو یہ ایسے لفظ کے ساتھ آتا ہے جو واحد کے لیے واقع نہیں ہوتا تو یہ جمع ہوتا ہے، کیونکہ کلمہ اپنے معنی مقصود کے لیے خالص ہوتا ہے اور اس (معنی) میں کوئی شے شریک نہیں ہوتی اور وہ معنی جمع ہے، کیونکہ بنی آدم کی پشتوں سے کثیر تعداد میں مناسب اولادوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نکالا گیا، ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پس جمع اس معنی کے لیے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: بَلٰی اس کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں ارشاد گرامی: بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً (البقرہ: 81) کے تحت مکمل طور پر گزر چکی ہے، پس وہیں غور کر لو اَوْ تَقُوْلُوْۤا۔

اَوْ تَقُوْلُوْۤا ابو عمرو نے دونوں مقام میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو اس سے قبل غیب منکر کے لفظ پر لوٹایا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اور قول باری تعالیٰ: قَالُوْا بَلٰی بھی لفظ غیب ہے۔

اور اسی طرح وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ بھی ہے وَ لَعَلَّهُمْ پس اسے اپنے ماقبل اور اپنے مابعد پر لفظ غیب کے ساتھ محمول کیا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں میں تا پڑھی ہے۔ انہوں نے اسے سابقہ لفظ خطاب پر راجع کیا ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی اور شَهِدْنَا ملائکہ کے قول میں سے ہوگا۔ (یعنی) جب انہوں نے کہا: بَلٰی (تو) ملائکہ نے کہا: شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا، اَوْ تَقُوْلُوْۤا یعنی تاکہ تم نہ کہو۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب انہوں نے بَلٰی کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا: تم گواہ ہو جاؤ (تو) انہوں نے کہا: ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں تاکہ تم نہ کہو یا کہو۔ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور سدی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدْنَا یہ بنی آدم کے قول میں سے ہے اور

اس کا معنی ہے: ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر گواہ بنایا، پس اس کے مطابق یہ ہوگا ''انہوں نے کہا: ہاں (کیوں نہیں) ہم بعض بعض پر گواہ ہیں''۔

جب یہ ملائکہ کے قول میں سے ہو تو پھر وقف بَلٰی پر کیا جائے گا اور اس پر وقف اچھا نہیں ہوگا جب یہ بنی آدم کے قول میں سے ہو کیونکہ اَن، بلی سے ماقبل کے متعلق ہے۔ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ (اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نفسوں پر گواہ بنا دیا) تا کہ وہ نہ کہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو اس طرح نکالا جیسے سر سے کنگھی نکال لی جاتی ہے (1) اور ان سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: بے شک تو ہی ہمارا رب ہے (تو) ملائکہ نے کہا: ہم تمہارے اس قول پر گواہ ہیں''۔ یعنی ہم تم پر ربوبیت کا اقرار کرنے پر گواہ ہیں تا کہ تم یہ نہ کہو۔ پس یہ (مفہوم) تا پر دلالت کرتا ہے۔ مکی نے کہا ہے: معنی کے صحیح ہونے کی وجہ سے یہی پسندیدہ ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا نظریہ یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ شَهِدْنَا اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے قول میں سے ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں۔ یہ ابو مالک نے کہا ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم نے ان کی اقتدا کی۔ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ یعنی معنی یہ ہے کہ تو یہ نہیں کرے گا (کہ تو ہمیں) شرک کی وجہ سے ہلاک کر دے جو باطل پرستوں نے کیا) اور توحید (کے معاملہ) میں تقلید کرنے والوں کے لیے کوئی عذر نہیں۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝

''اور پڑھ سنائیے انہیں حال اس کا جسے دیا ہم نے (علم) اپنی آیتوں کا تو وہ کترا کر نکل گیا ان سے تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو ہو گیا وہ گمراہوں میں''۔

اہل کتاب نے ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا علم انہیں تورات سے ہوا ہے۔ اور اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے بارے یہ آیات نازل کی گئی ہیں۔

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم (2) نے بیان کیا ہے: وہ بلعام بن باعوراء ہے، اسے ناعم کہا جاتا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ہے، وہ اس حیثیت میں تھا کہ جب دیکھتا تو عرش کو دیکھتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ، اٰيٰتِنَا سے مراد وہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیۃ (ایک آیت) نہیں کہا، اس کی مجلس میں بارہ ہزار پڑھنے والے علماء تھے جو اس سے پڑھتے لکھتے تھے۔ پھر وہ اس طرح ہو گیا کہ سب سے اول اس نے اس بارے میں کتاب لکھی کہ ''عالم کو بنانے والا کوئی نہیں''۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 133　2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 568

حضرت مالک بن دینار نے کہا ہے: بلعام بن باعوراء کو بادشاہ مدین کی طرف بھیجا گیا تا کہ وہ اسے دعوت ایمان دے۔ پس اس نے اسے بہت کچھ عطا کیا اور اسے خاموش کرا دیا نتیجۃً اس نے اس کے دین کی اتباع کر لی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو چھوڑ دیا، چنانچہ اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بلعام کو نبوت عطا کی گئی تھی(۱)، اس کی دعا قبول کی جاتی تھی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آئے آپ جابروں (اور ظالموں) کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، تو ان جابروں نے بلعام بن باعوراء سے درخواست کی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بددعا کرے پس وہ دعا کرنے کے لیے اٹھا تو اس کی زبان اپنے ساتھیوں کی بددعا کی طرف پھر گئی۔ اس بارے میں اسے کہا گیا، تو اس نے کہا: میں اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوں جو تم سن رہے ہو۔ اور اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی، تو اس نے کہا: تحقیق اب مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں چلی گئیں۔ مکر، دھوکہ اور حیلہ کے سوا کچھ باقی نہ رہا، میں عنقریب تمہیں ایک حیلہ اور مکر بتاؤں گا، میری رائے یہ ہے کہ تم اپنی نوجوان لڑکیوں کو ان کی طرف نکالو کیونکہ اللہ تعالیٰ زانیوں کو بہت مبغوض جانتا ہے، پس اگر وہ اس میں واقع ہو گئے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل فعل زنا کرنے لگے، نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون بھیجا تو اس کے سبب ان میں سے ستر ہزار مر گئے۔ یہ خبر مکمل طور پر ثعلبی وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ روایت ہے کہ بلعام بن باعوراء نے دعا(1) کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جبارین کے شہر میں داخل نہ ہوں، تو اس کی دعا قبول ہو گئی اور آپ تیہ میں ہی رہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کون سے گناہ کے سبب ہم تیہ میں ہی باقی رہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلعام کی دعا کے سبب۔ تو آپ نے عرض کی: جس طرح تو نے اس کی دعا میرے خلاف سن لی ہے اسی طرح میری دعا بھی اس کے خلاف قبول فرما لے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اسم اعظم سلب کر لیا اور اسے اس حالت سے بالکل نکال دیا جس پر وہ تھا۔

ابو حامد نے کتاب "منہاج العارفین" کے آخر میں اس کے بارے کہا ہے: میں نے بعض عارفین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بعض انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے بلعام اور اس کے ان آیات وکرامات کے بعد مطرود ہونے کے بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ میں نے اسے عطا کیا تھا اس پر ایک دن بھی اس نے شکر ادا نہ کیا تھا، اگر وہ اس پر ایک بار بھی میرا شکر ادا کرتا تو میں اس سے سلب نہ کرتا۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلعام نبی تھا اور اسے کتاب دی گئی تھی۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ اسے نبوت عطا کی گئی تھی، پس اس کی قوم نے اسے اس پر رشوت دی کہ وہ خاموش رہے چنانچہ اس نے وہی کیا اور قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ ماوردی نے کہا(2) ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی نبوت کے لیے منتخب نہیں فرماتا مگر اسے ہی جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کو چھوڑ کر معصیت و گناہ کی طرف نہیں نکلے گا۔

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 221　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 279

۱۔ یہ قول کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ اس کا رد آگے آ رہا ہے۔ کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے عصمت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: یہ آیت امیہ بن ابی صلت ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تحقیق اس نے کتابیں پڑھی تھیں اور یہ جان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت رسول بھیجنے والا ہے اور اس نے یہ تمنا کی کہ وہی وہ رسول ہے، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا تو اس نے اس پر حسد کیا اور آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا شعور ایمان لے آیا اور اس کے دل نے کفر کیا'' (1)۔

حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے: یہ آیت ابو عامر بن صیفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دور جاہلیت میں ٹاٹ پہنتا تھا، پس اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا، اس لیے کہ وہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا ہے جو تم لے کر آئے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں حنیفیہ دین ابراہیم لے کر آیا ہوں''۔ اس نے کہا: بلاشبہ میں اسی پر ہوں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس پر نہیں ہے کیونکہ تو نے اس میں وہ کچھ داخل کر دیا ہے جو اس میں سے نہیں ہے''۔ تو ابو عامر نے کہا: اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو مار دے اس حال میں کہ وہ مطرود اور اکیلا ہو۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اللہ تعالیٰ ہم میں سے جھوٹے کو اسی طرح مار دے''۔ بے شک اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعریض کرتے ہوئے کہا جب آپ مکہ مکرمہ سے نکلے۔ پھر ابو عامر شام کی طرف نکلا اور قیصر کے پاس رہنے لگا اس نے منافقین کی طرف لکھا: تم تیار رہو کیونکہ میں قیصر کے پاس سے ایک لشکر لے کر تمہارے پاس آ رہا ہوں تا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال سکیں، پھر وہ شام میں ہی تنہا مر گیا۔ اور اس کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا: وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ (التوبہ: 107) (اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے اب تک) اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں کہا ہے کہ یہ آیت ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی اس کے لیے تین دعائیں تھیں جو اس کے لیے قبول کی جاتی تھیں، اس کی ایک بیوی تھی اسے بسوس کہا جاتا اور اس سے اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ تو اس نے کہا: تو ان میں سے ایک دعا میرے لیے کر دے۔ تو اس نے کہا: ایک تیرے لیے ہے، بتا تو کیا حکم دیتی ہے؟ اس نے کہا: تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر کہ وہ مجھے بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین عورت بنا دے۔ پس جب اس (عورت) نے یہ جان لیا کہ ان میں اس کی مثل کوئی نہیں ہے تو اس نے اس (خاوند) سے اعراض کر لیا، منہ پھیر لیا۔ تب اس نے اللہ تعالیٰ سے اس کے خلاف یہ دعا کی کہ وہ اسے بھونکنے والی کتیا بنا دے۔ تو اس میں دو دعائیں ختم ہو گئیں، پھر اس کے بیٹے آئے اور کہنے لگے: ہم اس پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہماری ماں کتیا رہے لوگ ہمیں اس پر عار دلاتے ہیں، پس تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ اسے اس حالت پر لوٹا دے جس پر وہ پہلے تھی۔ چنانچہ اس نے دعا کی اور وہ اپنی پہلی والی حالت پر لوٹ آئی اور اس میں اس کی دعائیں ختم ہو گئیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر اسی پر ہیں۔

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 171، حدیث نمبر 15241

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت قریش کے بارے نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی وہ نشانیاں اور آیات عطا کیں جو اس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائیں پس وہ ان سے کترا کر نکل گئے اور انہیں قبول نہ کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلعام جبارین کے شہر میں سے تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ یمن کا تھا۔ **فَانْسَلَخَ مِنْهَا** یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے نکل گیا، یعنی اس سے وہ علم چھین لیا گیا جو وہ جانتا تھا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: العلم علمان علم فی القلب فذالك العلم النافع و علم علی اللسان فذالك حجة الله تعالیٰ علی ابن آدم (علم دو قسم کے ہیں ایک علم دل میں ہے وہی نفع بخش علم ہے اور ایک علم زبان کا ہے اور وہی ابن آدم پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے) پس یہ بلعام اور اس جیسے لوگوں کے علم کی مثال ہے، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم اس سے توفیق اور حق پر موت کی التجا کرتے ہیں۔

اور الانسلاخ کا معنی نکلنا ہے، کہا جاتا ہے: انسلخت الحية من جلدها یعنی سانپ اپنی جلد سے نکل گیا (یعنی اس کی کھال اتر گئی) **فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ** یعنی شیطان کے ساتھ مل گیا۔ کہا جاتا ہے: أتبعتُ القوم یعنی میں قوم سے مل گیا۔ بعض نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا انتظار کرتے رہے پھر انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو۔ آپ سنائیں (انہیں) یہ قصے شاید وہ غور و فکر کرنے لگیں۔ بہت بری کہاوت ہے اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور (وہ) اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: **وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ** اس سے مراد بلعام ہے۔ یعنی اگر ہم چاہتے تو اسے اس کے نافرمان اور گنہگار ہونے سے پہلے موت دے دیتے پھر اسے جنت کی طرف بلند کر دیتے۔ **بِهَا** یعنی ان آیتوں کے ساتھ عمل کرنے کے سبب۔ **وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ** یعنی لیکن وہ تو پستی کی طرف جھک گیا۔ یہ معنی حضرت ابن جبیر اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سکن الیها یعنی وہ تو پستی کی لذتوں میں کھو گیا۔ الاخلاد کا اصل معنی لزوم ہے۔ کہا جاتا ہے: أخلد فلان بالمكان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو اور اسے لازم پکڑے ہوئے ہو۔ زہیر نے کہا ہے:

لمن الدیار غشیتها بالفاقد　　کالوحی فی حجر المسیل المخلد(1)

اس میں مخلد بمعنی مقیم ہے، تو گویا معنی یہ ہوا اس نے زمین کی لذتوں کو لازم پکڑ لیا۔ اور انہیں الارض سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سامان دنیا (اور اس کی لذات) زمین پر ہی ہیں۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی اس نے اس کی پیروی کی جو کچھ شیطان نے اس کے لیے آراستہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی خواہشات کفار کے ساتھ تھیں۔ بعض نے کہا ہے: وہ اپنی بیوی کی رضا اور خوشنودی کی پیروی کرنے لگا، وہ اموال میں رغبت رکھتی تھی یہاں تک کہ اس نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف دعا پر ابھارا۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ اور یہ حال کے محل میں ہے، یعنی اس کی مثال ہانپنے والے کتے کی مثال کی طرح ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی تے اور حالت پر ہے جس میں وہ معصیت اور گناہ سے نہیں ڈرتا۔ تو وہ اس کتے کی مثل ہے جس کی یہ حالت ہو پس معنی یہ ہوا کہ وہ ہر حال میں ہانپنے والا ہے، تو اسے بھگائے یا اسے نہ بھگائے۔

ابن جریج نے کہا ہے: کتا منقطع الفوائد ہے اس کا دل نہیں ہوتا، اگر تو اس پر حملہ کرے تو وہ ہانپتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپتا ہے۔ اسی طرح وہ ہے جو ہدایت کو ترک کر دیتا ہے اس کا دل نہیں ہوتا، بلاشبہ اس کا دل کٹ جاتا ہے۔ قتیبی نے کہا ہے: ہر شے ہانپتی ہے چاہے تھکاوٹ کی حالت ہو یا آرام و راحت کی حالت، بیماری کی حالت ہو یا صحت کی حالت، سیرابی کی حالت ہو یا پیاس کی حالت۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی مثل قرار دیا ہے جس نے اس کی آیات کو جھٹلایا اور فرمایا: اگر تو اسے وعظ و نصیحت کرے تب بھی وہ گمراہ ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ گمراہ ہے تو پس وہ اس کتے کی مثل ہے کہ اگر تو اسے چھوڑے تب بھی وہ ہانپے اور اگر تو اسے دھتکارے اور بھگائے تب بھی وہ ہانپے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ (الاعراف) (اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو)

جوہری نے کہا ہے: لهث الكلب يلهث لهثا ولهاثا تب کہا جاتا ہے جب کتا تھکاوٹ یا پیاس کے سبب اپنی زبان باہر نکالے اور اسی طرح وہ آدمی ہوتا ہے جب وہ خوب تھک جائے۔ اور ارشاد گرامی: اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ کا مفہوم ہے کہ جب تو کتے پر حملہ کرے تو وہ بھونکتا ہے اور بھاگتے ہوئے واپس مڑ جاتا ہے اور جب تو اسے چھوڑ دے تو وہ تجھ پر زور دیتا ہے اور بھونکتا ہے، پس وہ تیری طرف بڑھنے اور تجھ سے پیچھے ہٹنے میں اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے تو اس وقت اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو شدت پیاس کے وقت طاری ہوتی ہے یعنی وہ زبان نکال لیتا ہے۔ ترمذی حکیم نے "نوادر الاصول" میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے درندوں میں سے کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس لیے کہ کتے کا دل مردہ ہے اور بلاشبہ اس کا ہانپنا اس کے دل کی موت کی وجہ سے ہی ہے، چونکہ بقیہ تمام درندے اس طرح نہیں ہیں اس لیے وہ ہانپتے نہیں۔ اور کتا اس لیے اس طرح ہو گیا، کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو آپ کا دشمن بہت خوش ہوا اور وہ درندوں کی طرف گیا اور انہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 478

حضرت آدم کے خلاف انگیخت دلائی۔ پس کتے میں ان تمام سے زیادہ اس کی طلب ہوئی۔ تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام وہ عصا لے کر نازل ہوئے جو مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں آپ کے لیے اسے ایک نشانی اور معجزہ بنا دیا اور اس میں بہت بڑی طاقت رکھ دی اور وہ آس الجنۃ میں سے تھا، پس آپ (جبرئیل امین علیہ السلام) نے وہ اس دن حضرت آدم علیہ السلام کو دیا تاکہ آپ ان کے ساتھ درندوں کو اپنے آپ سے دور بھگائیں۔ اور ایک روایت کے مطابق آپ کو اس بارے حکم دیا کہ آپ کتے کے قریب ہوں اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھیں۔ پس اس وجہ سے کتا آپ کے ساتھ مانوس ہوگیا۔ اور اس کا دل ڈنڈے کی طاقت سے مرگیا اور وہ ہمارے آج دن تک آپ سے اور آپ کی اولاد سے محبت کرتا ہے، جب بھی کوئی اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دے اور وہ اولاد آدم کے پہرے داروں میں سے ایک پہرے دار (محافظ) بن گیا۔ اور جب اسے ادب سکھایا جائے اور شکار کی تعلیم دی جائے تو وہ ادب سیکھ جاتا ہے اور تعلیم کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اسی کے بارے یہ ارشاد ہے: تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (المائدہ: 4) (تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا ہے تمہیں اللہ نے)۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے بعد بلعام اسی طرح ہانپتا رہا جیسے کتا ہانپتا ہے۔ کثیر اہل علم کے قول کے مطابق یہ مثال تاویل کے ساتھ ہر اس کے لیے عام ہے جسے قرآن (کا علم) عطا کیا گیا اور اس نے اس کے مطابق عمل نہ کیا، بعض نے کہا ہے: یہ ہر منافق کے بارے میں ہے، پہلا قول اصح ہے۔

قول باری تعالیٰ: فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ کے بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی اگر تو اس پر اپنے جانور (سواری) یا اپنے پاؤں کے ساتھ حملہ کرے تو وہ ہانپنے لگتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا ہے۔ اور اسی طرح وہ آدمی ہے جو کتاب پڑھتا ہے لیکن جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل نہیں کرتا۔ اور کسی اور نے کہا ہے: یہ انتہائی بری تمثیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمثیل اس بارے میں دی ہے کہ اس پر اس کی خواہش اتنی غالب آگئی یہاں تک کہ وہ اس طرح ہوگیا کہ اپنے نفس کے بھی نفع اور نقصان کا مالک نہ رہا جیسا کہ ہمیشہ ہانپنے والا کتا ہوتا ہے، اس پر حملہ کیا جائے یا حملہ نہ کیا جائے، وہ ہانپنے کو چھوڑنے میں اپنے آپ کا مالک نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتے کی عادات میں سے یہ ہے کہ وہ اس پر واقع ہو جاتا ہے جو اسے ابتدا میں سختی اور شدت کے ساتھ خوفزدہ نہ کرے، پھر حقیر سا عوض پانے کے ساتھ ہی اس کی طیش پرسکون ہو جاتی ہے (یعنی اس کا غصہ اتر جاتا ہے اور وہ مانوس ہونے لگتا ہے) اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لیے بطور تمثیل بیان فرمایا ہے جو دین کے معاملہ میں رشوت لیتا ہے یہاں تک کہ اپنے رب کی آیات سے باہر نکل جاتا ہے۔ پس یہ آیت اس کی دلیل ہے جس نے اس میں اس اعتبار سے تدبر اور غور و فکر کی کہ کوئی نہ اپنے عمل کے ساتھ دھوکہ کھائے اور نہ اپنے علم کے ساتھ، کیونکہ وہ اس کے بارے نہیں جانتا جس پر اس کا خاتمہ ہوگا۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ حق کو باطل کرنے یا اسے تبدیل کرنے کے لیے رشوت لینا ممنوع ہے۔ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ بغیر ایسی حجت اور دلیل کے کسی عالم کی تقلید منع ہے جسے وہ بیان کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اسے اپنی یہ آیات عطا فرمائیں لیکن وہ ان سے نکل گیا پس واجب ہے کہ وہ کسی

دوسرے کے بارے اس کی مثل سے ڈرتا ہے اور یہ کہ وہ اس سے بغیر حجت کے کوئی شے قبول نہ کرے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ یعنی یہ تمام کفار کی مثال ہے۔ اور قولہ: سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ۔ کہا جاتا ہے: ساء الشیئ یعنی شی قبیح او بری ہے۔ یہ فعل لازم ہے اور ساء یسوء مسائۃ یہ متعدی ہے: أی قبح مثلهم (ان کی مثال قبیح ہے) اور تقدیر کلام ہے ساء مثلا مثل القوم (قوم کی مثال انتہائی قبیح مثال ہے) پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا، اور تمیز کی بنا پر مثلا کو نصب دی گئی ہے۔ اخفش نے کہا ہے: مجازا المثل القوم بنا دیا گیا ہے اور القوم مبتدا ہونے یا مبتدا مضمر ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ تقدیر کلام ہے: ساء المثل مثلاً ھو مثل القوم۔ ابوعلی نے تقدیر کلام یہ بیان کیا ہے: ساء مثلاً مثل القوم۔ عاصم جحدری اور اعمش نے ساء مثل القوم پڑھا ہے یعنی مثل ساء کے سبب مرفوع ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''جسے ہدایت بخشے اللہ تعالیٰ سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جنہیں گمراہ کر دے تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس کا معنی اور مفہوم کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت قدریہ کا رد کرتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ ان کا رد بھی کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین کو ہدایت دی ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کرے۔

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

''اور بے شک ہم نے پیدا کئے جہنم کے لیے بہت سے جن اور انسان ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ان سے اور ان کے کان تو ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ان سے وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے اپنے عدل کے ساتھ جہنم کے لیے کئی اہل پیدا کیے ہیں، پھر ان کے اوصاف بیان کیے اور فرمایا: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا یعنی یہ اس کی طرح ہوتے ہیں جو سمجھتا نہیں، کیونکہ وہ دلوں سے کوئی نفع نہیں اٹھاتے، نہ وہ ثواب کی عقل و سمجھ رکھتے ہیں اور نہ سزا اور عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ ہدایت کو نہیں دیکھتے اور اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کان تو ہیں لیکن ان کے ساتھ نصائح کو نہیں سنتے۔ یہاں کلی طور پر ان کے حواس سے ادراک کی نفی مقصود نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سورۃ البقرہ میں اسے بیان کیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کیونکہ وہ (اہل جہنم) ثواب کی طرف ہدایت اور رہنمائی نہیں پا سکتے، پس وہ حیوانوں

کی طرح ہیں، یعنی ان کا مقصد کھانا اور پینا ہے اور وہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں، کیونکہ حیوان اپنے منافع اور نقصان کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے مالک کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہ اس کے خلاف ہیں۔

حضرت عطا نے کہا ہے: حیوان اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں، لیکن کافر اسے نہیں پہچانتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حیوان اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور کافر مطیع نہیں ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی انہوں نے تدبر اور غور و فکر چھوڑ دیا ہے اور جنت اور جہنم سے اعراض کر لیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں نام اچھے اچھے سو پکارو اسے انہی ناموں سے اور چھوڑ دو انہیں جو کجروی کرتے ہیں اس کے ناموں میں، انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا یہ امر اس بارے ہے کہ عبادت خالصۃً اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو اور مشرکین و ملحدین سے کلی اجتناب ہو۔ مفسرین میں سے مقاتل وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مسلمانوں میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اپنی نماز میں کہہ رہا تھا: یا رحمن یا رحیم۔ تو مشرکین مکہ میں سے ایک آدمی نے کہا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب یہ گمان نہیں کرتے کہ وہ ایک رب کی عبادت کرتے ہیں، تو اسے کیا ہوا ہے کہ یہ دو ربوں کو پکار رہا ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔

مسئلہ نمبر 2۔ ترمذی اور سنن ابن ماجہ وغیرہما میں حدیث طیبہ موجود ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے اس میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں (1)۔ دونوں میں سے ایک میں وہ کچھ ہے جو دوسرے میں نہیں ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی'' میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے اور ترمذی کی حدیث ذکر کی ہے اور وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اگرچہ اس میں ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صفوان بن صالح کی حدیث کے سوا نہیں جانتے، اور وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔ اس بارے میں انہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول متواتراً منقول ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں، ایک کم سو ہیں جس نے انہیں شمار کیا (پڑھا) وہ جنت میں داخل ہوگا'' (2)۔

اس میں أحصاها کا معنی ہے جس نے انہیں گنا اور انہیں یاد کیا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جسے ہم نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اور ہم نے وہاں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام ترمذی کی حدیث صحیح ہے۔ اور ہم نے اسماء میں سے وہ بھی ذکر کیے ہیں جن پر اجماع ہے اور وہ بھی جن میں اختلاف ہے جن پر ہم اپنے ائمہ کی کتب میں واقف ہوئے ہیں اور وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب اسماء اللہ عزوجل، حدیث نمبر 3850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 257

تقریباً دو سو اسم ہیں۔ اور ہم نے ان کی تعیین سے پہلے کتاب کے مقدمہ میں بتیس فصلیں ذکر کی ہیں جو ان کے احکام سے متعلق ہیں جو کوئی واقف ہونا چاہے وہ اس کتاب اور اس کے علاوہ دیگر کتب جو اس بارے میں لکھی گئی ہیں ان کی طرف رجوع کرے۔ واللہ الموفق للصواب، لا رب سواہ۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے اس باب میں اسم اور مسمی میں اختلاف کیا ہے، علماء نے اس بارے میں جو کہا ہے ہم نے اسے "الکتاب الاسنی" میں ذکر کیا ہے۔ ابن الحصار نے کہا ہے: اس آیت میں اسم کا وقوع مسمیٰ پر بھی ہے اور تسمیہ پر بھی۔ پس قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یہ مسمیٰ پر واقع ہے، اور قول باری تعالیٰ: الْاَسْمَآءُ یہ اسم کی جمع ہے اور تسمیات پر واقع ہے، جو کچھ ہم نے کہا ہے فَادْعُوْهُ بِهَا اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، قول باری تعالیٰ فَادْعُوْهُ میں ہا ضمیر مسمیٰ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہی مدعو ہے اور بِهَا میں ھا ضمیر اسماء کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی وہ اسماء ہیں جن کے ساتھ پکارا جاتا ہے نہ کہ ان کے سوا کسی اور کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کا تقاضا لسان العرب کرتی ہے۔ اسی کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بھی ہے: لی خمسۃ أسماء أنا محمد وأحمد الحدیث (میرے پانچ اسماء ہیں میں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں) اس میں سے کچھ پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وہ رائے جسے اہل حق اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسم ہی مسمی ہے، یا اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ اسم تسمیہ کا غیر ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے: اس میں تین اقوال ہیں۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: اس میں اس پر دلیل ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے، کیونکہ اگر وہ اس کا غیر ہوتو پھر ضروری ہے کہ اسماء اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے ہوں۔ دوسرا قول یہ ہے دوسروں نے کہا ہے: اس سے مراد تسمیات ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو واحد ہے اور اسماء جمع ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ آیت میں اسماء بمعنی تسمیات ہیں۔ اس پر تاویل کرنے والوں کا اجماع ہے اس کے سوا (کوئی اور مراد لینا) جائز نہیں۔

قاضی ابوبکر نے کتاب "التمہید" میں کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل یہ ہے "کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسم ہیں جس نے انہیں پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا" (1)۔ یعنی بلا اختلاف اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے مختلف اور متفرق اوصاف پر ہونے سے عبارت ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اپنی ذات کے لیے مستحق ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا وہ اس صفت کے لیے مستحق ہوتا ہے جو اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کے وہ اسماء جو اس کی ذات کی طرف لوٹتے ہیں وہی وہ ہیں اور جو اس کی صفت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہی اس کے اسماء ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اس کی ذات کی صفات ہیں اور ان میں سے کچھ افعال کی صفات ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کی یہی تاویل ہے یعنی التسمیات الحسنی۔ تیسرا قول یہ ہے ان میں سے بعض دوسروں نے کہا ہے:

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 314

وللہ الصفات (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں)

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اسماء کو حسنیٰ کا نام دیا ہے، کیونکہ وہ کانوں اور قلوب میں حسنہ اور خوبصورت لگتے ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے جود و کرم اور اس کی رحمت و فضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اور الحسنی مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فعلی کے وزن پر الحسنی مقدر ہو، جو کہ احسن کی مؤنث ہے، جیسا کہ کبری، اکبر کی مونث ہے، اور جمع کبر اور حسن ہے۔ اور پہلے (قول) پر اسے مفرد لایا گیا ہے جیسا کہ غیر ذوی العقول کا وصف مفرد لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴿۱۸﴾ (طٰہٰ) اور یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ (سبا:10)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَادْعُوْهُ بِهَا یعنی تم اس میں سے اس کے اسماء کے سبب طلب کرو، پس ہر اسم کے ساتھ وہی چیز طلب کی جائے گی جو اس کے لائق اور مناسب ہوگی۔ پس تو کہے گا: اے رحیم! مجھ پر رحم فرما، اے حکیم! مجھے حکمت و دانائی عطا فرما، اے رازق! مجھے رزق عطا فرما، اے ہادی! مجھے ہدایت عطا فرما، اے فتاح! مجھے فتح اور کامیابی عطا فرما، اے تواب! میری توبہ قبول فرما۔ اسی طرح تمام اسماء ہیں۔

اور اگر تو عام اسم کے ساتھ دعا مانگے تو تو کہے گا: اے مالک! مجھ پر رحم فرما، اے عزیز! مجھے حکمت و دانائی عطا فرما، اے لطیف! مجھے رزق عطا فرما اور اگر اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگے اور کہے: اے اللہ! تو یہ ہر اسم کو متضمن ہے۔ اور یہ نہیں کہے گا: اے رزاق! مجھے ہدایت عطا فرما، مگر یہ کہ ارادہ یہ ہو اے رزاق مجھے خیر اور بھلائی عطا فرما۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی طرح تو اپنی دعا کو مرتب کر تو تو مخلصین میں سے ہو جائے گا۔ دعا کی شرائط سے سورۃ البقرہ میں اور اس سورت میں بھی گزر چکی ہیں۔ والحمدللہ

مسئلہ نمبر 6۔ قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد اسماء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں داخل کیے ہیں۔ مثلاً متمّ نورہ، خیر الوارثین، خیر الماکرین، رابع ثلاثۃ، سادس خمسۃ، الطیب اور المعلِم اور انہی کی مثل اور اسماء۔ ابن الحصار نے کہا ہے: انہوں نے اس میں ابن برجان کی اقتدا کی ہے، انہوں نے اسماء میں النظیف بھی ذکر کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی جو کتاب وسنت میں وارد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ان کے قول میں سے ذکر کیا گیا ہے مما لم یرد فی کتاب ولا سنۃ تو تحقیق صحیح مسلم میں الطیب آیا ہے۔ اور ترمذی نے النظیف ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: رب اعنی ولا تعن علی و انصرنی ولا تنصر علی و امکرلی ولا تمکر علی الحدیث (1) (اے میرے پروردگار! میری مدد فرما، میرے خلاف مدد نہ کر، مجھے نصرت عطا فرما اور میرے خلاف کسی کی نصرت نہ کر اور میرے لیے تدبیر فرما اور میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) اور اس حدیث کے بارے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ پس اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: یا خیر الماکرین امکرلی ولا تمکر علی (اے سب سے بہتر تدبیر فرمانے والے میرے لیے تدبیر فرما اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب دعوات عن رسول اللہ، باب فی دعاء النبی علیہ السلام، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میرے خلاف کوئی تدبیر نہ کر) ہم نے الطیب اور النظیف کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور علاوہ ازیں بھی ہیں جن کا ذکر اخبار میں ہے اور وہ سلف صالحین سے منقول ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا اور ان کے ساتھ دعا مانگنا جائز ہے اور وہ بھی ہیں جنہیں تسمیہ بنانا تو جائز ہے اور ان کے ساتھ دعا نہیں مانگی جاتی اور وہ بھی ہیں جن کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ نام رکھا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے ساتھ دعا مانگی جائے، جیسا کہ انہیں شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ وہاں تیرے لیے اس کی خوب وضاحت ہو جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يُلْحِدُوْنَ الحاد کا معنی ہے ایک طرف جھک جانا اور قصد ترک کر دینا، کہا جاتا ہے: الحد الرجل فی الدین (آدمی دین کے معاملہ میں کجرو ہو گیا یعنی اس نے دین کا اعتدال ترک کر دیا) اور جب کوئی جھک جائے تو کہا جاتا ہے: الحد اور اسی سے قبر میں لحد بھی ہے، کیونکہ وہ بھی قبر کی ایک طرف میں ہوتی ہے۔ يَلْحَدُوْنَ بھی پڑھا گیا ہے اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الحاد تین وجوہ سے ہو سکتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں تغیر اور تبدیلی ہو جیسا کہ مشرکین نے کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے انہیں (اسماء کو) اس معنی سے پھیر دیا جس پر یہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ اپنے بتوں کے نام رکھ لیے۔ پس انہوں نے اللات کو لفظ اللہ سے، العزی کو العزیز سے اور منات کو المنان سے مشتق کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ نے یہی کہا ہے۔ دوسری وجہ ان میں زیادتی کے سبب (الحاد ہو سکتا ہے)۔ اور تیسری وجہ ان سے کچھ کم کر کے (الحاد ہو سکتا ہے) جیسا کہ وہ جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں جو دعائیں اختراع کرتے ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا نام اس کے اسماء کے بغیر لیتے ہیں اور وہ اس کا ذکر اس کے بغیر کرتے ہیں اس کے افعال میں سے جن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسی چیزوں سے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: پس تو ان سے بچ اور پرہیز کر اور تم میں سے کوئی بھی اسے نہ پکارے مگر انہیں اسماء میں سے کسی کے ساتھ جو کتاب اللہ اور کتب خمسہ میں ہیں (پانچ کتابوں سے مراد) بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی ہیں۔ پس یہی وہ کتابیں ہیں جن پر اسلام کا دارومدار ہے اور ان میں وہ سب کچھ شامل ہے جو اس مؤطا میں ہے جو اصل التصانیف ہے۔ اور تم اس کے سوا (سب کو) چھوڑ دو اور تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں اس طرح کی دعا کو پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار کر لیا ہے اور اسی وجہ سے مخلوق کی طرف اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اسماء میں زیادتی سے مراد تشبیہ ہے اور نقصان سے مراد تعطیل ہے، کیونکہ مشبہ نے ایسے ناموں کے ساتھ اسے متصف کیا ہے جن کے بارے میں اس نے اجازت نہیں دی اور معطلہ نے اس سے وہ اوصاف سلب کر لیے ہیں جن کے ساتھ وہ متصف ہے۔ اسی وجہ سے اہل حق نے کہا ہے: بے شک ہمارا دین دو راستوں کے درمیان ایک راستہ ہے، نہ اس کا تعلق تشبیہ کے ساتھ ہے اور نہ ہی تعطیل کے ساتھ ہے۔ شیخ ابوالحسن بوشنجی سے توحید کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 810

فرمایا: ایک ذات کو ثابت کرنا جس کی دیگر ذاتوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو اور نہ ہی (اس کی) صفات میں سے کوئی معطل ہو۔

تحقیق قول باری تعالیٰ: وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ میں کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم انہیں چھوڑ دو اور تم ان سے بحث مباحثہ نہ کرو اور نہ ان کے ساتھ تعرض کرو۔ پس اس بنا پر یہ آیت قتال کے سبب منسوخ ہے۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی وعید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ (المدثر) (آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے)

اور اس کا ارشاد ہے: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا (الحجر:3) (انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں) اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۸۱

''اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا فرمایا ایک امت ہے جو راہ دکھاتی ہے حق کے ساتھ اور حق کے ساتھ ہی عدل وانصاف کرتی ہے''۔

حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''وہ یہی امت ہے'' اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تمہارے لیے ہے اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو بھی اسی کی مثل عطا فرمائی''۔ اور آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: ''بے شک میری امت میں سے ایک قوم حق پر رہے گی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں گے''۔ پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کسی وقت بھی دنیا کو ایسے داعی سے خالی نہیں کرے گا جو حق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۲

''اور جنہوں نے تکذیب کی ہماری آیتوں کی تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دی ہے جنہوں نے اس کی آیات کی تکذیب کی ہے کہ وہ انہیں آہستہ آہستہ پستی میں گرا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل مکہ ہیں اور استدراج کا معنی ہے بالتدریج منزل بمنزل کسی چیز کو پکڑنا اور درج کا معنی ہے کسی شے کو لپیٹنا۔ کہا جاتا ہے: أدرجتُه و درجتُه (میں نے اسے لپیٹ دیا) اور اسی سے أُدْرِجَ المیّت فی اکفانه بھی ہے (یعنی میت کو اپنے کفن میں لپیٹ دیا گیا) بعض نے کہا ہے: یہ الدرجه سے ہے۔ پھر استدراج یہ ہوگا کہ کسی کو درجہ بدرجہ مقصود کی طرف گرایا جائے۔ ضحاک نے کہا ہے: جب بھی وہ ہمارے لیے نئی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں ہم انہیں نئی نعمت عطا فرما دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: کونسی وہ انتہا ہے جس سے بندہ دھوکہ کھا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: الطاف وکرامات سے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ہم ان پر نعمتوں کی بوچھاڑ کر دیں گے

اور انہیں شکر بھلا دیں گے۔ اور انہوں نے یہ اشعار کہے ہیں:

أحسنتَ ظنّك بالأيّام إذ حَسُنتْ　　ولم تَخَفْ سوءَ ما يأتي به القَدَرُ

و سالمتْكَ الليالي فاغتررْتَ بها　　و عند صَفْوِ الليالي يحدثُ الكَدَرُ

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝١٨٣

"اور میں مہلت دیتا ہوں انہیں، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پختہ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُمْلِیْ لَهُمْ یعنی میں ان کے لیے مدت طویل کر دیتا ہوں اور انہیں مہلت دیتا ہوں اور ان کی سزا مؤخر کر دیتا ہوں۔ اِنَّ كَیْدِیْ یعنی بے شک میری خفیہ تدبیر مَتِیْنٌ انتہائی قوی اور مضبوط ہے۔ اس کی اصل المتن سے ہے، اور اس سے مراد وہ موٹا گوشت ہے جو صلب کی جانب سے ہو۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت استہزاء کرنے والے قریش کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دینے کے بعد پھر ایک ہی رات میں ہلاک کر دیا۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً (انعام:44) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝١٨٤

"کیا اب تک نہیں غور و فکر کیا انہوں نے۔ ان کے صاحب پر تو جنوں کا ذرا اثر نہیں، نہیں ہے وہ مگر کھلم کھلا ڈرانے والا"۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا کیا اب تک انہوں نے اس میں غور و فکر نہیں کیا جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر ان کے پاس آئے۔ یَتَفَكَّرُوْا پر وقف کرنا اچھا ہے۔ پھر فرمایا: مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ یہ ان کے اس قول کا رد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦ (الحجر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات قریش کو دعوت دینے کے لیے صفا پر کھڑے ہوئے، آپ علیحدہ علیحدہ قبیلہ کو بلاتے اور فرماتے: "اے بنی فلاں" آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی سزا سے ڈراتے رہے۔ تو ان میں سے بعض کہنے والوں نے کہا: بے شک ان کا یہ صاحب تو مجنون ہے، رات بھر آواز بلند ہوتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی (1)۔

اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝١٨٥

"کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں اور (اس میں) جو چیز پیدا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس میں کہ شاید نزدیک آ گئی ہو ان کی مقررہ میعاد۔ تو کس بات پر وہ اس (قرآن) کے بعد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 483

ایمان لے آئیں گے“۔

قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا یہ قرآن کریم کی آیات میں نظر وفکر کرنے سے ان کے اعراض کرنے پر اظہار تعجب ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کو پہچان سکتے، جیسا کہ ہم نے انہیں سورۃ البقرہ میں بیان کیا ہے۔ اور ملکوت مبالغہ میں سے ہے۔ اور اس کا معنی ہے وسیع مملکت، عظیم سلطنت۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں نظر وفکر کرنا اور اس کی مخلوقات سے عبرت حاصل کرنا واجب ہے انہوں نے اس آیت اور اس کی مثل دیگر آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمایئے غور سے دیکھو! کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا (ق: 6) کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے۔ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۞ الآیہ (الغاشیہ) (کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے) وَفِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نظر وفکر نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی ہے اور ان کے اپنے حواس سے نفع اٹھانے کو سلب کر لیا ہے پس ارشاد ربانی ہے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا الآیہ (الاعراف: 179) (ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے) علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ واجبات میں سے پہلا واجب کیا ہے، کیا وہ نظر وفکر کرنا اور استدلال کرنا ہے یا وہ ایمان ہے جو دل میں حاصل ہونے والی تصدیق ہے اور اس کے صحیح ہونے کے لیے معرفت شرط نہیں؟ تو قاضی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر وفکر اور استدلال کرنا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو بداہۃً نہیں جانا جا سکتا، بلکہ اس کا علم نظر و فکر کرنے اور ان دلائل سے استدلال کرنے سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی معرفت اور پہچان کے لیے قائم کیے ہیں۔ یہی موقف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اپنی کتاب میں یہ باب باندھا ہے (باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ عزوجل: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

قاضی نے کہا ہے: جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے نہیں جانتا تو وہ جاہل ہے اور جو اس کے بارے جاہل ہے وہ کافر ہے۔ ابن رشد نے اپنے مقدمات میں کہا ہے: یہ بین نہیں ہے، کیونکہ ایمان اس یقین کے ساتھ صحیح ہوتا ہے جو اسے حاصل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تقلید کے سبب ہدایت عطا فرمائی اور پہلے مرحلہ میں اعتبار اس کا ہے جس کے اعتبار کی طرف اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی آیت کے رہنمائی فرمائی۔ فرمایا: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اوّل الواجبات نظر واستدلال ہے ان کے خلاف علامہ الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ تمام زمانوں میں عوام الناس اور مقلدین کا نام مومنین رکھنے پر تمام مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر وہ صحیح ہے جس کی طرف نظر واستدلال والے لوگ گئے ہیں تو پھر مومن صرف اسے ہی کہا جائے جس

کے پاس نظر واستدلال کے سبب علم ہو۔ اور مزید یہ کہا ہے: اگر ایمان صحیح نہ ہو مگر نظر واستدلال کے بعد تو پھر کفار کے لیے جائز ہے کہ جب مسلمان ان پر غالب آئیں تو وہ ان سے کہیں: تمہارے لیے ہمیں قتل کرنا حلال نہیں ہے، کیونکہ تمہارے دین میں سے یہ ہے کہ ایمان صحیح نہیں ہوتا مگر نظر وفکر اور استدلال کے بعد، پس تم ہمیں مہلت دو تا کہ ہم غور وفکر کریں اور دلائل حاصل کر سکیں۔ علامہ نے فرمایا: یہ شے انہیں ان کے کفر پر ہی چھوڑنے کی طرف پہنچانے والی ہے اور یہ کہ انہیں قتل نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ غور وفکر کرلیں اور استدلال کرلیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے، رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کا قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور وہ ایمان لائیں میرے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو میں لے کر آیا ہوں، پس جب انہوں نے ایسا کرلیا تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے اموال مجھ سے محفوظ کر لیے سوائے حق کے اور ان کا حساب الله تعالیٰ پر ہے''۔ ابن منذر نے ''کتاب الاشراف'' میں ایمان کامل کی صفات ذکر کی ہیں اہل علم میں سے جو کوئی اسے یاد رکھتا ہے ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ کافر جب کہے اشھد أن لا إله إلا الله وأشھد أن محمدًا عبدہٗ و رسولہٗ اور یہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو لے کر آئے وہ حق ہے اور میں ہر اس دین سے اظہار برأت کرتا ہوں جو دین اسلام کے مخالف ہے، درآنحالیکہ وہ بالغ اور صحیح العقل ہو بلا شبہ وہ مسلمان ہے۔ اور اگر اس کے بعد وہ رجوع کرلے اور کفر ظاہر کرے تو وہ مرتد ہوگا اور اس پر وہ سزا واجب ہوگی جو مرتد پر واجب ہوتی ہے۔ ابو حفص زنجانی نے کہا ہے: ہمارے شیخ قاضی ابو جعفر احمد بن محمد سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اوّل الواجبات الله تعالیٰ، رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اور اس دین کے ساتھ ایمان لانا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، بعد از اں نظر واستدلال دونوں الله تعالیٰ کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں، پس آپ کے نزدیک ایمان بالله کا وجوب معرفت بالله پر مقدم ہے۔ فرمایا: یہ صواب کے زیادہ قریب ہے اور مخلوق کے لیے زیادہ مفید ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر معرفت اور نظر واستدلال کی حقیقت کو جانتے ہی نہیں پس اگر ہم کہیں: اوّل الوجبات الله تعالیٰ کی معرفت ہے تو یہ یقینا ایک جم غفیر اور کثیر تعداد کی تکفیر تک پہنچا دے گا اور یہ کہ پھر اکا دکا لوگوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اور یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین دلایا ہے کہ اہل جنت میں سے سب سے زیادہ آپ کی امت ہوگی۔ اور یہ کہ تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی امتیں ایک صف ہوں گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اسی صفیں ہوگی۔ اور یہ انتا بین اور واضح ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ والحمدلله

مسئلہ نمبر 3۔ متکلمین میں سے بعض متأخرین اور متقدمین نے یہ کہا ہے کہ جس نے الله تعالیٰ کو ان طرق سے نہ پہچانا جو انہوں نے معرفت کے طریقے مقرر کیے ہیں اور ان ابحاث سے نہ پہچانا جو انہوں نے تحریر کیے ہیں تو اس کا ایمان صحیح نہیں اور وہ کافر ہے۔ تو اس بنا پر تو اکثر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے اور سب سے اوّل جس سے تکفیر کی ابتدا کی جائے گی وہ اس کے اپنے آباء، اسلاف اور پڑوسی ہوں گے۔ اور بعض کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے کہا: مجھے اہل نار کی کثرت کے سبب برا بھلا نہ کہہ۔ اوکما قال

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول صادر نہیں ہو سکتا مگر اسی سے جو کتاب اللہ اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جاہل ہو، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو متکلمین کی ایک قلیل سی جماعت پر محصور کر دیا ہے اور انہوں نے عام مسلمانوں کی تکفیر کی مشقت کی ہے۔ یہ اس اعرابی کے قول سے کہاں ثابت ہے جس نے پیشاب کرنے کے لیے اپنی شرمگاہ کو کھولا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اسے جھڑکا: اللھم ارحمنی و محمداً ولا ترحم معنا أحداً (اے اللہ! مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر) تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لقد حجرت واسعاً (1) (تحقیق تو نے وسیع (رحمت) کو محدود کر دیا ہے) اسے امام بخاری، ترمذی اور دیگر آئمہ نے روایت کیا ہے۔ کیا آپ اس اعرابی کے بارے جانتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو دلیل و برہان اور حجت و بیان کے ساتھ پہچان لیا تھا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شے سے وسیع ہے اور اس کی مثل اور کتنے ہوں گے جن کے لیے ایمان کا حکم لگایا گیا، بلکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس بارے بہت سے لوگوں کے بارے صرف اس پر اکتفا کیا کہ وہ شہادتین پڑھنے کے سبب اسلام لائے، حتیٰ کہ آپ نے اس میں اشارے پر بھی اکتفا کیا۔ کیا تم جانتے نہیں ہو جب آپ نے سوداء کو کہا تھا: ''اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟''۔ اس نے جواب دیا: آسمان میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''میں کون ہوں؟''۔ اس نے کہا: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أعتقها فإنها مومنة (تو اسے آزاد کر دے بلاشبہ یہ مومنہ ہے) یہاں نظر و استدلال تو نہ تھا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی مرحلہ میں ان کے ایمان کا حکم لگا دیا، اگرچہ وہاں نظر و معرفت سے غفلت تھی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ امرد (بے ریش نابالغ بچہ) اور عورتوں میں سے حسینوں کے چہروں میں دیکھنا اور غور و فکر کرنا بھی جائز نہیں۔ علامہ ابوالفرج جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابوطیب طاہر بن عبداللہ طبری نے کہا ہے مجھے اس گروہ کی جانب سے یہ خبر پہنچی ہے جو سماع سنتا ہے کہ وہ امرد کے چہرے کی طرف کثرت سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات اسے زیور اور رنگ دار کپڑوں کے ساتھ آراستہ اور مزین کرتے ہیں اور وہ گمان یہ کرتے ہیں کہ وہ اس سے ایمان میں زیادتی کا قصد کرتے ہیں نظر و فکر کے ذریعے اور صنعت سے صانع پر استدلال کرتے ہیں۔ یہ خواہش نفس کی پیروی کرنے، عقل کو دھوکہ دینے اور علم کی مخالفت کرنے کی انتہا ہے۔ ابوالفرج نے کہا ہے: امام ابوالوفاء بن عقیل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے دیکھنا حلال نہیں کیا مگر صرف اس صورت میں جس کی طرف نفس کا میلان نہ ہو، اس میں ہواء و ہوس کا حصہ نہ ہو، بلکہ اس میں ایسی عبرت ہو جس میں شہوت کی آمیزش نہ ہو۔ اور نہ اس کے ساتھ لذات کی ملاوٹ ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی عورت کو رسول بنا کر مبعوث نہیں فرمایا اور نہ ہی کسی کو قاضی، امام اور موذن بنایا، یہ سب اس لیے ہوا کیونکہ عورت شہوت اور فتنہ کا محل ہے۔ پس جس نے کہا: میں حسین و جمیل صورت سے نصیحت پکڑتا ہوں تو ہم اس کی تکذیب کریں گے۔ اور ہر وہ جس نے اپنے آپ کو ایسی فطرت اور طبیعت کے ساتھ ممتاز کیا جو اسے ہماری طبائع سے نکال دے تو ہم اس کی تکذیب کریں گے، بلاشبہ یہ ان کے لیے شیطان کے دھوکے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: عالم کبیر کی ہر شے کی نظیر عالم صغیر میں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **لَقَدْ خَلَقْنَا**

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889

الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۝ (التین) (بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر) اور مزید یہ فرمایا: وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)

ہم نے وجہ تمثیل سورۃ الانعام کے اول میں بیان کردی ہے۔ پس صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرف دیکھے اور اپنی خلقت میں اس وقت سے غور وفکر کرے جب کہ وہ ٹپکنے والے پانی سے لے کر خلقا سویا کے مقام تک پہنچا، اسے غذائیں مہیا کی جاتی ہیں، نرمی کے ساتھ اس کی تربیت کی جاتی ہے اور انتہائی ملائمت کے ساتھ اس کی حفاظت کی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ قوت اور طاقت حاصل کر لیتا ہے اور جوانی وبلوغت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اور جب وہ اس حال میں ہوتا ہے تو پھر کہتا ہے: میں ہی میں ہوں، اور اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس پر ایسا زمانہ بھی آیا ہے جب وہ قابل ذکر شے نہ تھا اور عنقریب وہ قبر میں لوٹ جائے گا۔ پس اس پر افسوس ہے اگر یہ تھکا ماندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ۝ ...... تا قولہ ...... الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۝ (اور بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں ... پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا)

پس وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ بندہ ہے جسے پالا گیا ہے، احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اگر وہ کوتاہی کرے، اسے ثواب کی امید دلائی گئی ہے اگر وہ اطاعت وفرمانبرداری کرے، پس وہ اپنے مولیٰ کی عبادت پر متوجہ رہے (کیونکہ) اگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ (مولیٰ) تو اسے دیکھ رہا ہے اور وہ لوگوں سے نہ ڈرے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اس سے ڈرے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی پر تکبر نہ کرے، کیونکہ وہ غلاظت اور میل کچیل سے مرکب ہے، وہ جنت کی طرف جانے والا ہے اگر اس نے اطاعت کی یا پھر آتش جہنم کی طرف جانے والا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے شیوخ پسند کرتے ہیں کہ آدمی ان حکمت بھرے اشعار میں غور وفکر کرے جو ان علمی اوصاف کے جامع ہیں۔

کیف یَزْهُو مَن رجیعُه　أبدَ الدهر ضجیعُه

فهو منه والیه　وأخوه و رضیعُه

وهو یدعوه إلی الحش　بصُغْر فیطیعُه

قولہ تعالیٰ: وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے، یعنی ان اشیاء میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں۔ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ یعنی ان مقررہ مدتوں میں جن کے بارے امید ہے کہ وہ قریب آ گئی ہوں۔ یہ کلام محل جر میں ہے اور اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ اس میں اقترب أجل (مقررہ میعاد کا قریب آنا) سے مراد غزوہ بدر اور غزوہ احد کے دن ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ یعنی وہ قرآن جو حضور نبی

رحمت محمد مصطفی ﷺ لے کر آئے اس کے بغیر کون سا قرآن ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے؟ اور بعض نے کہا ہے: آیت میں ہا ضمیر کا مرجع اجل ہے، معنی یہ ہوگا مقررہ معیاد آنے کے بعد وہ کون سی بات کے ساتھ ایمان لائیں گے جس وقت ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا، کیونکہ آخرت تو دار التکلیف نہیں ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۸۶

''جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے۔ وہ رہنے دیتا ہے انہیں کہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں''۔

بیان فرمایا کہ ان کے اعراض کی وجہ یہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ یہ جملہ مستانفہ ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ فاء اور اس کے مابعد کے محل پر محمول کرتے ہوئے اسے جزم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ يَعْمَهُوْنَ یعنی وہ حیرت زدہ رہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ متردد ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدا میں پوری بحث گزر چکی ہے۔

يَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۂ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔـلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۷

''وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ کب ہوگا اس کا وقوع۔ آپ کہیے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی، یہ (حادثہ) بہت گراں ہے آسمانوں اور زمین میں، نہ آئے گی تم پر مگر اچانک۔ وہ پوچھتے ہیں آپ سے گویا آپ خوب تحقیق کر چکے ہیں اس کے متعلق۔ آپ فرمایئے: اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: يَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا، أیان یہ متیٰ کے مثل زمانے اور وقت کے بارے سوال کے لیے آتا ہے۔ راجز نے کہا ہے:

أیان تقضِی حاجتی أیان أما ترى لِنجحِها أوانا(1)

اس میں أیان وقت کے بارے سوال کے لیے ہی ہے۔

یہودی حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا کرتے تھے: اگر آپ نبی ہیں تو ہمیں قیامت کے بارے بتایئے وہ کب قائم ہوگی؟ اور یہ روایت بھی ہے کہ مشرکین نے فرط انکار کی وجہ سے یہ کہا: مُرْسٰىهَا سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور خبر أیان ہے۔ اور یہ ظرف مبنی علی الفتح ہے۔ یہ مبنی ہے کیونکہ اس میں استفہام کا معنی ہے۔ اور مُرْسٰىهَا میم کے ضمہ کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 484

ساتھ ہے، یہ أرساھا اللہ سے ہے یعنی اللہ نے اسے ثابت کر دیا، گویا اس کا معنی ہوا متی مُثْبَتُھا یعنی اس کا وقوع کب ہوگا؟ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ رَسَتْ سے ہے۔ بمعنی ثبتت و وقفت (ثابت ہوگئی اور ٹھہر گئی) اور اسی سے وَّ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ (سبا: 13) ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بمعنی ثابتات ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی کسی کے لیے اس نے اسے بیان نہیں کیا، تا کہ بندہ ہمیشہ محتاط اور خوفزدہ رہے۔

لَا يُجَلِّيْهَا یعنی وہ اسے ظاہر نہیں کرے گا۔ لِوَقْتِهَآ بمعنی فی وقتھا ہے یعنی اپنے وقت میں اِلَّا هُوَ مگر وہی۔ التجلیۃ کا معنی ہے شے کو ظاہر کرنا۔ کہا جاتا ہے: جلالی فلان الخبر یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ خبر ظاہر کر دے اور اس کی وضاحت کر دے۔ اور ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے باسیوں پر اس کا علم مخفی ہے۔ اور ہر وہ شے جس کا علم مخفی اور پوشیدہ ہو تو وہ دل پر ثقیل اور گراں ہوتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا آنا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں پر گراں ہے۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے: اس کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین کے مکینوں پر بھاری اور عظیم ہوگا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کے عظیم اور بھاری ہونے کی وجہ سے آسمان اور زمین (اسے برداشت کرنے کی) طاقت نہیں رکھیں گے، کیونکہ آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے اور سمندر بہہ جائیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے بارے سوال کرنا ثقیل اور بھاری ہے۔ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یعنی یہ تم پر اچانک آئے گی، بَغْتَةً مصدر ہے حال کے محل میں ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا یعنی وہ آپ سے اس کے بارے کثرت سے سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کے بارے جانتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے: الحفی کا معنی ہے کسی شے کے بارے جاننے والا۔ اور الحفی کا معنی ہے: سوال میں انتہا کو پہنچنے والا۔ اعشی نے کہا ہے:

فإن تسألي عَنّي فيا رب سائل حَفِي عن الأعشى به حيث أصْعَدَا

کہا جاتا ہے: أحفی فی المسألة وفی الطلب (یعنی اس نے سوال میں اور طلب میں انتہا کر دی) فھو محف وحفی علی التکثیر وہ کثرت میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے، مثلاً مخصب اور خصیب۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: وہ آپ سے پوچھتے ہیں گویا آپ اس کے بارے سوال سے متعلق اصرار کرنے والے ہیں۔ المعنی یسألونك كأنك حفِي بالمسألة عنها، ای مُلِحٌ یہ اس طرف جاتا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: وہ آپ سے اس کے بارے پوچھتے ہیں گویا آپ ان کے ساتھ سلوک کرنے پر مصر ہیں اور ان کے سوال سے خوش ہیں یسألونك عنها كانك حَفِيٌ بهم ای حفی ببرهم و فرح بسؤالهم اور یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے کہا: ہمارے اور آپ کے درمیان قرابت اور رشتہ داری ہے تو آپ ہم پر قیامت کے وقت کے بارے راز ظاہر فرما دیجیے۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ تکرار نہیں ہے، کیونکہ دو علموں میں سے ایک قیامت کے وقوع کے بارے ہے اور

دوسرا اس کی حقیقت و ماہیت کے بارے ہے۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛؕ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

"آپ کہیے: نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے نفع کا اور نہ ضرر کا، مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف، نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا (نافرمانوں کو) اور خوش خبری سنانے والا اس قوم کو جو ایمان لائی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا یعنی میں مالک نہیں ہوں کہ میں اپنی ذات کی طرف خیر اور نفع لاسکوں اور نہ اس کا مالک ہوں کہ اپنے آپ سے شر اور ضرر دور کر سکوں، تو پھر میں قیامت کے علم کا مالک کیسے ہوسکتا ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: میں اپنے آپ کے لیے ہدایت اور ضلال کا مالک نہیں ہوں۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ یہ استثنا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور معنی یہ ہے: مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ کہ وہ مجھے اس کا مالک بنادے اور مجھے قدرت عطا فرمادے۔ سیبویہ نے کہا ہے:

مهما شاء بالناس یفعل

وہ لوگوں کے بارے جو چاہے وہ کر دیتا ہے۔

وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ اس کا معنی ہے اگر میں اسے جان لیتا جو مجھ سے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس سے پہلے کہ وہ مجھے اس کے بارے آگاہ فرمائے تو میں یقیناً اسے کرتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اگر میں جان لیتا کب جنگ میں میرے لیے مدد و نصرت آئے گی تو میں یقیناً قتال کرتا اور میں مغلوب نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (1) نے کہا ہے: اگر میں قحط سالی کے بارے جان لیتا تو میں یقیناً خوشحالی کے زمانہ میں اس کی تیاری کرتا جو مجھے کافی ہو رہتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں اس (مال) تجارت کے بارے جان لیتا جو ختم ہو جاتا ہے تو میں یقیناً اسے اس کی کساد بازاری کے وقت خرید لیتا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں جان لیتا میں کب فوت ہوں گا تو میں یقیناً اعمال صالحہ میں سے بہت جمع کر لیتا۔ یہ حسن اور ابن جریج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) غیب جان لیتا تو میں یقیناً ہر اس کے بارے جواب دیتا جس کے بارے مجھ سے سوال کیا جاتا ہے۔ یہ سب ہی مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛؕ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ یہ نیا کلام ہے، یعنی مجھے کوئی جنون نہیں ہے، کیونکہ انہوں (کفار مکہ) نے آپ کو مجنون کہا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ کلام ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور معنی یہ ہے اگر میں غیب جان لیتا تو مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور میں محفوظ رہتا۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۵﴾ (الشعرا) (نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 485

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِیَسۡكُنَ اِلَیۡهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِیۡفًا فَمَرَّتۡ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنۡ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے پھر جب مرد ڈھانپ لیتا ہے عورت کو تو حاملہ ہو جاتی ہے ہلکے سے حمل سے پھر چلتی پھرتی رہتی ہے اس کے ساتھ، پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دعا مانگتے ہیں (میاں بیوی) اللہ سے جو ان کا رب ہے کہ اگر تو عنایت فرمائے ہمیں تندرست لڑکا تو ہم ضرور ہو جائیں گے تیرے شکرگزار بندوں سے پس جب اللہ عطا کرتا ہے انہیں تندرست لڑکا دونوں بناتے ہیں، اللہ کے ساتھ شریک اس میں جو اس نے انہیں دیا، تو بلند و برتر ہے اللہ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ جمہور مفسرین نے کہا ہے: اس میں نفس واحد (ایک نفس) سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا (اور بنایا اس سے جوڑا) یعنی حواء علیہا السلام سے۔ لِیَسۡكُنَ اِلَیۡهَا تا کہ وہ اس سے انس حاصل کریں اور اطمینان پائیں اور یہ سب جنت میں ہوا۔ پھر دوسری حالت کا آغاز ہوا جو ان دونوں کے زمین پر اترنے کے بعد دنیا میں پیش آئی۔ پس فرمایا: فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا یہ جماع سے کنایہ ہے۔ حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِیۡفًا ہر وہ شے ہے جو پیٹ میں ہو یا درخت کے اوپر ہو تو وہ حمل کہلاتی ہے (یعنی اس میں حا مفتوح ہے) اور جب وہ (بوجھ) پیٹھ پر ہو یا سر پر تو وہ حمل کہلاتا ہے (یعنی اس میں حا مکسور ہوتی ہے) یعقوب نے حمل النخلۃ بالکسر بیان کیا ہے۔ اور ابوسعید سیرانی نے کہا ہے: عورت کے حمل کے بارے میں حمل اور رحمل دونوں کہے جاتے ہیں، یہ ایک بار اپنے مخفی اور پوشیدہ ہونے کی وجہ سے عورت کے حمل کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور ایک بار اپنے واضح اور ظاہر ہونے کی وجہ سے حمل الدابۃ (چوپائے کا بوجھ) کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اور حمل مصدر بھی ہے جب کوئی کسی پر حملہ کرے تو کہا جاتا ہے: حَمل علیه، یحمل حملاً۔ فَمَرَّتۡ بِهٖ یعنی پھر وہ منی کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے، یعنی اس ہلکے سے حمل کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ وہ فرما رہا ہے: وہ کھڑی ہوتی ہے، بیٹھتی ہے اور ادھر ادھر چلتی رہتی ہے، کروٹ بدلتی رہتی ہے اور وہ اپنے حمل کے بوجھل اور بھاری ہونے تک کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ یہ معنی حسن اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فاستمر بها الحمل (پس اس کے ساتھ حمل قائم رہتا ہے) پس اس میں قلب کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أدخلتُ القلنسوۃ فی رأسی (میں نے ٹوپی سر میں داخل کی) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

نے اسے فَمَارَتْ بِہٖ الف اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مَارَ، یَمُوْرُ سے ہے جب کوئی آئے، جائے اور تصرف کرے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہ نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ المِرْیَۃ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ اس بارے میں شک میں پڑ جاتی ہے جو اسے لاحق ہوتا ہے کہ کیا یہ حمل ہے یا بیماری ہے؟ یا اسی طرح کے اور شکوک وشبہات۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أثمر النخل (درخت پھل دار ہو گیا) اور بعض نے کہا ہے: جب وہ بوجھ میں داخل ہو جاتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصبح وأمسی (اس نے صبح کی اور شام کی) دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا، دَعَوَا میں ضمیر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ اس قول کی بنا پر ہے جو اس آیت کے قصص میں روایت کیا گیا ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام جب پہلی بار حاملہ ہوئیں تو آپ نہ جانتی تھیں کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ اس کی قراءت کو تقویت دیتا ہے جس نے فَمَرَتْ بِہٖ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو آپ اس سے گھبرا گئیں۔ چنانچہ ابلیس نے آپ کی طرف موقع پا لیا۔ حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک ابلیس ایک آدمی کی صورت میں حضرت حواء علیہا السلام کے پاس آیا جب آپ پہلے حمل کے ساتھ بوجھل ہوئیں اور کہا: تمہارے پیٹ میں یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں جانتی۔ اس نے کہا: مجھے تو یہ خوف ہے کہ کہیں یہ چوپایہ ہو۔ پس آپ نے یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کو بتائی، تو وہ دونوں اس وجہ سے پریشان رہنے لگے۔ پس وہ (ابلیس) دوبارہ آپ کے پاس گیا اور کہنے لگا: وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔ پس اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو تو انسان کو جنم دے گی کیا تو اس کا نام میری نسبت سے رکھے گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: پس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ پس جب آپ نے بچے کو جنم دیا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اس کا نام میرے نام پر رکھو۔ تو آپ نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: حارث۔ اگر وہ آپ کو اپنا نام بتاتا تو یقیناً آپ اسے پہچان لیتی۔ پس آپ نے بچے کا نام عبدالحارث رکھا۔ اسی طرح ضعیف حدیث سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے، یہ ترمذی وغیرہ میں ہے اور اسرائیلیات میں کثیر واقعات ہیں جو ثابت نہیں۔ اور کوئی بھی صاحب دل ان کی اعتماد نہیں کرتا۔ بلاشبہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام اگرچہ اس نے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کیا ہے لیکن مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاسکتا، پس یہ قصے بنائے گئے ہیں اور لکھ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس نے ان دونوں کو دو بار دھوکہ دیا ایک بار جنت میں دھوکہ دیا اور (ایک بار) زمین میں دھوکہ دیا'' (1)۔ اور اس کی تائید سلمی کی قراءت أتشركون تا کے ساتھ سے کی گئی ہے۔ اور صَالِحًا کا معنی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست بچہ چاہتا ہے۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا وہ شرک جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی طرف منسوب ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 3۔ مفسرین نے کہا ہے: یہ تسمیہ اور صفت میں شرک تھا، نہ کہ عبادت اور ربوبیت میں۔ اہل معانی نے کہا: بلاشبہ دونوں نے یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ حارث ان دونوں کا رب ہے اس وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 204

عبدالحارث رکھا ہے، بلکہ یہ قصد کیا کہ حارث بیٹے کی نجات کا سبب ہے اس لیے اس کا نام اس کے نام کے ساتھ رکھا جیسا کہ کوئی آدمی انتہائی عاجزی اور خضوع کی بنا پر اپنے آپ کو عبد ضیفہ پکارنے لگے، نہ کہ اس بنا پر کہ ضیف (مہمان) اس کا رب ہے، جیسا کہ حاتم نے بھی کہا ہے:

وإنّي لعبدُ الضيف مادام ثاوِيًا وما فيّ إلّا تيكَ من شِيمة العبدِ

اور ایک قوم نے کہا ہے: بے شک یہ آدمیوں کی جنس کی طرف راجع ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مشرکین کے حال کی وضاحت اور بیان ہے اور یہ وہ (معنی) ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پس قول باری تعالیٰ: **جَعَلَا لَهٗ** میں مراد مذکر اور مونث کفار ہیں اور اس سے دونوں جنسیں مراد لی گئی ہیں۔ اور اس پر دلیل **فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** ہے۔ اس میں یشرکان نہیں کہا ہے۔ یہ قول حسن ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے **هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ** وہ ہے جس نے تمہیں ایک شکل سے پیدا کیا ہے۔ **وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا** اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ **فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا** یعنی دونوں جنسوں نے (جب ایک دوسرے کو ڈھانپ لیا) اس قول کے مطابق آیت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہما السلام کا ذکر نہیں ہوگا۔ پس جب اللہ تعالیٰ انہیں صحیح سالم صحت مند لڑکا عطا فرما دیتا ہے جیسے وہ اس کی خواہش رکھتے ہیں تو پھر وہ دونوں اسے فطرت سے شرک کی طرف پھیر دیتے ہیں، یہ مشرکین کا فعل ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی نومولود بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے ''وہ اس ملت پر پیدا کیا جاتا ہے، (پھر) اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں''۔

عکرمہ نے کہا ہے: حضرت آدم علیہ السلام اس کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد تمام مخلوق کے لیے عام قرار دیا ہے۔ حسین بن فضل نے کہا ہے: اہل فکر و نظر کے نزدیک یہ زیادہ عجیب ہے، کیونکہ پہلے قول میں عظائم کو اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اہل مدینہ اور حضرت عاصم نے توحید اور مفرد کی بنا پر شرکا پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو اور تمام اہل کوفہ نے صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ فعلاء کے وزن پر ہے اور شریک کی جمع ہے۔ اخفش سعید نے پہلی قراءت کا انکار کیا ہے۔ اور یہ قراءت صحیح ہے اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی جعلا لہ ذا شرك جیسا کہ **وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ** (یوسف:82) میں ہے پس معنی اس طرف راجع ہوگا کہ انہوں نے اس کے شریک بنا لیے۔

مسئلہ نمبر 4۔ آیت اس پر دلیل ہے کہ حمل امراض میں سے ایک مرض ہے۔ ابن القاسم اور یحییٰ نے مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حمل کی ابتدا آسانی اور سرور ہے (1) اور اس کا آخر بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے۔ یہ وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انه مرض من الأمراض قول باری تعالیٰ: **دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا** کا ظاہر اس کی تائید کرتا ہے اور یہ وہ حالت ہے جس کا مشاہدہ حاملہ عورتوں میں کیا جاتا ہے۔ امر کے عظیم ہونے اور خطاب کے شدید ہونے کی وجہ سے ہی اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 820

کی موت کو شہادت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے (1)۔ اور جب یہ ظاہر آیت سے ثابت ہے، تو پھر حاملہ کی حالت افعال میں مریض کی حالت کی مثل ہے۔ علماء امصار کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مریض کا فعل کسی کو ہبہ اور عطیہ دینے کے بارے اپنے (مال کے) ثلث (تہائی حصہ) میں جاری ہوتا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حاملہ میں آزاد آدمی کی حالت کی مثل جاری ہوگا اور رہا اس سے قبل تو وہ اس طرح نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حمل ایک عادت ہے اور اس میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا ہے: اس طرح اکثر بیماریوں میں غالب گمان سلامتی کا ہوتا ہے اور کبھی وہ مر جاتا ہے جو مریض نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس دن سے عورت حاملہ ہوئی اس دن سے جب اس کے چھ مہینے گزر جائیں تو پھر اس کا اپنے مال میں سوائے ثلث کے کوئی فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اور جس نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دی درآنحالیکہ وہ حاملہ تھی تو جب اس پر چھ ماہ گزر گئے تو اس نے اس کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے یہ صحیح نہیں، کیونکہ وہ عورت مریضہ ہے اور مریضہ کا نکاح صحیح نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ یحییٰ نے کہا ہے: میں نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے آدمی کے بارے میں جو قتال میں حاضر ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب وہ جنگ کے لیے صف میں موجود ہو تو پھر اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصہ کے سوا میں کسی شے کا فیصلہ کرے، بلاشبہ وہ حاملہ عورت اور ایسے مریض کے قائم مقام ہے جس پر اس کی حالت کے سبب (موت کا) خوف غالب ہوتا ہے۔ اور اسی حکم میں وہ بھی شامل ہے جسے قصاصاً قتل کرنے کے لیے قید کیا گیا ہو۔ اس بارے میں امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (2) نے کہا ہے: جب تو بنظر غائر دیکھے تو تجھے اس بارے میں کوئی شک نہ ہوگا کہ قتل کے لیے محبوس آدمی کی حالت مریض کی نسبت زیادہ شدید اور پریشان کن ہوتی ہے اور اس کا انکار نظر و فکر میں غفلت کی علامت ہے، کیونکہ دونوں کے نزدیک موت کا سبب موجود ہے۔ جیسا کہ مرض موت کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (آل عمران) (اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو)

اور روشد طائی نے کہا ہے:

يا أيها الراكبُ المُزجي مَطِيَّتَه ... سائِلْ بني أسَدٍ ماهذه الصَّوْتُ

وقل لهم بادروا بالعُذر والتمسوا ... قولا يُبَرّئكم إنّي أنا المَوْتُ

اور جو اس پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی فضل من مات فی الطاعون، حدیث نمبر 2704۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب:10) (جب انہوں نے بلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے)

پس امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کیسے کہتے ہیں کہ شدید ترین حالت بلاشبہ یہ مبارزت (اور مقابلہ) کی حالت ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابل ہونے اور دونوں فریقوں کے ایک دوسرے کے ساتھ قریب ہونے کی اس عظیم حالت کے ساتھ خبر دی ہے جس میں دل نرخروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور (یہ) اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوءِ ظن رکھنے اور دلوں کے متزلزل اور ان کے اضطراب میں سے ہے، کیا یہ حالت تو مریض پر دیکھتا ہے یا نہیں؟ یہ وہ حالت ہے جس میں کوئی انصاف کرنے والا شک نہیں کر سکتا۔ اور یہ اس کے لیے جو اپنے اعتقاد میں ثابت اور پختہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس طرح جہاد کرے جیسے جہاد کا حق ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آیات و معجزات کی شہادت دے، پس یہ ہمارے بارے میں کیسے ہو سکتی ہے؟

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے علماء نے سمندر میں سفر کرنے والے کے بارے میں خوف کے وقت حکم میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اس کا حکم صحیح اور تندرست آدمی کے حکم میں ہوگا یا کہ حاملہ کے حکم میں؟ تو ابن القاسم نے کہا ہے: اس کا حکم صحت مند آدمی کے حکم کی طرح ہے۔ ابن وہب اور اشہب نے کہا ہے: اس کا حکم اس حاملہ کے حکم کی طرح ہے جس کے حمل کی مدت چھ ماہ ہو جائے۔ قاضی ابو محمد نے کہا ہے: ان دونوں کا قول زیادہ عمدہ اور اچھا ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس پر خوف کی حالت میں ہے جیسا کہ بوجھ اٹھانے والے (حالت خوف میں ہوتے ہیں)۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: ابن القاسم نے سمندر کا سفر نہیں کیا اور نہ اس نے عود پر کوئی کپڑا دیکھا۔ اور جو چاہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یقین کر لے کہ وہ اکیلا فاعل ہے اس کے ساتھ کوئی اور فاعل نہیں اور یہ اسباب کمزور ہیں یقین رکھنے والے کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور توکل اور تفویض کرنا ثابت ہوتا ہے پس چاہیے کہ وہ سمندر کا سفر کرے۔

اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

''کیا وہ شریک بناتے ہیں اسے جس نے پیدا نہیں کی کوئی چیز اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ نہیں طاقت رکھتے ان کو مدد پہنچانے کی اور نہ اپنی آپ مدد کر سکتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا یعنی کیا وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جو کسی شے کو تخلیق کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ یعنی بت (خود) پیدا کیے گئے ہیں۔ اور فرمایا یُخْلَقُوْنَ یہ واو اور نون کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بت نقصان اور نفع پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا انہیں الناس (لوگوں) کے قائم مقام قرار دیا گیا (اس لیے جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 821

ہیں) اور یہ ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ (النمل:18) (اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں) وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ یعنی بلاشبہ بت نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ غالب آسکتے ہیں۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝۱۹۳

''اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں گے تمہاری، یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ اخفش نے کہا ہے: اگر تم بتوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہ کریں گے۔ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: کیونکہ یہ راس الآیۃ ہے، مراد یہ ہے کہ فرمایا: اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا: أم صمتم اور صامتون اور صمتم سیبویہ کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ہیں جن کے بارے پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لَا یَتَّبِعُوْكُمْ کو مشدد اور مخفف دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ اور بعض اہل لغت نے کہا ہے: أتبعه جب مخفف ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے نہ پاسکے۔ اور اتّبعه جب مشدد ہو تو معنی ہوتا ہے جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اسے پالے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۱۹۴ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝۱۹۵ اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ٘ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۹۶

''(اے کفار) بے شک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، بندے ہیں تمہاری طرح تو پکارو انہیں پس چاہیے کہ قبول کریں تمہاری پکار کو اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں چلتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کے ہاتھ ہیں پکڑتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کی آنکھیں ہیں دیکھتے ہیں جن سے یا کیا ان کے کان ہیں وہ سنتے ہیں جن کے ساتھ، آپ کہیے: پکارو اپنے شریکوں کو پھر سازش کرو میرے خلاف اور مت مہلت دو مجھے۔ یقیناً میرا حامی اللہ ہے جس نے اتاری یہ کتاب اور وہ حمایت کیا کرتا ہے نیک بندوں کی''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اللہ تعالیٰ نے) بتوں کی پوجا کے بارے میں ان سے جھگڑا کیا ہے۔ تَدْعُوْنَ یہ تعبدون کے معنی میں ہے یعنی جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم انہیں (بتوں کو) الٰہ پکارتے ہو۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی من غیر اللہ، اللہ کے سوا کو۔ اور بتوں کو عباد کہا گیا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور

مسخر ہیں۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ بت تمہاری طرح مخلوق ہیں۔ جب مشرکین نے یہ اعتقاد بنالیا کہ بت نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کے قائم مقام قرار دیا اور فرمایا: فَادْعُوْهُمْ اور یہاں فادعوهن نہیں کہا (یعنی ان کے لیے مونث ضمیر ذکر کرنے کی بجائے جمع مذکر ضمیر ذکر کی جو ذوی العقول کے لیے ذکر کی جاتی ہے)

اوران کے لیے فرمایا: عِبَادٌ (وہ بندے ہیں تمہاری طرح) اور مزید کہا: اِنَّ الَّذِيْنَ اس کی جگہ ان التہ ذکر نہیں کیا۔ اور فَادْعُوْهُمْ کا معنی یہ ہے پس تم ان سے نفع اور نقصان کا مطالبہ کرو۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہاری پکار کو) اور یہ کہ بتوں کی پرستش نفع پہنچائے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: فَادْعُوْهُمْ کا معنی ہے فاعبدوهم (پس تم ان کی پرستش کرو) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زجر و توبیخ کی اور ان کی عقلوں کی سفاہت اور حماقت کو بیان فرمایا اور فرمایا: اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا، الآیہ یعنی تم ان سے افضل ہو تو پھر تم ان کی پرستش کیونکر کرتے ہو۔ مقصود ان کی جہالت کا بیان ہے۔ کیونکہ معبود جوارح سے متصف ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ پڑھا ہے یعنی ان کو التقائے ساکنین کی وجہ سے تخفیف اور کسرہ کے ساتھ اور عِبَادٌ کو نصب اور تنوین کے ساتھ اور امثالکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے ما الذین تدعون ... الخ۔ وہ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے نہیں ہیں، یعنی وہ تو پتھر اور لکڑی ہے پس تم جن کی پوجا کرتے ہو تم خود ان سے اشرف اور اعلیٰ ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس قراءت کے لیے مناسب نہیں کہ اسے اس طرح پڑھا جائے اس کی تین وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ سواد اور جمہور کی قراءت کے خلاف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیبویہ ان کی خبر پر رفع مختار سمجھتے ہیں جب وہ ما کے معنی میں ہو، پس وہ کہتے ہیں: إن زيد منطلق کیونکہ ما کا عمل ضعیف ہے اور ان اس کے معنی میں ہونے کے سبب اس سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ کسائی نے گمان کیا ہے عرب کلام میں ان بمعنی ما آتا ہی نہیں مگر یہ کہ اس کے بعد ایجاب ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝ (الملک)

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اس میں اصل تو یہ ہے کہ لام مکسور ہو، پھر ثقیل ہونے کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا گیا۔ پھر کہا گیا ہے: کہ کلام میں حذف ہے، اس کا معنی ہے: فادعوهم إلى أن يتبعوكم فليستجيبوا لكم إن كنتم صادقين أنهم ألهة پس تم انہیں پکارو یہاں تک کہ وہ تمہاری اتباع کریں اور چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کو قبول کریں اگر تم سچے ہے کہ وہ معبود ہیں۔ ابو جعفر اور شیبہ نے أم لهم أيد يبطشون بها طا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ الفاظ الید، الرجل اور الأذن سب مونث ہیں ہا کے ساتھ ان کی تصغیر لائی جاتی ہے۔ اور الید میں تصغیر کے وقت یاء کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اسے اپنے اصل کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: يُدَيّة یعنی دو یا جمع ہونے کی وجہ سے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ اس میں شرکاء سے مراد بت ہیں۔ ثُمَّ كِيْدُوْنِ پھر تم اور وہ میرے خلاف سازش کرو۔ فَلَا تُنْظِرُوْنِ اور تم مجھے مہلت نہ دو۔ اصل میں کیدونی تھا اس سے یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کر

رہا ہے۔ اور اسی طرح فَلَا تُنْظِرُوْنِ کا معنی ہے۔ اور کید کا معنی مکر کرنا ہے۔ اور کید کا معنی جنگ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: غزا فلم یلق کیدا اس میں کید جنگ کے معنی میں ہے۔ اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یعنی وہ جو میری مدد اور حفاظت کا والی ہے وہ اللہ ہے۔ اور ولی الشی کا معنی ہے: وہ جو اس شے کی حفاظت کرتا ہے اور اور اس سے ضرر اور نقصان کو روکتا ہے۔ اور الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ اور وہی نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ألا إن آل أبي یعنی فلانا ...... لیسوا لي بأولیاء إنما ولي الله و صالح المومنین (خبردار غور سے سنو! بے شک آل فلان میرے اولیاء (محافظ) نہیں ہیں بلکہ میرا محافظ اور مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں)

اخفش نے کہا ہے: اسے إن ولي الله الذي نزّل الكتاب بھی پڑھا گیا ہے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ عاصم جحدری کی قراءت ہے۔ اور پہلی قراءت زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ (اور وہ نیک بندوں کی حمایت کیا کرتا ہے)

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا وہ طاقت نہیں رکھتے تمہاری امداد کے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو وہ نہ سنیں گے اور تو دیکھے گا انہیں کہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اسے مکرر ذکر فرمایا تاکہ وہ یہ بیان کرے کہ جن کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى یہ شرط ہے اور جواب شرط لَا یَسْمَعُوْا ہے۔ وَتَرٰىهُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ یہ حال کے محل میں واقع ہے مراد بت ہیں۔ اور نظر کا معنی ہے اس کی طرف دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھنا جس کی طرف دیکھا جا رہا ہے، یعنی تو انہیں دیکھے گا جیسے وہ تیری طرف آنکھیں کھولے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں خبر واؤ (مراد جمع مذکر کا صیغہ ہے) کے ساتھ دی حالانکہ وہ جماد ہیں جو نہیں دیکھ سکتے، اس لیے کہ یہ خبر اس کے فعل کے قائم مقام ہے جو عقل رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی آنکھیں جواہر سے بنی ہوئی تھیں پس اس لیے فرمایا: وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد مشرکین ہیں، ان کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ وہ نہیں دیکھ رہے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں سے نفع حاصل نہیں کر رہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

''قبول کیجئے معذرت (خطا کاروں سے) اور حکم دیجئے نیک کاموں کا اور رخ (انور) پھیر لیجئے نادانوں کی طرف سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ آیت تین کلمات پر مشتمل ہے، جو مامورات اور منہیات میں قواعد شریعت کو متضمن ہیں۔ پس قول باری تعالیٰ: **خُذِ الْعَفْوَ** میں قطع تعلقی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، گنہگاروں سے معذرت قبول کر کے انہیں معاف کرنا، مومنین کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور علاوہ ازیں اطاعت شعاروں کے اخلاق داخل ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: **وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ** میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، حلال وحرام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، آنکھوں کو نیچا رکھنا اور دار آخرت کے لیے تیاری کرنا داخل ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: **وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ** میں علم کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر ابھارنا، ظلم کرنے والوں سے اعراض کرنا، احمقانہ جھگڑوں سے پرہیز کرنا، کندذہن جہلاء کی مساوات سے بچنا اور دیگر اخلاق حمیدہ اور افعال رشیدہ داخل ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خصال شرح وبسط کی محتاج ہیں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر بن سلیم کے لیے ان تمام کو جمع کیا۔ حضرت جابر بن سلیم ابو جری (1) نے بیان کیا ہے: میں اپنی سواری پر سوار ہوا پھر مکہ مکرمہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا، میں نے اپنی سواری مسجد کے دروازے پر بٹھائی۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میری رہنمائی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے آپ اپنے اوپر سرخ دھاری دار اونی چادر لیے ہوئے تھے، میں نے عرض کی: السلام علیک یا رسول اللہ، تو آپ نے فرمایا: ''وعلیک السلام''۔ پھر میں نے عرض کی: بے شک ہم (دیہاتی) جنگل میں رہنے والے لوگ ہیں، ایسی قوم ہیں کہ ہم میں جفا اور زیادتی وافر ہے، سو آپ مجھے ایسے کلمات سکھا دیں جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے۔ آپ نے فرمایا: ''قریب آ''، آپ نے یہ تین بار فرمایا، چنانچہ میں قریب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری طرف توجہ کر'' میں آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور کسی نیکی کو بھی حقیر نہ جان (اگرچہ) وہ تیرا اپنے بھائی کو متبسم چہرے کے ساتھ ملنا ہی ہو اور یہ کہ تو پانی طلب کرنے والے کے برتن میں اپنا ڈول مکمل طور پر انڈیل دے اگر کوئی آدمی تجھے ایسے سبب سے گالیاں دیتا ہے جسے وہ تجھ میں نہیں جانتا تو تو اسے اس وجہ سے گالیاں نہ دے جسے تو اس میں جانتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے تیرے لیے اجر بنا دے گا اور اس پر اسے بوجھ بنا دے گا اور تو ان (چیزوں) میں سے کسی شے کو بھی برا بھلا نہ کہہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہیں''۔ ابو جری نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں نے اس کے بعد کسی بکری اور کسی اونٹ کو بھی گالیاں نہیں دیں۔ اس کو اس معنی کے ساتھ ابوبکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ (2)

ابو سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تم لوگوں کو اپنے مالوں کے ساتھ وسعت نہیں دے سکتے البتہ تمہاری طرف سے چہرے کی کشادگی اور حسن اخلاق انہیں وسعت عطا کر سکتا ہے''۔ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823 2۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے میں نازل فرمائی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما (1) کی حدیث سے قول باری تعالیٰ: **خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ** کے بارے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت محض لوگوں کے اخلاق کے بارے نازل فرمائی ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ (2) سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بے شک حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''اے جبریل یہ کیا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں عالم (جاننے والے) سے پوچھ لوں۔ ایک روایت میں ہے: ''میں نہیں جانتا یہاں تک کہ میں اپنے رب سے پوچھ لوں''۔ چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی ہی دیر گزری کہ وہ واپس لوٹ آئے اور بتایا: بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرما رہا ہے کہ آپ اسے معاف فرما دیں جو کوئی آپ سے ظلم و زیادتی کرے اور اسے عطا فرمائیں جو آپ کو محروم رکھے اور اس سے صلہ رحمی کریں جو آپ سے قطع تعلقی کرے''۔

کسی شاعر نے اسے نظم کیا ہے اور اس نے کہا ہے:

مکارم الأخلاق في ثلاثةٍ من كَمُلَتْ فيه فذالك الفتیٰ
اعطاءُ مَنْ تحرِمه ووَصلُ مَن تَقْطَعُه والعفوُ عَمّن اعتدیٰ

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارم اخلاق کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے، قرآن کریم میں اس آیت سے زیادہ مکارم اخلاق کی جامع کوئی آیت نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں''۔ شاعر نے کہا ہے:

كلُّ الأمور تزول عنك و تنقضي إلّا الثناء فإنه لك باقي
ولو أنّني خُيِّرتُ كلّ فضيلة ما اخترت غير مكارم الأخلاق

اور سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی۔ آپ سے کہا گیا: کون سی شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا: نو چیزوں کے بارے، سراً اور جہراً اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، حالت رضا اور غضب میں کلمہ حق کہنا، حالت فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلقی کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور اس سے درگزر کروں جو مجھ پر زیادتی کرے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میرا دیکھنا عبرت ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم ارشاد فرمایا ہے سراً اور علانیۃً، اخلاص اختیار کرنا، حالت رضا اور غضب میں عدل کرنا، غنی اور فقر کی حالت میں میانہ روی اپنانا اور یہ کہ میں اس سے درگزر کروں جو مجھ پر ظلم و زیادتی کرے اور اس سے صلہ رحمی کروں جو مجھ سے قطع تعلقی کرے اور اسے عطا کروں جو مجھے محروم رکھے اور یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو، میری خاموشی فکر ہو اور میری نظر عبرت ہو''۔

1۔ صحیح بخاری، سورۂ اعراف، جلد 2، صفحہ 669 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 823

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قولِ باری تعالیٰ: خُذِ الْعَفْوَ سے مراد زکوٰۃ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کثیر مال میں سے تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اور یہ معنی مراد لینے میں انتہائی بعد ہے، کیونکہ یہ عفا سے ہے جب وہ مٹ جائے (یعنی نام ونشان ختم ہو جائے) تحقیق کہا جاتا ہے: خذ العفو منه، یعنی تو اس پر تنقیص نہ کر اور اس سے درگزر کر لے۔ اور سبب نزول اس کی تردید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین پر حجت قائم کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا ہے تو اس نے مکارم اخلاق پر آپ کی رہنمائی فرمائی ہے، کیونکہ یہی مشرکین کو ایمان کی طرف کھینچ لانے کا سبب ہے، یعنی لوگوں کے اخلاق میں سے جو مٹ چکے ہیں آپ ان کے ساتھ ان سے پیش آئیں اور انہیں آسان بنا دیں۔ تو کہتا ہے: أخذت حقی عفوا صفوا، أی سهلا یعنی میں نے اپنا حق آسانی سے لے لیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ یہ عرف بمعنی معروف ہے یعنی آپ نیکی کا حکم دیجئے۔ عیسیٰ بن عمر نے العرف دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے، جیسے حلم ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ العرف، المعروف اور العارفة سے مراد ہر وہ اچھی خصلت ہے جسے عقول پسند کرتی ہیں اور اس کے ساتھ دل اطمینان پاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

من یفعل الخیر لا یَعْدَم جَوَازِیَه لا یذهب العُرْف بین الله والناس

اور حضرت عطا نے کہا ہے: وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ یعنی جب آپ ان پر حجت قائم کر دیں اور انہیں نیکی کا حکم دیں پھر وہ آپ پر جہالت اور نادانی کا اظہار کریں تو آپ ان سے اعراض فرما لیں، ان کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے اور ان کے جواب سے اپنے درجہ اور مقام کو بلند رکھتے ہوئے۔ یہ اگرچہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مقصود اپنی تمام مخلوق کو ادب سکھانا ہے۔

ابن زید اور عطا رحمہما اللہ نے کہا ہے: یہ آیت آیۃ السیف سے منسوخ ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: یہ محکم ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر آیا اور وہ اپنے بھتیجے حر بن قیس ابن حصن کے پاس آ کر اترا اور یہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریب رکھتے تھے اور قراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجالس اور آپ کی مشاورت کے اصحاب تھے، وہ بوڑھے تھے یا جوان، تو عیینہ نے اپنے بھتیجے کو کہا: اے بھتیجے! کیا تیرا اس امیر کے پاس کوئی تعلق اور ذریعہ ہے کہ تو میرے لیے اس کے پاس داخل ہونے کی اجازت لے لے۔ اس نے جواب دیا: میں عنقریب تمہارے لیے ان سے اجازت لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے عیینہ کے لیے اجازت طلب کی۔ پس جب وہ داخل ہوا تو کہا: اے ابن خطاب! قسم بخدا! تو ہمیں زیادہ نہیں عطا کرتا اور نہ تو ہمارے درمیان عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ راوی نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے یہاں تک کہ آپ نے اسے سزا دینے کا قصد کر لیا۔ تو حر نے کہا: اے امیر المومنین! بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ بلاشبہ یہ جاہلوں میں سے ہے۔ تو قسم بخدا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اس سے تجاوز کر

لیا (اور اعراض برت لیا) جونہی انہوں نے آپ پر یہ آیت تلاوت کی اور آپ الله عزوجل کی کتاب سے خوب واقف تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے مطابق عمل کرنا اور حضرت حر کا اس سے استدلال کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ اور اسی طرح اسے حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے بھی استعمال کیا ہے، اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور جب جفا اور زیادتی سلطان کے خلاف عمداً اور اس کے حق کو حقیر جانتے ہوئے ہو تو اس کے لیے اس پر تعزیر ہے۔ اور جب اس کے سوا ہو تو پھر اعراض، درگزر اور عفو ہے، جیسا کہ خلیفہ عادل نے کیا۔

وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝۲۰۰

''اور اگر پہنچے آپ کو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ تو فوراً پناہ مانگیے الله سے، بے شک وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب ارشاد باری تعالیٰ: خُذِ الۡعَفۡوَ نازل ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا: اے میرے رب! کیسے غصہ سے بچ سکتا ہوں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ اور نزغ الشیطان سے مراد اس کے وساوس ہیں۔ اس میں دو لغتیں ہیں: نزغ اور نغز۔ کہا جاتا ہے: ایاك و النزاغ و النغاز وساوس سے بچ، درآنحالیکہ وہ (فساد پر) بھڑکانے اور ابھارنے والے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: النزغ سے مراد تھوڑی سی حرکت ہوتی ہے اور شیطان کی طرف سے ادنیٰ سا وسوسہ ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر تھا اور ان کے درمیان شیطان کی جانب سے وسوسہ پیدا ہو گیا تو ان میں سے کسی ایک نے اپنے ساتھی کے لیے کوئی شے باقی نہ رکھی، پھر وہ دونوں آپس میں جدا نہیں ہوئے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی کے لیے استغفار کیا اور مغفرت طلب کی۔ اور یَنۡزَغَنَّكَ کا معنی ہے: غصے کے وقت تجھے ایسا وسوسہ پہنچے اور عارض آئے کہ اس کے سبب وہ غصہ نہ اترے۔

فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ تو اس بارے تو الله تعالیٰ سے پناہ طلب کر۔ پس الله تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس سے التجا کرنے اور اس کی پناہ طلب کرنے کے سبب وہ وسوسہ کو دور کرے اور الله تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے۔ پس کتوں سے پناہ طلب نہیں کی جائے گی مگر کتوں کے رب کی پناہ طلب کی جائے گی۔ اسلاف میں سے کسی سے یہ حکایت منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد کو کہا: تو شیطان کے بارے کیا کرے گا جب وہ تیرے لیے گناہوں کو مزین اور آراستہ کرے؟ تو اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پھر پوچھا: پھر اگر وہ لوٹ آئے؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے پوچھا: اگر وہ پھر آ گیا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس نے کہا: یہ تو طویل ہو جائے گا، تیرا کیا خیال ہے اگر تو تیرا گزر کسی ریوڑ کے پاس سے ہو اور اس کا کتا تجھے بھونکنے لگے اور تجھے آگے بڑھنے سے روک دے تو تو کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا: میں اس کی تکلیف کو برداشت کروں گا اور اپنی ہمت کے ساتھ اسے واپس لوٹا دوں گا۔ اس نے کہا: یہ تو معاملہ تجھ پر طویل ہو جائے گا، البتہ تو ریوڑ کے مالک سے مدد طلب کر تو وہ اسے تجھ سے روک لے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ النغز والنزغ والھمز والوسوسۃ یہ تمام الفاظ معنی میں برابر ہیں۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ (المومنون) (اور کہیے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے) اور مزید فرمایا: مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (الناس) (بار بار وسوسہ ڈالنے والے، بار بار پسپا ہونے والے کے شر سے) نزغ کا اصل معنی فساد برپا کرنا ہے، کہا جاتا ہے: نزغ بیننا یعنی اس نے ہمارے درمیان فساد برپا کردیا۔ اور اس معنی میں الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ (یوسف:100) یعنی میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان شیطان نے فساد برپا کردیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہا النزغ کا معنی الاغواء (گمراہ کرنا) اور الاغراء (بھڑکانا، ابھارنا) ہے اور یہ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے(1) اور اسے کہتا ہے فلاں فلاں شے کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ اسے یہ کہہ دیتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جب وہ اس تک پہنچ جائے تو اسے (آدمی کو) چاہیے کہ وہ الله تعالیٰ کی پناہ طلب کرے اور اس (میں فکر کرنے) سے رک جائے (باز آجائے)''۔ اور اس بارے میں حضرت عبدالله رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ محض ایمان ہے''۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''وہ صریح ایمان ہے''۔

اور صریح سے مراد خالص ہے (یعنی وہ خالص ایمان ہے) اور یہ اپنے ظاہر (معنی) پر نہیں، کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ وسوسہ بذات خود ایمان ہو، کیونکہ ایمان تو یقین ہے، بلاشبہ یہ اشارہ اس خوف الٰہی کی طرف ہے جو انہوں نے اپنے دلوں میں پایا کہ انہیں اس پر سزا دی جائے گی جو ان کے دلوں میں واقع ہوا ہے۔ تو گویا آپ نے یہ فرمایا: تمہارا اس (وسوسہ) سے ڈرنا محض ایمان اور خالص ایمان ہے، کیونکہ تمہارا ایمان صحیح ہے اور تمہیں وسوسہ کے فساد کے بارے علم ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کو ایمان کا نام دیا، کیونکہ اس کا دفاع، اس سے اعراض کرنا، اس کو رد کرنا، اسے قبول نہ کرنا اور اس سے ڈرنا ایمان کے سبب ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اور رہا یہ کہ الله تعالیٰ نے پناہ طلب کرنے کا حکم فرمایا ہے تو یہ اس لیے کہ وہ وساوس شیطان کے آثار اور علامات میں سے ہوتے ہیں۔ اور رہی اس معاملہ کی انتہا تو وہ ان کی طرف مائل ہونا اور ان کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جو صحیح الایمان ہو اور اس نے اس کے مطابق عمل کیا جس کے بارے اسے اس کے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسے نفع دیا اور اس نے اس سے نفع حاصل کیا۔ اور رہا وہ جسے شبہ لاحق ہوگیا اور اس پر احساس غالب آگیا اور وہ اس سے علیحدگی پر قادر نہ ہوسکا تو پھر اس کی تشفی کے لیے دلیل عقلی کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو فرمایا جسے اجرب اونٹ کے بارے شبہ لاحق ہوگیا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عدوی (متعدی مرض نہیں ہے) اور اعرابی نے کہا: اونٹوں کو کیا ہوا جو صحرا میں ہوتے ہیں تو ہرن کی مثل ہوتے ہیں پس جب ان میں اجرب اونٹ داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79

ہوا تو اس نے انہیں اجرب کر دیا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن أعدی ألاول تو پہلے کو بیماری کس نے لگائی؟ تو آپ کے اس ارشاد نے شبہ کو جڑ سے نکال دیا۔ پس جب شیطان حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں انہیں اکسانے اور گمراہ کرنے سے مایوس ہو گیا، تو وہ وقتاً فوقتاً ان وساوس کے ذریعے ان میں تشویش پیدا کرنے لگ گیا۔ وساوس سے مراد باطل احساسات ہیں۔ پس ان کے دل ان سے نفرت کرنے لگے اور ان کے نزدیک ان کا وقوع ان پر بڑھ گیا پس وہ حاضر خدمت ہوئے، جیسا کہ صحیح میں ہے۔ اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ہم اپنے نفسوں میں وہ پاتے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی اسے اس سے بڑا سمجھ رہا ہے کہ وہ اس کے بارے کلام کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پاتے ہو''؟ عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك صريح الأيمان رغماً للشيطان حسب ما نطق به القرآن في قوله: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (حجر: 42) (وہ صریح (خالص) ایمان ہے شیطان کے لیے ذلت اور خاک ہے جیسا کہ اس کے بارے قرآن نے فرمایا: بے شک میرے بندے ان پر تجھے کوئی غلبہ نہیں ہوگا) پس دل میں اٹھنے والے ایسے خیالات جو پختہ نہ ہوں اور نہ وہ کسی شبہ کے سبب پیدا ہوئے ہوں تو یہ وہ ہیں جن سے اعراض کر لینے کے سبب انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔ اور انہی کی مثل پر اسم وسوسہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ معنی سورۃ البقرہ کے آخر میں گزر چکا ہے، والحمدللہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

''بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کیے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں شیطان کھینچ لے جاتے ہیں انہیں گمراہی میں پھر (انہیں گمراہ کرنے میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (1) مراد شرک اور گناہ ہیں (یعنی وہ لوگ جو شرک اور گناہوں کے ارتکاب سے مجتنب رہے ہیں) اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ یہ اہل بصرہ اور اہل مکہ کی قراءت ہے۔ اور اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی قراءت طائف ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر سے طیف یاء کی تشدید کے ساتھ مروی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی مثل میں کلام عرب طیف تخفیف کے ساتھ ہے، اس بنا پر کہ یہ طاف یطیف کا مصدر ہے۔ کسائی نے کہا ہے: یہ طیف سے مخفف ہے جیسا کہ میتا اور میت ہے۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں طیف کا معنی وہ وہم اور خیال ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے یا نیند کی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح طائف کا معنی بھی ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اصمعی سے طیف کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: مصادر میں فیعل کا وزن نہیں ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مصدر نہیں ہے، لیکن طائف کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے: بے شک وہ لوگ جو گناہوں سے بچتے رہے جب انہیں کوئی شے لاحق ہو تو وہ اللہ عزوجل کی قدرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 492

اور اپنے اوپر اس کے انعامات میں غور وفکر کرتے ہیں اور معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الطیف اور الطائف دونوں مختلف المعنیٰ ہیں۔ پس پہلے کا معنی تخیل (خیال کا آنا) ہے اور دوسرے کا معنی نفس شیطان ہے۔ پس پہلا طاف الخیال یطوف طیفا کا مصدر ہے۔ اور انہوں نے اس سے اسم فاعل کا صیغہ طائف نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: کیونکہ یہ ایک تخیل ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

رہا قول باری تعالیٰ: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (القلم:19) تو اس میں طیف نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ حقیقۃً اسم فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: طفتُ علیھم اطوف اور طاف الخیال یَطِیفُ (یعنی پہلا باب نَصَرَ یَنْصُرُ بمعنی چکر لگانا اور دوسرا باب ضَرَبَ یَضْرِبُ بمعنی خیال آنا ہے)۔ اور حسان نے کہا ہے:

فَدَعْ هذا ولكن مَن لِطَيْفِ يُؤرِّقُني إذا ذهب العِشَاء

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الطیف بمعنی غضب (غصہ) ہے اور جنون، غضب اور وسوسہ کو طیف کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ دل میں پیدا ہونے والا خطرہ اور کھٹکا ہے جسے خیال کے خطرہ کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ یعنی وہ اس سے رک جاتے ہیں، باز رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس انہیں بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے تذکروا ذال کو مشدد پڑھا ہے۔ لغت عربیہ میں اس کی کوئی وجہ (دلیل) نہیں۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عصام بن مصطلق نے بیان کیا ہے: میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو دیکھا، تو ان کی شہرت اور ان کے چہرے کے حسن وجمال نے مجھے بہت متعجب کیا۔ نتیجۃً مجھ میں اس حسد کی آگ بھڑکنے لگی جسے ان کے باپ کے ساتھ بغض کے سبب میرا سینہ چھپائے ہوئے تھا۔ سو میں نے کہا: آپ ابن ابی طالب ہیں انہوں نے فرمایا: ہاں۔ چنانچہ میں نے انہیں اور ان کے باپ کو مبالغہ کی حد تک برا بھلا کہا۔ تو انہوں نے میری طرف انتہائی شفقت ومہربانی کی نظر سے دیکھا، پھر فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ اور آپ نے اسے فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ تک پڑھا۔ پھر مجھے ارشاد فرمایا: نرمی اور ملائمت کا اظہار کر، اللہ تعالیٰ سے میرے لیے اور اپنے لیے استغفار کر، بلاشبہ اگر تو ہم سے مدد طلب کرے گا تو ہم تیری معاونت کریں گے اور اگر تو ہم سے عطیہ طلب کرے گا تو ہم تجھے عطیات سے نوازیں گے اور اگر تو ہم سے رہنمائی مانگے گا تو ہم تیری رہنمائی فرمائیں گے۔ پس جو مجھ سے زیادتی اور کوتاہی ہوئی اس پر مجھ میں ندامت اور شرمندگی ظاہر ہوگئی تو آپ نے فرمایا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ (یوسف) (آپ نے فرمایا: نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرمادے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے) کیا تو اہل شام میں سے ہے؟ میں نے کہا: ہاں تو آپ نے فرمایا:

شِنْشِنَةٌ أعرِفُها من أَخْزَم

(اس عادت اور خراج کو تو میں اخزم سے جانتا ہوں)

اللہ تجھے سلامت رکھے اور تجھے سہارا عطا فرمائے، تجھے معاف فرمائے اور تیری مدد فرمائے۔ تو اپنی حاجات اور پیش آنے والی عوارض ہمیں پیش کر تو تو ہمیں اپنے گمان سے کہیں بڑھ کر پائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ عصام نے کہا: پس زمین اپنی وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی اور میں نے یہ چاہا کہ یہ (زمین) میرے لیے نرم ہو جائے، پھر میں ان سے چھپتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا، اس حال میں کہ سطح زمین پر ان سے اور ان کے باپ سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی محبوب نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے شیاطین کے بھائی اور وہ گمراہ انسانوں میں سے فاجر لوگ ہیں شیاطین انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں۔ اور فاجروں کو اخوان الشیاطین کہا گیا ہے، کیونکہ وہ ان کے وساوس کو قبول کرتے ہیں۔ تحقیق اس آیت میں شیطان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ جو کچھ اس کی وضاحت میں کہا گیا ہے یہ اس میں سے احسن ہے۔ اور یہی حضرت قتادہ، حضرت حسن اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور لَا یُقْصِرُوْنَ کا معنی ہے یعنی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ رجوع کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ تمہارے لیے مدد و نصرت کی استطاعت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں اور ان کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچ لاتے ہیں، کیونکہ کفار شیاطین کے بھائی ہیں۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: بے شک مومن جب اسے شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اور خیال چھوتا ہے تو وہ قرب کے بارے آگاہ ہو جاتا ہے (اور وہ خدا کو یاد کرنے لگ جاتا ہے) اور رہے مشرک تو شیطان انہیں کھینچ لاتا ہے۔

اور لَا یُقْصِرُوْنَ کہا گیا ہے: دونوں قولوں کی بنا پر اس کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا شیطان کی طرف لوٹنا بھی جائز ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر وہ نہ ان سے باز آتے ہیں اور نہ ان پر رحم کرتے ہیں۔ الاقصار کا معنی ہے: کسی شے سے رک جانا، باز آ جانا، یعنی شیاطین کفار کو گمراہی کی طرف کھینچنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ (اور اس سے باز نہیں آتے)

اور قول باری تعالیٰ: فِی الْغَیِّ میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ یَمُدُّوْنَهُمْ کے ساتھ متصل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اخوان کے ساتھ متصل ہو۔ اور الغی کا معنی جہالت ہے۔ نافع نے یُمِدُّونَھُم (1) یا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں (یعنی) مد اور امد، مدکا بغیر الف کے استعمال زیادہ ہے۔ یہ مکی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: اہل عرب کی ایک جماعت اہل مدینہ کی قراءت کا انکار کرتی ہے۔ ان میں سے ابو حاتم اور ابو عبید بھی ہیں، ابو حاتم نے کہا ہے: میں اس کی کوئی وجہ نہیں جانتا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو وہ ان کے لیے گمراہی اور جہالت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور اہل لغت میں سے ایک جماعت نے بیان کیا ہے ان میں سے ابو عبید بھی ہیں کہ جب کوئی شے کسی شے کی ذات میں کثرت اور زیادتی پیدا کر دے تو مدہ کہا جائے گا، اور جب کوئی اس میں کسی غیر کے سبب زیادتی کر دے تو أمدہ کہا جائے گا، مثلاً یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ (آل عمران) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 236

رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں)
اور محمد بن زید سے بیان ہے کہ انہوں نے اہل مدینہ کی قراءت کے لیے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: کہا جاتا ہے: مددتُ له فی کذا یعنی میں نے اسے اس کے لیے مزین اور آراستہ کیا اور میں نے اسے ایسا کرنے کی استدعا کی۔ اور أمددتهُ فی کذا یعنی میں نے اپنی رائے یا کسی اور طریقے سے اس کی مدد کی۔ مکی نے کہا ہے: پسندیدہ فتحہ ہے۔

کیونکہ کہا جاتا ہے: مددتُ فی الشر اور أمددت فی الخیر۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝ (البقرہ) (ڈھیل دیتا ہے انہیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں) پس یہ اس حرف میں فتحہ کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا استعمال شر میں ہوا ہے اور گمراہی (غی) بھی شر ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جمہور اسی موقف پر ہیں۔ اور عاصم جحدری نے یمادونهم فی الغی پڑھا ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے یَقْصرون یا کو فتحہ، صاد کو ضمہ اور قاف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یُقْصِرون اس کی ضد کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امراء القیس نے کہا ہے:

سَمَالكَ شَوْقٌ بعد ما كان أقْصَرا

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝۲۰۳

"اور (اے محبوب!) جب آپ نہیں لائے ان کے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں: کیوں نہ بنا لیا تم نے خود اسے فرمایئے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے رب سے، یہ روشن دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہیں اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ یعنی جب آپ ان پر کوئی آیت نہیں پڑھتے۔ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا اس میں لَوْ لَا بمعنی هلا (کیوں نہیں) ہے، اور اس معنی پر اس کے متصل بعد صرف فعل آسکتا ہے چاہے وہ ظاہر ہو یا مضمر ہو، اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور اجْتَبَيْتَهَا کا معنی ہے تو نے اسے گھڑ لیا اپنی طرف سے۔ پس آپ انہیں آگاہ کر دیجئے کہ آیات اللہ عزوجل کی جانب سے آتی ہیں اور یہ کہ آپ ان پر نہیں پڑھتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرماتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجتبیتُ الکلام أی ارتجلتُه واختلقته واخترعته جب تو اپنی طرف سے کوئی کلام لائے (تو تب مذکورہ جملہ کہتا ہے) قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ فرمایئے: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے نہ کہ اپنی طرف سے۔ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ مراد قرآن کریم ہے، بَصَآئِرُ، بصیرۃ کی جمع ہے، اور اس کا معنی رہنمائی اور نصیحت ہے، یعنی یہ وہ بصائر (دلائل) ہیں جن کے ساتھ میں نے تمہاری اس پر رہنمائی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے، یعنی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: بصائر سے مراد طرق (راستے) ہیں اور البصائر سے مراد دین کے طرق ہیں۔

جعفی نے کہا ہے:

راحوا بصائرُهم على أكتافهم و بَصيرتي يَغْدُوبها عَتِدٌ وأی

هُدًی سے مراد رشد و بیان ہے۔ اور رَحْمَةٌ سے مراد نعمت ہے۔

وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

''اور جب پڑھا جائے قرآن (مجید) تو کان لگا کر سنو اسے اور چپ ہو جاؤ تا کہ تم پر رحمت کی جائے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کہا گیا ہے: بے شک یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر، زہری، عبید اللہ بن عمیر، عطا بن ابی رباح اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تھے تو مشرکین آپ کے پاس آتے تھے اور مکہ میں وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ (فصلت: 26) (مت سنا کرو اس قران کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: وَ إِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا الآیہ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خطبہ کے بارے نازل ہوئی ہے(1)۔ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، عطا، عمرو بن دینار، زید بن اسلم، قاسم بن مخیمرہ، مسلم بن یسار، شہر بن حوشب اور عبد اللہ بن مبارک رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اس میں قرآن تھوڑا ہے۔ اور پورے خطبہ میں خاموش رہنا واجب ہوتا ہے۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ نقاش نے کہا ہے: یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں نہ خطبہ تھا اور نہ ہی جمعہ۔ علامہ طبری نے حضرت سعید بن جبیر (2) سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ عید الاضحیٰ، عید الفطر اور جمعہ کے دن کی نمازوں اور ان نمازوں میں خاموش رہنے کے بارے ہے جن میں امام بالجہر قراءت کرتا ہے پس یہ عام ہے۔ اور یہ قول صحیح ہے، کیونکہ یہ ان تمام کو جامع ہے جن میں اس آیت اور علاوہ ازیں سنت کے مطابق خاموش رہنا واجب ہے۔ نقاش نے کہا ہے: اہل تفسیر نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس میں استماع سے مراد نماز میں قرآن کریم کا سننا ہے چاہے وہ نماز فرض ہو یا غیر فرض۔ نحاس نے کہا ہے: لغوی طور پر تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاموشی ہر شے (یعنی ہر حال) میں واجب ہوتی ہے، مگر یہ کہ کوئی دلیل کسی شے کے اختصاص پر دلالت کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم اس کے مطابق عمل کرو جو اس میں ہے اور تم اس سے تجاوز نہ کرو۔ اور الانصات سے مراد (قرآن کریم) سننے کے لیے، غور و فکر کے لیے اور پھر (اس کے معنی کی) رعایت کے لیے خاموش رہنا ہے۔ اس کا باب أَنْصَتَ يُنْصِتُ إِنْصَاتًا ہے اور نَصَتَ بھی (اسی معنی میں ہے) شاعر نے کہا ہے:

قال الإمامُ عليكم أمرَ سيّدكم فلم نُخالف و أنصتنا كما قالا

اور کہا جاتا ہے: أنصتوه وأنصتوا له (تم اسے خاموش کرا دو، اور تم اس کے لیے خاموش ہو جاؤ)

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 238 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 494

شاعر نے کہا ہے:

إذا قالت حذامِ فأنصتوها فإنّ القولَ ما قالت حذامِ

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کے بارے میں بعض نے کہا ہے: یہ حکم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا تا کہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے اسے یاد کر سکیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں بہت بعد ہے، صحیح قول وہی ہے جس میں عموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور تخصیص دلیل کی محتاج ہوتی ہے۔

عبدالجبار بن احمد نے فوائد القرآن میں اس کے بارے کہا ہے: بے شک مشرکین عناد اور سرکشی کی وجہ سے بہت زیادہ شور و شغب کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بطور حکایت بیان کیا ہے: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (فصلت) تو اللہ تعالیٰ نے اداء وحی کی حالت میں مسلمانوں کو اس حالت کے خلاف رہنے کا حکم دیا اور یہ کہ وہ غور سے سنیں اور اسی بنا پر جنوں کی مدح اور تعریف بیان کی پس فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ الآیہ (الاحقاف: 29) (اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں)

اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرآن پڑھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کا جواب دیتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو وہ بھی آپ کے قول کی طرح کہتے۔ یہاں تک کہ آپ سورۃ الفاتحہ اور سورت پوری کر دیتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ بعد ازاں وہ خاموش ہو گئے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ انصات (خاموش رہنا) سے مراد اس جہر (آواز بلند کرنا) کو ترک کرنا ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں آواز بلند کرتے تھے۔ اور حضرت قتادہ نے اس آیت میں کہا ہے: ایک آدمی آتا تھا اس حال میں کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ ان سے پوچھتا: تم نے کتنی نماز پڑھ لی ہے؟ کتنی ابھی باقی ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ نماز میں اپنی حاجات و ضروریات کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ سورۃ الفاتحہ میں قراءت خلف الامام کے بارے اختلاف گزر چکا ہے اور خطبہ کا حکم سورۃ الجمعہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

"اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی چلائے بغیر (یوں یاد کرو) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور نہ ہو جاؤ (یاد الٰہی سے) غافل رہنے والوں سے"۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيفَةً اسی کی مثل یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (الاعراف: 55) ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ دعا کے بارے میں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہاں ذکر سے مراد نماز میں قراءت کرنا ہے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پورے غور و فکر اور تدبر کے ساتھ قرآن کریم پڑھو۔ تَضَرُّعًا مصدر ہے، اور کبھی یہ حال کے محل میں ہوتا ہے۔ اور وَّ خِيفَةً اس پر معطوف ہے۔ خیفۃ کی جمع خوف ہے، کیونکہ یہ خوف کے معنی میں ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور خیفۃ کی اصل خِوْفَۃ ہے، اس میں واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا ہے۔ (کہا جاتا ہے) خَافَ الرجلُ یَخَافُ خوفًا و خیفۃً و مخافۃً فھو خائفٌ اور قوم خُوَّف اپنے اصل کی بنا پر ہے۔ اور خُیَّف لفظ کی بنا پر ہے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے کہ خیفۃ کی جمع میں خیف بھی کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الخیفۃ (کا معنی) الخوف ہے اور جمع خیف ہے اور اس کی اصل واؤ ہے۔ وَّدُوْنَ الْجَهْرِ یعنی آواز بلند کیے بغیر، یعنی اسمع نفسک (تو اپنے آپ کو سنا) جیسا کہ ارشاد گرامی ہے: وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ (الاسراء) یعنی اتنی آواز جو جھر (چیخ و پکار) اور مخافتۃ (انتہائی دھیمی) کے درمیان ہو اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ذکر کے ساتھ آواز کو انتہائی بلند کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ پہلے کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ حضرت قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے: الْاٰصَالِ سے مراد شامیں ہیں اور الغدو غدوۃ کی جمع ہے۔ اور ابومجلز نے بالغدو والایصال پڑھا ہے اور یہ آصلنا کا مصدر ہے، یعنی ہم شام کے وقت داخل ہوئے (دخلنا فی العشی) اور الآصال اصل کی جمع ہے، جیسے طنب کی جمع اطناب ہے اور جمع الجمع ہے اور اس کی واحد اصیل ہے اور اس کی جمع اصل ہے۔ یہ زجاج سے منقول ہے۔

اخفش نے کہا ہے: الآصال، اصیل کی جمع ہے۔ جیسے یمین اور ایمان ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: أصل، أصیل کی جمع ہے، اور کبھی اصل واحد بھی ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ولا بأحسن منها إذ دنا الأُصُلُ

جوہری نے کہا ہے: اصیل عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک کا وقت ہوتا ہے اور اس کی جمع اُصُلٌ و آصال و أصائِل ہے، گویا کہ یہ اصلیۃ کی جمع ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لعمری لأنتَ البیتُ أکرِمُ أھلَه وأقعد فی أفیائه بالأصائل

اور اس کی جمع اصلان بھی بنائی جاتی ہے جیسے بعیر کی جمع بعران ہے۔ پھر انہوں نے جمع کی تصغیر بنائی اور کہا: اصیلان، بعد ازاں انہوں نے نون کو لام سے بدل دیا اور کہا: اصیلال اور اسی کے مطابق نابغہ کا قول ہے:

وقفتُ فیھا أُصَیلَالًا أسائلھا عَیَّتْ جوابا وما بالربع من أحدِ

اور لحیانی نے بیان کیا ہے: لقیته اصیلالا۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ اور ذکر سے غافل رہنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾

''بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے، وہ تکبر نہیں کیا کرتے اس کی عبادت سے اور پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اس کی اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ اس میں الَّذِیۡنَ سے مراد بالاجماع ملائکہ ہیں۔ اور فرمایا عِنۡدَ رَبِّکَ۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق تو ہر مکان کے ساتھ ہے لیکن چونکہ وہ اس کی رحمت کے قریب ہیں اور ہر وہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہے تو وہ اس کے پاس ہی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ اور اس کے سوا کسی نے کہا ہے: کیونکہ وہ ایسی جگہ میں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کوئی اور حکم نافذ ہی نہیں ہوتا (اس لیے فرمایا وہ تیرے رب کے مقرب ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: عند الخلیفۃ جیش کثیر (خلیفہ کے پاس بہت زیادہ لشکر ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کی عظمت و شرف کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور یہ کہ وہ انتہائی محترم اور مکرم مکان میں ہیں۔ پس یہ ان کے لیے عظمت و کرامت کے اعتبار سے قرب کا بیان ہے نہ کہ مسافت کے اعتبار سے۔ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ یعنی وہ اس کی عظمت بیان کرتے ہیں اور ہر نقص اور کمزوری سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ کہا گیا ہے: وہ اس کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی کمتری اور انتہائی عجز کا اظہار کرتے ہیں، بخلاف گناہ کرنے والوں کے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے بارے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ یہ قاری کے لیے محل سجدہ ہے۔ قرآن کریم کے سجود کی تعداد کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس اس بارے میں جو انتہائی قول کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تعداد پندرہ ہے۔ پہلا سجدہ سورہ اعراف کی آخری آیت ہے اور آخری سجدہ سورۂ علق کی آخری آیت ہے۔ یہ ابن حبیب اور ابن وہب کا قول ہے۔ اور ایک روایت میں اسحاق بھی ان میں شامل ہیں۔ بعض علماء نے سورۃ الحجر میں قول باری تعالیٰ: وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۹۸﴾ (الحجر) پر سجدہ کرنے کا اضافہ کیا ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس اس طرح کل سجدے سولہ ہوجاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کریم میں چودہ سجدے ہیں۔ ابن وہب نے دوسری روایت میں یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ ساقط کردیا ہے۔ اور یہی اصحاب الرائے کا قول ہے اور اس کا ساقط ہونا صحیح ہے، کیونکہ اس کے ثبوت کے بارے کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جسے ابن ماجہ اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ بن منین سے اور یہ بنی عبد کلال میں سے تھے اور انہوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قرآن کریم میں پندرہ سجدے پڑھائے۔ ان میں سے تین مفصل میں ہیں اور دو سجدے حج میں ہیں (1)۔ اس میں عبداللہ بن منین قابل حجت نہیں ہیں۔ ابو محمد عبدالحق نے یہی کہا ہے۔ ابوداؤد نے عقبہ بن عامر سے بھی حدیث ذکر کی ہے انہوں نے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیان کیا میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اور جس نے دو سجدے نہ کیے تو اس نے انہیں پڑھا ہی نہیں'' (1)۔ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن لہیعہ ہے اور وہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو ثابت رکھا ہے اور سورۃ ص کا سجدہ ساقط کر دیا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ کل سجدوں کی تعداد گیارہ ہے، اس میں سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ اور مفصلات کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گیارہ سجدے کیے ہیں ان میں مفصل میں سے کوئی سجدہ نہیں ہے (اور وہ یہ ہیں) الاعراف، الرعد، النحل، بنی اسرائیل، مریم، سورۃ الحج کا ایک سجدہ، فرقان، سلیمان، سورۃ النمل، سجدہ، ص، سجدۃ الحوامیم (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سجدوں کی تعداد دس ہے، انہوں نے حج کا دوسرا سجدہ، سورہ ص کا سجدہ اور مفصل کے تینوں سجدے ساقط کر دیئے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ چار ہیں، آلم تنزیل کا سجدہ، حم تنزیل کا سجدہ، سورہ نجم اور سورہ علق کا سجدہ۔ اس اختلاف کا سبب احادیث کے نقل اور عمل میں اختلاف ہے۔ اور ان کا اختلاف خالص اس امر میں ہے جو قرآن کریم میں سجود کے متعلق ہے، کیا اس سے مراد سجود التلاوۃ ہیں یا نماز میں فرض سجدوں کے متعلق؟

مسئلہ نمبر 3۔ سجود تلاوت کے وجوب میں اختلاف ہے، حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہیں۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ نے کہا ہے: سجدہ تلاوت واجب ہے۔ اور استدلال یہ ہے کہ سجود کے بارے مطلق امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے (3) اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان علیحدہ ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس (وہ ہلاک ہوا)''۔ اور ابو کریب کی روایت میں یا ویلی کے الفاظ ہیں (ہائے میری ہلاکت) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول سے جو آپ نے ابلیس لعنہ اللہ کی طرف سے بطور خبر ارشاد فرمایا: ''ابن آدم جو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا (4) تو اس نے سجدہ کیا پس اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کیا پس میرے لیے جہنم ہے''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی محافظت اور اہتمام کرتے تھے۔ اور ہمارے [illegible] الثابت کی حدیث کی تاویل کی ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر آیت سجدہ پڑھی (پھر آپ نیچے اترے) اور سجدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا، پھر دوسرے جمعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت سجدہ پڑھی پس لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! ٹھہر جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر فرض نہیں کیا مگر یہ کہ ہم چاہیں''۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب تفریع ابواب السجود، حدیث نمبر 1194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب عدد سجود القرآن، حدیث نمبر 1045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 61 4۔ ایضاً

اور یہ انصار و مہاجرین صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا، تو کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا پس اس کیساتھ اس بارے میں اجماع ثابت ہو گیا۔ اور رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ "ابن آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا" تو یہ سجدہ کے واجب ہونے کے بارے خبر ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت استحباب پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سجود تلاوت ادا کرنے میں ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی نماز میں ضرورت ہوتی ہے مثلاً حدث اور نجس سے پاک ہونا، نیت کرنا، قبلہ شریف کی طرف منہ کرنا اور وقت کا ہونا، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے ذکر کیا ہے کہ وہ بغیر طہارت کے سجدہ کر لیتے تھے۔ اسے ابن منذر نے شعبی سے ذکر کیا ہے۔ کیا جمہور کے قول کے مطابق سجدہ کرنے والا تکبیر تحریمہ کہنے، ہاتھوں کو اٹھانے، تکبیر کہنے اور سلام پھیرنے کا محتاج ہوتا ہے؟

اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ پس امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ سجدہ کے لیے تکبیر کہے اور تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے (یعنی رفع یدین کرے) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک اثر میں مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے اور اسی طرح جب سجدہ سے اٹھتے تو تکبیر کہتے۔ (1)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کے دوران سجدہ میں جانے کے لیے اور اس سے اٹھنے کے لیے تکبیر کہے گا۔ اور آپ سے نماز کے باہر سجدہ کے لیے تکبیر کہنے میں اختلاف منقول ہے۔ اور تکبیر کے بارے اسی طرح عام فقہاء نے کہا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک سجدہ کے لیے سلام نہیں ہے۔ سلف میں سے ایک جماعت اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ وہ سجدے سے سلام پھیرے گا۔ اور اس مذہب پر یہ بات ثابت ہے کہ سجدے کے اوّل میں تکبیر احرام کے لیے ہے۔ اور ان کے قول کے مطابق جو کہتے ہیں کہ سلام نہیں ہے فقط سجود ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "نماز کی چابی طہارت حاصل کرنا ہے، اس کی تحریم تکبیر کہنا ہے اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے" (2)۔ اور یہ عبادت ہے اس کے لیے تکبیر ہے، پس اس کی تحلیل بھی ہے نماز جنازہ کی طرح بلکہ اس سے بھی اولیٰ، کیونکہ یہ فعل ہے اور نماز جنازہ قول ہے۔ اور اسے ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اب رہا اس کا وقت! تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ مطلق تمام اوقات میں سجدہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ایک خاص سبب سے نماز ہی ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب تک صبح خوب روشن نہ ہو یا عصر کے بعد جب تک سورج زردی مائل نہ ہو (سجدہ کیا جا سکتا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سجدہ کیا جا سکتا ہے اور عصر کے بعد سجدہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مذہب میں یہی تین اقوال ہیں۔ اور سبب اختلاف وہ معارضہ ہے جس کا تقاضا قراءت پر مرتب

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یسمع السجدۃ وھو راکب الخ، حدیث نمبر 1204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب مفتاح الصلوٰۃ الطھور، حدیث نمبر 271-270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہونے والے سجود میں سے کسی سجدہ کی قراءت کا سبب کرتا ہے کیونکہ صبح اور عصر کے بعد نماز پڑھنے سے نہی عام ہے اور اس معنی میں ان کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ ان دونوں وقتوں میں نماز سے منع کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب وہ سجدے کرے تو اپنے سجدہ میں یہ کہے گا: اے اللہ! اس کے ساتھ مجھ سے بوجھ اتار دے۔ اور میرے لیے اس کا اجر لکھ دے اور اسے میرے لیے اپنے پاس ذخیرہ بنا دے (1)۔ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور اگر کوئی آیت سجدہ نماز میں پڑھے، پس اگر وہ نفل نماز ہے تو وہ سجدہ کرلے چاہے وہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت کے ساتھ اور وہ اس میں کسی اور کی آمیزش سے پر امن رہے۔ اور اگر وہ جماعت میں ہے تو وہ اس میں تخلیط سے پر امن نہیں ہے پس بیان یہ کیا گیا ہے کہ سجدہ کرلینا جائز ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ اور اگر وہ فرض نماز میں ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور قول یہ ہے کہ نماز میں سجدہ کرنا ممنوع ہے، چاہے وہ نماز سری ہو یا جہری، جماعت کے ساتھ ہو یا انفرادی ہو۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ سجدہ تلاوت ادا کرنے سے فرض نماز کے سجود کی تعداد میں اضافہ لازم آتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی علت جماعت میں تخلیط کا خوف ہے۔ اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ اور اس بنا پر سجدہ سے نہ کسی منفرد کو روکا جائے گا اور نہ اس جماعت کو جس میں تخلیط اور فساد سے امن ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ بخاری نے ابو رافع سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں عشاء کی نماز پڑھی اور آپ نے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ (الانشقاق) پڑھی اور سجدہ کیا، تو میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے اس کا سجدہ کیا ہے، تو میں اس میں سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ سے جاملوں گا۔ یہ اسے بیان کرنے میں منفرد ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمران بن حصین کو کہا گیا: وہ آدمی جو آیت سجدہ سنتا ہے اور اس کے لیے نہیں بیٹھتا؟ تو آپ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے اگر وہ اس کے لیے بیٹھ جائے! تو وہ اس پر واجب نہیں ہوگا۔ اور حضرت سلمان نے کہا: ہم نے کبھی اس کی جرأت نہیں کی۔ اور عثمان نے کہا ہے: بے شک سجدہ اس پر ہے جس نے آیت سجدہ سنی۔ اور زہری نے کہا ہے: وہ سجدہ نہ کرے گا مگر اس حال میں کہ وہ باوضو ہو، پس جب تو سجدہ کرے اور تو شہر میں ہو تو منہ قبلہ شریف کی طرف کر اور اگر تو سوار ہو تو پھر تجھ پر لازم نہیں جس طرح تیرا چہرہ ہو (ادھر ہی منہ کر کے سجدہ کرلے) اور حضرت سائب قصص بیان کرنے والے کی آیات سجود پر سجدہ نہ کرتے تھے۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابن ماجہ، باب سجود القرآن، حدیث نمبر 1042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز